# سرودِ بندگی

ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی

# سُرودِ بندگی

ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی

DATA ENTERED

عمیر پبلشرز
میاں مارکیٹ
اُردو بازار ○ لاہور

297.6
ا ۴۱ س
۱۴۱۲۹۸

خُوبصورت، دلکش اور
دیدہ زیب کتابوں کا
واحد مرکز

---

تزئین واہتمام

**احسان اللہ شاہ**

عُمیر

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

بار اول : اکتوبر 1997ء
سرورق : آغا نثار
کمپوزنگ : فراز کمپوزنگ سنٹر، لاہور
پرنٹرز : تایا سنز پرنٹرز، لاہور
قیمت : 150 روپے

۲۰۱۴-۰۷-۲۱

# ترتیب

حرفِ آغاز 7
توحید کا تعارف اور اس کی اہمیت 27
حقیقت، توحید اور اثباتِ توحید کے دلائل 34
کائنات کے حسن و جمال سے احسن الخالقین پر استدلال 51
رسالت کا مفہوم 69
انبیا کرام بالخصوص آنحضرتؐ کی چند خصوصیات اور ختمِ نبوت 88
آخرت کا تعارف اور برزخ کی حقیقت 104
قیامت، احوالِ قیامت اور اس کے وقوع کے دلائل 116
نفخِ ثانی کے بعد کی تفصیلات 136
فکرِ آخرت 152
عبادت کا مفہوم اور اس کی حقیقت 169
نماز اور اس کی حقیقت 192
اسلامی سیرت و کردار میں نماز کا کردار 206
نماز میں جحت کی کارفرمائی اور دیگر کیفیات کا تذکرہ اور نماز کے مسائل

زکوٰۃ کا تعارف اور اس کی حقیقت 216
حبِ دنیا سے پیدا ہونے والے مفاسد کا علاج 233
زکوٰۃ کا اصطلاحی مفہوم اور اس کی تفصیلات 248
زکوٰۃ کے سلسلے میں چند قابلِ غور پہلو اور 261
مصارفِ زکوٰۃ کی تفصیل 270
مقاصدِ تخلیق کی بجا آوری میں روزہ کا کردار 282
فرضیت صوم کے دو مقاصد: اللہ کی کبریائی اور اس کے شکر
کا قلب و نظر میں بس جانا 298
روزہ کا ایک مقصد تقویٰ بھی ہے 311
رمضان اور قرآن 330
گزشتہ تقریر کا تتمہ 343
قرآن کی فریاد 355
تکمیلِ انسانیت میں روزہ، قیام اللیل، اعتکاف اور
لیلۃ القدر کا کردار 356
حج فرضیت، اہمیت اور حقیقت 372
حج کا منظر اور اس میں مخفی حقائق 385
زیارتِ مدینہ علیٰ صاحبھا الصلوۃ و السلام 407
انسانی حقوق کا اولین منشور (خطبہ حجۃ الوداع) 417

# حرف آغاز

گذشتہ سال موسم گرما کی تعطیلات میں پنجاب یونیورسٹی کے کچھ ہونہار طلباء اور بعض احباب نے بہ اصرار تقاضا کیا کہ کسی ایک ہاسٹل میں جہاں طلباء باآسانی ایک بڑی تعداد میں جمع ہو سکتے ہوں۔ اسلام کے بنیادی اور اساسی موضوعات پر لیکچرز دیئے جائیں۔ چنانچہ میں نے محض اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس سلسلے کا آغاز کر دیا اور موضوعات کے ضمن میں بجائے منتشر موضوعات پر گفتگو کرنے کے یہ فیصلہ کیا کہ طلباء عزیز کے ذہنی معیار اور فکری ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ترتیب سے ایسے موضوعات پر لیکچرز دیئے جائیں جس سے اسلام کا نظام زندگی اجمالی حد تک ہی سہی نگاہوں کے سامنے آ جائے۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے عقائد پر گفتگو کی اور اس کے بعد عبادات کو موضوع سخن بنایا۔ لیکن بعض مجبوریوں کے باعث یہ سلسلہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ مجبوراً" جو کچھ ہو چکا تھا اس میں معمولی اضافے کے ساتھ کیسٹس کی مدد سے اسے مرتب کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ یہ انہی لیکچرز اور بعض خطبات جمعہ کی تلخیص ہے جو آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

چونکہ یہ کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے بلکہ تقریروں کا مجموعہ ہے جو کیسٹوں کی مدد سے تیار کیا گیا ہے اس لئے اس کا اسلوب تحریری نہیں بلکہ خطابی ہے۔ اگرچہ اپنے تئیں بہت حد تک احتیاط سے کام لیا گیا ہے پھر بھی مجھے اس بات کا اعترف ہے کہ خطابیات میں سبقت لسانی کا ہو جانا، لب و لہجہ میں بے

احتیاطی کا در آنا اور علمی معیار کی سطح کو برقرار نہ رکھ سکنا جیسی کمزوریوں کا وقوع پذیر ہو جانا چنداں بعید نہیں۔ اس لئے اس مجموعے میں ایسی ہی کوئی فردگذاشت آپ کی نظر سے گذرے تو اسے احقر کی کوتاہی پر محمول کیا جائے اور ہو سکے تو احقر کو اس سے مطلع بھی کیا جائے تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح ہو سکے۔

بفضلہ تعالیٰ میں اس بات پر مطمئن ہوں کہ ان لیکچرز اور خطبات کا مقصد تقریر برائے تقریر نہیں بلکہ سب سے پہلے اپنے آپ کو اور پھر اس کے سامعین اور اب قارئین کو اپنی اصلاح کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ اس حوالے سے اگر اس میں کسی حد تک بھی کامیابی نصیب ہو گئی جس کی میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بہت امید رکھتا ہوں تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ وہ اس حقیر خدمت کو اپنے فضل و کرم سے قبول فرما کر اس کو قارئین کے لئے اصلاح کا ذریعہ بنائے اور خود اس کے مؤلف کے لئے زادِ آخرت بنائے اور ان خطبات کی ترتیب اور تسوید میں جن احباب نے حصہ لیا ہے انہیں جزائے خیر سے نوازے۔

**ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی**

چیئرمین، شعبہ مساجد
جامعہ پنجاب، قائداعظم کیمپس لاہور

دین ہو فلسفہ ہو فقر ہو سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بناء پر تعمیر

برادران عزیز----

اللہ تعالیٰ خالق کائنات ہے۔ اس نے اس کائنات کو بے شمار مخلوقات تخلیق فرما کر زیب و زینت بخشی ہے۔ اس کی کوئی مخلوق بھی بے قدر و قیمت نہیں۔ کائنات کی آرائش و زیبائش اور اسے مفید اور کار آمد بنانے میں ہر مخلوق کا اپنا ایک حصہ ہے۔ مگر ان تمام مخلوقات میں انسان ایک خاص حیثیت کا حامل ہے۔ اگر یہ بات کہی جائے تو غلط نہ ہو گا کہ باقی ساری مخلوقات اسی کی خدمت اور اسی کی معاونت کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ مگر خود انسان کے مقاصد زندگی اور اس کے کار آمد ہونے کے حوالے سے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی اصل قدر و قیمت اس کے وجود سے نہیں بلکہ اس کے عمل اور حسن عمل سے ہے۔ اگر ایک انسان اپنا خوبصورت وجود تو رکھتا ہے مگر عمل سے تہی دامن ہے یا عمل سے بہرہ ور تو ہے لیکن اس کا عمل باقی ابنائے نوع کے لئے مفید اور کار آمد نہیں تو ایسا انسان اس دھرتی کے لئے ایک بوجھ ہے۔ جسے نہ دھرتی قبول کرتی ہے اور نہ اس کے ہم جنس اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی اصل قدر و قیمت اور باقی مخلوقات پر اس کے شرف کی حقیقت کا دار و مدار صرف اس کے عمل بلکہ حسن عمل پر ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے سورہ والعصر میں انسان کی زندگی کی

کامیابی کو چار چیزوں سے مشروط کیا ہے۔ ایمان، عمل، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔ ان چاروں چیزوں پر اگر غور کیا جائے تو ایمان عمل کی بنیاد اور تواصی بالحق اور تواصی بالصبر عمل کے لوازم اور ثمرات ہیں۔ اس لحاظ سے انسان کا اصل سرمایہ اس کا عمل ہے۔ مگر یہ بات ایک دیدۂ بینا رکھنے والے سے مخفی نہیں کہ اس دھرتی پر انسان تو بے شمار ہیں مگر ان میں صاحبِ عمل لوگ اور پھر حسن عمل سے بہرہ ور لوگوں کی تعداد تکلیف دہ حد تک کم ہے بلکہ یہ دیکھ کر تو حیرت ہوتی ہے کہ آدمی اپنی خواہشات اور مرغوبات کے لئے تو ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کو بے چین رہتا ہے مگر جہاں تک اس کے ان اعمال کا تعلق ہے جو خود اس کے لئے اور دوسرے انسانوں کے لئے کار آمد اور مفید ہو سکتے ہیں ایسے اعمال کے لئے اس کے اندر نہ صرف عمل کی خواہش مفقود ہے بلکہ اگر اسے توجہ بھی دلائی جائے تو عجیب و غریب بہانے اور عذر سننے کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ بلکہ بعض دفعہ تو ایک دلچسپ صورتحال سامنے آتی ہے کہ آپ اسے اگر خود اس کے بھلے کے کاموں کے لئے ترغیب دیں تو جواب میں آپ کو یہ سننا پڑے گا کہ میں جانتا ہوں کہ مجھے یہ کام کرنا چاہئے مگر کیا کروں خواہش کے باوجود میں اس کام کو کر نہیں پاتا۔ ایک طالب علم طلبِ علم اور محنت سے ہی طالب علم کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے اور پھر اگر وہ کسی تعلیمی ادارے میں زیرِ تعلیم ہے تو اگر وہ طلبِ علم اور محنت سے جی چرائے گا تو ظاہر ہے کہ اپنے مقصد میں ناکام رہے گا۔ مگر ایسے طالب علم کو بھی اگر آپ حصولِ علم میں محنت کے لئے ترغیب دیں گے تو بہت دفعہ آپ کو یہی عذر سننا پڑے گا کہ میں یہ جانتا ہوں کہ مجھے پڑھنا چاہئے پر طبیعت ادھر نہیں آتی کسی مسلمان سے نماز کی پابندی کے لئے آپ کہہ کر دیکھیں تو یہی خوبصورت عذر آپ کی سماعت سے ٹکرائے گا اسی پر باقی کاموں کو قیاس کر لیجئے صورتحال ایسی ہی سامنے آئے گی۔

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مرے شوق کی بلندی مری ہمتوں کی پستی

اب سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ جبکہ انسان کی قدر و قیمت اس

کے عمل ہی سے وابستہ ہے تو پھر انسان کا اس سے جی چرانا اور معمولی بہانوں سے اپنی حقیقی قدر و قیمت سے محروم رہ کر دھرتی کا بوجھ بن جانا جس کا نتیجہ زندگی کی تمام تر کامرانیوں اور کامیابیوں سے محروم ہو جانا ہے آخر اس کا حقیقی سبب کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب ہمیں تلاش کرنا ہے۔

میں اس کے فہم کو سہل بنانے کے لئے ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ فرض کیجئے ایک آدمی سردیوں کی برسات کی رت اور ٹھنڈی رات میں اپنے گھر میں لحاف اوڑھے لیٹا ہوا ہے۔ اتنے میں رم جھم شروع ہو جاتی ہے۔ اس کی بیوی شور مچاتی ہے کہ لحاف چھوڑیئے۔ جلدی سے باہر نکل کر صحن میں پڑی چیزیں اٹھا لایئے ورنہ وہ خراب ہو جائیں گی جواب میں خاوند کہتا ہے میں باہر گیا تو سردی لگ جائے گی میں ان چند چیزوں کی خاطر اپنی صحت داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ اس کی بیوی ہر چند کوشش کرتی ہے مگر وہ اسے آمادہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔

اسی اثناء میں باہر دروازے پر دستک سنائی دیتی ہے پوچھنے پر آنے والا بلند آواز سے کہتا ہے کہ یہاں چند میل کے فاصلے پر فلاں ریسٹ ہاؤس میں تمہارا فلاں آفیسر ٹھہرا ہوا ہے اس نے اسی وقت تمہیں طلب کیا ہے فورا" پہنچو ورنہ ملازمت سے نکال دیئے جاؤ گے۔ یہ شخص فورا" لحاف سے نکل کر گرم کپڑے پہنتا ہے اور اس آنے والے کے ساتھ گیسٹ ہاؤس پہنچ جاتا ہے۔ متعلقہ آفیسر کا حکم سنتا ہے اور گھر واپس پہنچ جاتا ہے نہ سردی اس کا راستہ روکتی ہے اور نہ بارش رکاوٹ بنتی ہے۔

ذرا غور فرمایئے کہ ایک آدمی جو گھر کے صحن تک جانے کی ہمت نہیں پا رہا تھا اس نے اس سردی اور بارش میں چند میل کا سفر کس طرح طے کر لیا۔ یہ ہمت جو پہلے اس میں نہین تھی کہاں سے آ گئی؟ اگر اپ گہری نظر سے دیکھیں گے تو محسوس کر لیں گے کہ دراصل پہلے اس کے اندر قوت ارادی اور عزم صمیم کی کمی تھی۔ جب اس کی قوت ارادی نے اس کے اندر ایک عزم اور ایک زور دار ارادہ پیدا کر دیا تو اس کے اندر عمل کی وہ بے پناہ قوت پیدا ہو گئی

جس نے راستے کے تمام تر موانع اور رکاوٹوں پر غلبہ پالیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک آدمی کا عمل پر آمادہ نہ ہونا اور چاہتے ہوئے بھی کسی کام کو نہ کرنا اس کا سبب قوت ارادی کی کمی اور عزم صمیم کا فقدان ہے۔

جب تک عزم صمیم پیدا نہیں ہوتا آدمی خواہشات کے بہلاووں میں بہلتا رہتا ہے اور عمل کے خار زار میں داخل ہونے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا۔ جب یہ عزم پیدا ہو جاتا ہے تو یہی بظاہر بیکار آدمی عمل کی دنیا میں انقلاب کا پیغام ثابت ہوتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ یقیناً" صحیح ہے مگر یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس آدمی کے اندر قوت ارادی کیوں نہیں تھی۔ جس کے نتیجے میں اس سے عزم کی قوت کا ظہور نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے سوال کا جو جواب تلاش کیا تھا اس نے ہمیں ایک قدم آگے بڑھا دیا۔ حقیقی جواب اب بھی واضح نہیں ہوا۔ لیکن ہم مذکورہ مثال پر مزید غور کریں تو ہمیں اس کا جواب بھی مل جائے گا۔ بات یہ ہے کہ جس طرح ہر عمل ارادے کا رہینِ منت ہے اسی طرح ہر ارادہ کسی قوی محرک کے بغیر شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔ مذکورہ مثال میں اسلیئے ارادہ پیدا نہیں ہو رہا تھا کہ صحن میں پڑی ہوئی چیزوں کا نقصان کوئی ایسا نقصان نہ تھا جو سونے والے کو جنجھوڑ دیتا لیکن جب باہر سے آنے والے نے اسے یہ بتایا کہ اگر تم اپنے متعلقہ آفیسر کا حکم سننے نہ پہنچے تو تمہیں ملازمت سے نکال دیا جائے گا تو اس تہدید آمیز پیغام نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے چشمِ تصور سے دیکھا کہ اگر میں ملازمت سے نکال دیا جاتا ہوں تو نہ گھر کا چولہا جلے گا نہ بچوں کی فیس ادا ہو گی نہ مکان کا کرایہ دیا جا سکے گا نتیجتاً" زندگی اندھیر ہو کر رہ جائے گی اور تباہی و بربادی میرا مقدر ٹھہرے گی۔ یہ تصورات اس کے لئے قوی محرک ثابت ہوئے جس نے اس کے اندر عزم صمیم کو جنم دیا اور وہ ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ مختصر یہ کہ انسان کی بے عملی کا علاج صرف یہ ہے کہ اس کے اندر قوت ارادی پیدا کی جائے جو اسے ارادے سے ہمکنار کرے اور ارادہ پیدا نہیں ہوتا تاوقتیکہ کوئی قوی محرک وجود میں نہ آئے۔ اب وضاحت طلب بات صرف ایک رہ

جاتی ہے کہ وہ قوی محرک کیا ہے؟ وہ قوی محرک انسان کے وہ انمٹ اور پختہ خیالات اور تصورات ہیں کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر جن کی مخالفت کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔

مثال کے طور پر آدمی سانپ کو دیکھتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہر سانپ زہریلا نہیں ہوتا مگر پھر بھی وہ اسے دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوتا ہے یا کوئی احتیاطی تدبیر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ سانپ ایک زہریلا جانور ہے۔

دوسری مثال دیکھئے کہ آدمی آدمی سے عموماً لڑتا رہتا ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ آدمی آدمی کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جائے۔ مگر یہی آدمی آدھی رات کو چور کی شکل میں گھر میں گھس جائے تو عموماً اہل خانہ خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک آدمی ہے اور گھر میں ایک سے زیادہ افراد ہیں' وجہ ظاہر ہے کہ چور کی دہشت دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے اسی پر آپ باقی خیالات اور احساسات اور تصورات کو قیاس کر لیجئے جو کسی نہ کسی وجہ سے دل میں پیوست ہو چکے ہیں یہی وہ پختہ خیالات ہیں جو انسانی زندگی پر حکمرانی کرتے ہیں اور قوی محرک بن کر قوت ارادی کو جنم دیتے ہیں اور وہ قوت ارادی عمل کا سبب بنتی ہے۔ اس لئے اگر ہم چاہتے ہیں کہ انسان کی بے عملی کا علاج کیا جائے تو پھر اس کی بے عملی کی نہیں بلکہ اس کے خیالات اور تصورات کی فکر کرنی ہو گی۔

چنانچہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی پوری تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جس طرح ایک فرد کی بے عملی اس کے اندر کے خیالات کی ناپختگی اور مردنی کا نتیجہ ہے اسی طرح اس کی قومی زندگی کی ناہمواری ابتری بلکہ تباہی و بربادی بھی اسی باعث ہوتی ہے۔ کہ اس قوم میں زندگی کے احساسات بقاء کی کشمکش کا جذبہ خیالات کی جدت اور فراوانی موت کا شکار ہو چکی ہوتی ہے۔ چنانچہ جب بھی کوئی ایک فرد ان میں ایسا اٹھ کھڑا ہوتا ہے جو ان میں زندگی کا از سرِ نو احساس پیدا کر دیتا ہے تو وہ مردہ قوم انگڑائی لے کر اٹھتی ہے اور بقدرِ ہمت دنیا پر اپنا نقش ثبت کر دیتی ہے۔ جرمن قوم نے قریبی تاریخ میں پوری دنیا

کو ہلا ڈالا صرف اس لئے کہ ہٹلر نے ان میں قومی برتری کا شعور پیدا کر دیا تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں چنگیز خان نے اپنی قوم کو اس وقت کی مہذب قوموں کے لئے ہلاکت و بربادی کا طوفان بنا دیا۔ صرف اس لئے کہ وہ ان کی بکھری ہوئی قوتوں کو یکجا کرنے اور زمین پر ان کی عددی قوت کو برتری کی علامت قرار دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

برطانیہ اور فرانس کے جزیروں میں سمٹے ہوئے لوگ جب دنیا کی ہوس میں اندھے ہو کر ایشیاء پر حملہ آور ہوئے تو انہیں دنیا اور دولت دنیا کی ہوس نے ایک زور دار طوفان کی شکل دے دی۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ہم جہاں کہیں بھی انسانی تاریخ میں برائی یا اچھائی کی شکل میں عمل کے سوتوں کو ابلتا ہوا دیکھتے ہیں تو یقیناً" اس کے پیچھے جذبات خیالات اور تصورات کی قوت محرکہ کار فرما ہوتی ہے۔ کہ جب کسی قوم میں زندگی کے تصورات مر جاتے ہیں تو وہ دھرتی کا بوجھ بن جاتی ہے اور جب اس میں زندہ تصورات کی دنیا آباد ہو جاتی ہے' دلوں کی بھٹیاں دھکنے لگتی ہیں۔ دماغوں کے افق روشن ہو جاتے ہیں۔ تو اس کے عمل کی قوت کے سامنے زمین کی وسعتیں سمٹ جاتی ہیں۔ ایجادات اور اکتشافات ان کی زندگی کا معمول بن جاتے ہیں تسخیر کائنات اس کا ہدف ٹھہرتا ہے پھر ان میں سکندر بھی پیدا ہوتے ہیں اور نیوٹن اَور اَین سٹائین بھی۔ ان میں تیمور بھی پیدا ہوتے ہیں اور سیزر بھی بقول جگر مراد آبادی۔

گھٹے اگر تو بس اک مشتِ خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

انسانی زندگی عروج و زوال اور نشیب و فراز کے درمیان کی کہانی ہے۔ جس کا تمام دار و مدار انسان کے اندر کے خیالات پر ہے۔ اگر اس کے اندر غلامی کا تصور پیدا ہو گیا ہے تو وہ جوئے کم آب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور اگر اس کے اندر آزادی کا شعلہ بھڑک اٹھا ہے تو اب اس کی زندگی بحر بیکراں کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ مگر اس سوال کے ساتھ ساتھ ایک اور سوال بھی قابلِ توجہ ہے۔ یہ تو ہم نے جان لیا کہ فرد اور قوم کی زندگی کے باعمل

ہونے کا راز اس کے اندر کے خیالات اور تصورات کی زندگی میں پنہاں ہے مگر ایسا کیوں ہے۔ کبھی ان میں انسانیت دکھائی دیتی ہے اور کبھی حیوانیت۔ کبھی وہ ہٹلر اور سولینی کی طرح سب سے بڑی درندگی اور ہلاکت کا استعادہ بن جاتے ہیں اور کبھی صلاح الدین ایوبی کی طرح تمام تر شوکت و عظمت کے باوجود انسانیت کے لئے اعلیٰ نمونہ۔

اس کو سمجھنے کے لئے ایک مثال پر غور فرمایئے کہ ایک آدمی زخمی حالت میں سڑک پر کراہ رہا ہے اسے دیکھنے والوں میں تین قسم کے لوگ دکھائی دیں گے۔ ایک شخص اسے دیکھتا ہے اور بے نیازی کی نظر ڈال کر اپنی راہ لیتا ہے۔ جیسے کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں۔ دوسرا شخص اپنی سواری سے اترتا ہے۔ بجائے اس کی نبض دیکھنے کے اس کی گھڑی اتارتا ہے دل کی دھڑکن سننے کی بجائے اس کی جیب خالی کرتا ہے اور رفو چکر ہو جاتا ہے۔ اور تیسرا آدمی بے تابی اور بے قراری کی تصویر بنے اس کی نبض ٹٹولتا ہے اس کے بعد دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کرتا ہے اگر اسے اس میں زندگی کی رمق دکھائی دیتی ہے تو فوراً" اس کی زندگی بچانے کے لئے اپنی امکانی مساعی سے دریغ نہیں کرتا۔ غور فرمایئے۔ یہاں عمل کا محرک ایک ہے یعنی زخمی کا سڑک پر تڑپنا۔ لیکن اس کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہونے والے اعمال تین طرح کے ہیں ایک کا عمل انسانیت سے بے نیازی کا۔ دوسرے کا سراسر دشمنی اور تیسرے کا ہمدردی اور خیر خواہی کا ہے۔ آخر اعمال میں اختلاف کیوں ہے۔ اگر آپ گہری نظر سے دیکھیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ اعمال کا اختلاف دراصل اندر کے خیالات اور تصورات کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔ جس کے دل میں انسانیت کی طرف سے بے نیازی اور لاپرواہی پائی جاتی ہے۔ اس کے عمل میں بھی وہی لاپرواہی اور بے نیازی کار فرما ہے۔ اور جس کے قلبی خیالات میں انسانیت کے لئے دشمنی اور سنگ دلی پنہاں ہے اس کا عمل بھی یقیناً" اسی سنگ دلی کی تصویر ہے۔ اور جس آدمی کے دل میں انسان کے لئے خیر خواہی اور ہمدردی کا جذبہ موجزن ہے اس کا عمل بھی اسی جذبے کا پرتو اور عکس ہے۔ اسی مثال پر قیاس کرتے ہوئے آپ اس

حقیقت کو بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ انسانی عمل کا برا یا اچھا ہونا اس کا تمام تر دار و مدار دل کے تصورات احساسات اور خیالات کے اچھے اور برے ہونے پر ہے۔ آپ جس قسم کے خیالات دل میں بسالیں گے اسی قسم کے اعمال ظہور پذیر ہوں گے۔

ہماری قریبی تاریخ میں حصول علم کے لئے باہر جانے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ مگر ان میں دو نام ایسے ہیں۔ یعنی اقبال اور محمد علی جوہر کہ جب وہ ولایت سے پڑھ کر لوٹے۔ تو بجائے ان سے متاثر ہونے کے وہ ان کی فکر اور ان کی تہذیب کے باغی بن کر آئے۔ اقبال خود کہتے ہیں کہ۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

یہ خاک مدینہ و نجف اصل میں تعبیر ہے ان قلبی خیالات و احساسات کی جو ان کی والدہ کی تربیت نے ان کے اندر ودیعت کر دیئے تھے جس کی وجہ سے ان کے اندر ایک ایسی قوت پیدا ہو گئی جو ہر طرح کے خیالات کا مقابلہ کرنے میں ان کی معاون اور مددگار ثابت ہوئی۔ وہ خود کہتے ہیں کہ'

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

یہی چیز ہم امت مسلمہ کے مختلف ادوار میں دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام جن کی اکثریت عرب جیسی جاہل اجڈ اخلاق کے نام سے ناآشنا' ایک دوسرے کے خون کی پیاسی۔ اور اس چند روزہ زندگی کو اپنی منزل سمجھنے والی قوم سے تعلق رکھتی تھی مگر جب ان کے خیالات تبدیل کر دیئے گئے تو وہ قوم جو بت پرستی کی وجہ سے زندگی کا محدود تصور رکھتی تھی۔ اس نے زندگی کے بارے میں ایسے حیرت انگیز تصورات انسانیت اور تاریخ کو دیئے کہ جس کے بارے میں اقبال کہتا ہے۔

طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ راز اس نے پایا انہی کے جگر میں

وہ جو اس زندگی کو اپنی حقیقی منزل اور اس زندگی کے شب و روز کو اپنی تگ و دو کا حاصل اور انسانیت کا آخری افق گردانتی تھی۔ جب اس نے اس افق کے پار ایک دوسری دنیا کو اپنے قلب و نظر میں اتار لیا تو پھر اس زندگی اور اسبابِ زندگی کے لئے پریشان ہونا اور اندیشۂ سود و زبان میں مبتلا رہنا ان کے لئے ایک عیب بن گیا۔ اب وہ زندگی زندہ رہنے کو نہیں بلکہ اس زندگی کو اس عظیم مقصد کے لئے قربان کرنے کو زندگی سمجھنے لگے۔ جس کا تصور انہیں اسلام نے دیا تھا۔ کبھی وہ دوسرے کی زندگی چھین کر کامیابی سے ہمکنار ہوتے تھے۔ لیکن اب اس عظیم مقصد کے راستے میں زندگی ہار کر وہ کامیابی کا تصور کرتے تھے۔

حضرت علی، حضرت زید بن حارثہ، حضرت جعفر طیار، حضرت عبداللہ ابن رواحہ زخم کھا کر گرتے ہیں تو ان کی زبان سے نکلتا ہے۔ فزت و رب الکعبہ رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔

اقبال اس سے متاثر ہو کر کہتا ہے۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

یہ زندگیوں میں حیرت انگیز انقلاب کس بات کا نتیجہ تھا۔ صرف اس بات کا کہ ان کے دل و دماغ میں صالح خیالات پاکیزہ احساسات اور بلند تصورات پیدا کر دیئے گئے تھے۔

یہی احساسات اور تصورات ان کے لئے وہ قوی محرک ثابت ہوئے جس نے ان کی زندگیوں کو بدل ڈالا اور ان کے خیالات کے مطابق ان سے اعمال کا ظہور ہونے لگا۔ پاکیزہ احساسات نے زندگی کو پاکیزہ بنایا بلند خیالات نے زندگی میں اولوالعزمی پیدا کی۔ دنیا کے دارالعمل ہونے کے تصور نے زندگی میں ذمہ داری کا احساس اور گداز پیدا کیا۔ اور آخرت کی طلب نے دنیا اور دولتِ دنیا سے محبت کے بحران کو سرد کیا۔ اقدارِ حیات کے صحیح تصور کے پیدا ہو جانے سے مقاصدِ زندگی میں بلندی اور وسعت پیدا ہوئی۔ جواب دہی کے احساس نے

وقت کی قدر و قیمت اور اخوت و انسانیت کی نزاکت کا احساس پیدا کیا۔ الغرض ان کی زندگی میں اندر کی دنیا کی تبدیلی نے باہر کی ہر چیز اور ہر تصور کو بدل کر رکھ دیا۔ قبیلے کی تنگنائے میں رہنے والے لوگ آفاق گیری کا تصور لے کر اٹھے، امیدوں اور آرزوؤں میں زندگی گذارنے والے لوگ مقاصدِ جلیلہ کی بہار بن کر چھا گئے اور تاریخ پر یہ بات واضح کر دی کہ،

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی

حقیقت یہ ہے کہ خیالات و احساسات کی دنیا اپنی اثر پذیری اور اثر اندازی میں اس قدر اہم اور نازک واقعہ ہوئی ہے کہ انسان تو ایک طرف اگر کسی حیوان کو بھی اس کے حقیقی احساسات اور تصورات سے محروم کر دیا جائے تو وہ اپنی زندگی کے حقیقی جوہر اور مقصد سے محروم ہو جاتا ہے۔

مولانا روم نے ایک عجیب کہانی لکھی ہے کہ کسی بڑھیا کو کہیں شیر کا بچہ ہاتھ آ گیا۔ وہ اسے اپنے گھر لے آئی۔ گھر میں بکریوں کے ریوڑ میں اسے دودھ پر پالنا شروع کر دیا۔ کچھ بڑا ہوا تو بکریوں کے ساتھ جنگل میں جانے لگا جو کچھ بکریاں چرتیں وہ بھی چرتا۔ وہ اپنی حقیقت کو یکسر فراموش کر کے اپنے آپ کو بکری سمجھنے لگا۔ ایک دن اتفاق سے کسی شیر نے اس ریوڑ پر حملہ کر دیا۔ بکریاں ڈر کر بھاگیں۔ چونکہ اس نے بھی سن رکھا تھا کہ شیر ایک خوفناک درندہ ہے یہ بھی بکریوں کے ساتھ بھاگا۔ اچانک حملہ آور شیر کی نظر اس پر پڑی۔ اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ایک شیر خطرے کا سامنا کرنے کی بجائے بھاگ رہا ہے جو اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ اسے بکریوں کا خیال بھول گیا۔ اس نے تیزی سے اسے گھیرا اور اسے روک کر پوچھا کہ تم کیوں بھاگ رہے ہو۔ اس نے کہا تمہیں نہیں معلوم کہ شیر نے حملہ کر دیا ہے؟ اس نے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا میں بکری ہوں۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ وہ اسے پکڑ کر ایک چشمے پر لے گیا۔ پانی میں اس کی شکل دکھا کر اسے سمجھایا کہ دیکھو تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ تم بھی میری طرح شیر ہو۔ البتہ بکریوں میں رہ کر

تمہارے خیالات میں فساد برپا ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے تم اپنی حقیقت سے عاری ہو گئے ہو۔ چنانچہ جب اسے یقین آگیا کہ واقعی وہ بھی شیر ہے تو یہ اپنے آپ کو بکری سمجھنے والا شیر دوسرے شیروں کی طرح درندہ بن گیا۔ اسی کو اقبال فرماتے ہیں۔

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

اس مثال پر غور فرمایئے کہ ایک شیر کو بکری بنا دینے والی چیز کیا ہے؟ صرف یہ کہ اس کے احساسات خیالات اور تصورات بدل دیئے گئے جس سے اس کی حقیقت تبدیل ہو کر رہ گئی۔

انسان کے اندر مثبت یا منفی دونوں طرح کی تبدیلیاں لانے کے لئے یہ ایک تیر بہ ہدف نسخہ ہے۔ جس کی تاثیر میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اسلام اس کو اثباتی انداز میں پیش کرتا ہے اور آج دنیا نے اس کو قوموں کو بگاڑنے اور ان کی قسمتیں کھوٹی کرنے میں موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ تمام استعماری قوتوں کو دیکھ لیجئے انہوں نے اپنے مقبوضات اور کالونیوں میں اسی نسخہ کو آزمایا اور اپنی مغلوب اور مقہور قوموں کو بکریوں کے ریوڑ کی شکل میں تبدیل کر کے رکھ دیا۔ ذرائع ابلاغ کے اثر سے اور بالخصوص تعلیمی اداروں کے واسطے سے ایسی نسل تیار کی گئی جو کہنے کو اپنے آپ کو اپنے اصل نام سے منسوب کرتی تھی لیکن حقیقت میں ان کے خیالات، ان کے تصورات، ان کے افکار یکسر اس قالب میں ڈھل گئے جس میں یہ استعماری قوتیں ڈھالنا چاہتی تھیں۔ وہ اللہ کو قادر مطلق مانتے تھے مگر حقیقی قدرت کی مالک ان کے دل و دماغ میں یہی برسر اقتدار قوتیں تھیں۔ وہ اللہ کے رسول ﷺ کو ایک آئیڈیل شخصیت سمجھتے تھے لیکن صحیح قدر وقیمت رکھنے والی ثقافت اور تہذیب وہی تھی جو ان استعماری قوتوں کے واسطے سے آئی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ایک آنے ولے دن میں اعمال کی جوابدہی کرنا ہو گی۔ لیکن نظامِ تعلیم نے ان کو اس حد تک دنیا کی محبت اور دولت دنیا کی فکر میں غرق کر دیا تھا کہ وہ دنیا ہی کو اپنا معبود اور دولت دنیا ہی کو

اپنا معبود سمجھنے لگے۔ اقبال چیخ چیخ کر اس کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

مباش ایمن ازان علمے کہ خوانی
کہ از وے روح قومے می تواں کشت

کہ جس علم کو تم پڑھ رہے ہو اسے بے فکر ہو کر نہ پڑھنا۔ کیونکہ اس سے قومی روح بھی کچلی جا سکتی ہے، اور پھر جو کچھ بالخصوص برصغیر میں مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کے لائے ہوئے نظام تعلیم نے کیا ہے اس نے زندگی کے ہر شعبے کو اس حد تک تبدیل کر کے رکھ دیا ہے کہ اقبال اس کی ہمہ گیر تاثیر کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہو گیا،

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

اس صورتحال کے پیش نظر اسلام نے انسانی اصلاح کا تمام تر دارو مدار انسانی دل کی اصلاح پر رکھا ہے۔ کیونکہ انسانی دل یا انسانی دماغ ہی انسان کے بنیادی خیالات، تصورات اور احساسات کا مرکز ہے۔ جو انسانی عقائد کی شکل اختیار کرتے اور انسانی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ جن کے زیر اثر انسانی اعمال وجود میں آتے ہیں اور انسانی زندگی اپنی مطلوب شکل اختیار کرتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔

"الا اِنَّ فِی الجَسَدِ مُضغَۃ اذا صَلُحَتْ صَلُحَ الجَسَدُ کلّہ و اذا فَسَدَتْ فَسَدَ الجَسَدُ کلّہ الا وھِیَ القَلبُ

خبردار جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب تک وہ ٹھیک رہتا ہے سارا جسم ٹھیک رہتا ہے جب وہ بگڑتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ یاد رکھو وہ دل ہے۔

اس دل میں اگر بلند خیالات اور پاکیزہ احساسات ہوں تو فاروق بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور حیدرِ کرار بھی۔ اور اگر یہ دل اپنی بیداری سے محروم ہو جاتا ہے

تو پھر انسان انسان ہوتے ہوئے بھی انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ بقول اقبال

دلِ بیدارِ فاروقی دلِ بیدارِ کراری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری

جس چیز کو میں خیالات، تصورات اور احساسات کا نام دے رہا ہوں اسی کو شریعت کی زبان میں عقائد کہا جاتا ہے اور ان کو مان لینے اور تسلیم کر لینے کا نام اس کے نزدیک ایمان ہے۔ اسلام نے نہایت واضح انداز میں نہایت واضح عقائد اور حقائق دیئے ہیں جن پر ایک صالح انسان کی زندگی کی تعمیر ہوتی ہے۔ اور وہ نہ کسی حال میں الجھے ہوئے ہیں اور نہ ہی دوراز کار تفصیلات رکھتے ہیں۔ بلکہ وہ اپنی تعداد میں صرف پانچ ہیں۔ اور اسلام کی تمام تعلیمات اور تصورات کی بنیاد یہی ہیں۔

(1) ”خدا پر ایمان“، (2) ”خدا کے رسولوں پر ایمان“، (3) خدا کے فرشتوں پر ایمان“، (4) خدا کی کتابوں پر ایمان“، (5) جزا و سزا کے دن پر ایمان “، ”فرشتوں اور کتابوں پر ایمان چونکہ ایمان بالرسالت کا ہی حصہ ہے۔ اس لئے عقائد اصلا“ تین ہی ہیں یعنی توحید، رسالت اور آخرت۔

یہی وہ پانچ یا تین حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا ضروری ہے ان کے بغیر خالص عمل کا وجود نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ وہ اس جہان کا تنہا خالق اور مالک ہے اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے تاکہ وہی ہمارے کاموں کا قبلۂ مقصود قرار پا سکے اور اسی کی رضا جوئی اور اسی کی مرضی کی تکمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض و غایت ہو اور ہم جلوت کے سوا خلوت میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں اور ہر نیکی کو اس لئے کریں اور ہر برائی سے اس لئے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اس کی مرضی ہے۔ اس طرح ہمارے اعمال ناپاک اغراض اور ناجائز خواہشوں سے مبرّا ہو کر خالص ہو سکیں اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضاء گناہوں سے پاک ہوں

ہمارے دل بھی ناپاک خیالات اور ہوا و ہوس کی آمیزش سے پاک ہوں، اور اس کے احکام اور اس کے پیغام کی سچائی پر دل میں ایسا یقین ہو کہ ہمارے ناپاک جذبات، ہمارے غلط استدلالات، ہماری گمراہ خواہشیں بھی اس یقین میں شک اور تذبذب پیدا نہ کر سکیں۔

خدا کے رسولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے ان احکام اور ہدایات اور اس کی مرضی کا علم ان ہی کے واسطہ سے انسانوں کو پہنچا ہے اگر ان کی صداقت، سچائی اور راست بازی کو کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغام ربانی اور احکام الٰہی کی صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جائے اور انسانوں کے سامنے نیکی، نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے جو انسانوں کے قوائے عملی کی تحریک کا باعث بن سکے۔ پھر اچھے اور برے صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری رہنمائی کے لئے نہیں ہو گی۔

خدا کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں، مادیت اوز روحانیت کے مابین واسطہ ہیں، مخلوقات کو قانون الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں اور ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لحظہ لکھتے جاتے ہیں تاکہ ہم کو ان کا اچھا یا برا معاوضہ مل سکے۔

خدا کے احکام و ہدایات جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے گئے ان کو دور دراز ملکوں اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لئے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکلوں یعنی کتابوں اور صحیفوں میں یا لفظ و آواز سے مرکب ہو کر ہمارے سینوں میں محفوظ رہیں، اس لئے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہے، اس کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے ورنہ رسولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے کا ذریعہ مسدود ہو جائے اور ہمارے لئے نیکی و بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ جاہل و عالم بادشاہ اور رعایا سب متفق ہو سکیں۔

۱۶۱۲۹۴

اعمال کی باز پرس اور جواب دہی کا خطرہ نہ ہو اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیائے انسانیت سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت و خلوت میں ان کی ذمہ داری محسوس کراتا ہے۔ اس لئے روز جزا اور یوم آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے۔ اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس پر بے حد زور دیا ہے بلکہ مکی وحی کی تلقین کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے۔

یہی پانچ باتیں اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر، اس کے تمام رسولوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے فرشتوں پر اور روز جزا پر ایمان لانا۔ یہ عقائد خمسہ یکجا طور پر سورہ بقرہ میں متعدد دفعہ کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان ہوئے ہیں۔

"الذینَ یُؤمنُونَ بالغَیب.... والذین یؤمنون بما اُنزِلَ الیک وما اُنزِلَ من قبلک۔ وبالآخِرۃ ھُم یُوقنون

جو لوگ غیب (خدا) کی صفات اور ملائکہ پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم پر (اے محمد) اترا اور تم سے پہلے (پیغمبروں پر) اترا اس پر یقین رکھتے ہیں (یعنی انبیاء اور ان کی کتابوں پر) اور آخرت (روزِ جزا) پر یقین رکھتے ہیں۔

یہ تو سورۃ کے آغاز کی آیتیں ہیں۔ سورہ کے بیچ میں پھر ارشاد ہوا۔

"ولکن البر من امن باللّٰہ والیوم الاخر والملائکۃ والکتاب والنبیین۔

اور لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص خدا پر، آخری دن پر، فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لائے۔

سورۃ کے آخر میں ہے۔

"امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون کل امن باللّٰہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ

پیغمبر پر جو کچھ اتارا گیا اس پر وہ خود اور تمام مومن ایمان لائے سب خدا

پر اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔

سورۂ نساء میں ان ہی عقائد کی تعلیم ہے۔

”یایہا الذین اٰمَنُوا اٰمِنُوا باللّٰہِ وَ رَسُولِہ والکتٰبِ الّذی نزّلَ علٰی رَسولہ والکتٰبِ الذی انزَلَ مِن قبلِ و مَن یکفُرْ باللّٰہ و ملٰئکۃ وکُتُبِہ و رُسُلہ وَالیوم الاٰخِرِ فقد ضلَّ ضلاَلاً بعیدا“

اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو ایمان لاؤ خدا پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری اور جو شخص خدا کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے پیغمبروں کا اور روز آخرت کا انکار کرے گا وہ سخت گمراہ ہوا۔

اسلام نے چونکہ ان خیالات کو صرف مان کر دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ اس پر ایمان کی شرط بھی لگاتا ہے۔ جبکہ دل کے بنیادی خیالات اور احساسات میں ایمان کی شرط نہیں ہوتی بلکہ اس بات کی بھی چنداں پرواہ نہیں کی جاتی کہ دل میں جو خیالات اور احساسات اور تصورات جگہ بنا چکے ہیں (وہ اگرچہ انسانی اعمال پر یقیناً“ حکمرانی کریں گے) وہ خیالات اور تصورات اپنی ذات میں صحیح بھی ہیں یا نہیں؟ کیونکہ بعض دفعہ یہ تصورات خود رو پودوں کی طرح بیرونی عوامل کے زیر اثر یا ماحول کے نتیجے میں وجود میں آتے ہیں۔ اور اپنے طبعی اثرات پیدا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ اس کا کوئی صحیح پس منظر بھی ہے یا نہیں۔ اسلام ایسے تصورات کو قبول نہیں کرتا۔ اس لئے وہ ایمان کی شرط لگا کر تین طرح کی قیود عائد کرتا ہے۔

1- یہ خیالات غلط اثرات کا نتیجہ نہ ہوں بلکہ انہیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ انتساب کی سند حاصل ہو۔

محض کسی بات کا چلن بن جانا یا معاشرے کا اسے قبول کر لینا یا دانشوروں کا اسے رواج دے دینا۔ اسلام کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ خیالات کی صحت کے لئے ایک ہی شرط لگاتا ہے کہ اس کے ساتھ وحی الہٰی کی سند ہونی چاہئے یعنی یہ واضح طور پر معلوم

ہونا چاہیئے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس کی تعلیم دی ہے۔ یا اسے پسند فرمایا ہے۔ یہ تصورات اسلام کے دیئے ہوئے مزاج کے مطابق ہیں اور قرنِ اول سے اسلامی معاشرے نے ان کو قبول کیا ہے۔ اور اب یہ مسلمانوں کا عرف کہلاتا ہے یعنی یہ خیالات اور تصورات ایسے ہونے چاہئیں جن کی بنیاد محولہ بالا پانچ حقائق پر ہو۔

2- جب ان خیالات کی صحت پر اطمینان ہو جائے تو اب دوسری شرط یہ ہے کہ ان خیالات کو صرف مان کر نہ دے دیا جائے بلکہ اس پر پوری طرح طبیعت ٹھک جائے یہ دل کا نور' یقین اور ایقان بن جائے۔ وقت کے پیمانے بدلتے رہیں' افکار کے زاویئے تبدیل ہوتے رہیں لیکن اس یقین اور اطمینان میں کبھی کمی نہ آئے۔

3- اس یقین اور ایمان کو دل کی پکار بن جانا چاہیئے۔ یہ دل کا میلان اور رجحان قرار پائے۔ دل خود بخود اس کی طرف لپکتا جائے۔ زندگی کا بڑے سے بڑا نقصان اس کے لئے گوارہ کیا جا سکتا ہو۔ اس راستے میں بڑی سے بڑی قربانی دینا بھی آسان ہو جائے۔ حتی کہ اگر اس سفر میں زندگی کا سفر بھی تمام ہو جائے تو آدمی اسے اپنی منزل سمجھ کر دل کے اطمینان کے ساتھ قبول کر لے بلکہ اللہ کی اسے نعمت جانے۔ یہ وہ چیز ہے جس کو اقبالی ادب میں عشق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لئے اقبال مرحوم اس پر زور دیتے ہیں کہ جن خیالات اور تصورات میں عشق کی کارفرمائی نہیں انہیں چاہے شریعت کی سند ہی حاصل کیوں نہ ہو وہ تصورات کا بت کدہ تو تعمیر کر سکتے ہیں لیکن وہ قلبی ایمان کا کام نہیں دے سکتے۔ اقبال کہتے ہیں۔

قلب و دل و نگاہ کا مُرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات
صدقِ خلیل بھی ہے عشقِ صبر حسینؑ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

انہی تینوں قیود کے ساتھ یہ تصورات اور خیالات عقائد حقہ اور عقائد راسخہ بنتے ہیں جو زندگی میں تبدیلی کی ضمانت دیتے ہیں اور اگر یہ عقائد راسخہ اور پختہ عقائد افراد اور قوم میں موجود ہیں تو ان کے فنون لطیفہ ان کی ثقافت‘ ان کی تاریخ‘ ان کی معاشرت‘ ان کی سیاست حتی کہ ان کی حکومت کو بھی ایک مضبوط بنیاد میسر ہے۔ وہ بڑے اطمینان سے اس پر زندگی کی عمارت قائم کرسکتے ہیں اور اگر خدانخواستہ ہماری قومی زندگی اس سے محروم ہو جاتی ہے تو پھر یہ زندگی راکھ کا ڈھیر بن جاتی ہے جسے ہوا جب چاہے اڑا کر منتشر کرسکتی ہے۔ اسی لئے قران مجید میں ارشاد خداوندی ہے۔

ترجمہ :- کہ جن لوگوں نے انکار کی روش اختیار کی ان کے اعمال راکھ کی طرح ہیں کہ جسے تیز ہوا نے اڑا کے منتشر کردیا ان کے اعمال قوت و عزیمت سے محروم اور دور کی گمراہی کے حامل ہیں۔

(سورۃ ابراہیم 3)

اسی کو اقبال فرماتے ہیں۔

دین ہو فلسفہ ہو فقر ہو سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بناء پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز عمل خوار و زبوں
ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو ان عقائد راسخہ سے بہرہ ور فرمائے اور اس کے نتیجے میں ان اعمال کی توفیق عطا فرمائے جس سے ان کی اپنی زندگی میں ہمت اور توانائی آئے اور باقی قوموں کے لئے یہ روشنی کا پیغام ثابت ہوں۔

PUNJAB UNIVERSITY LIBRARY

# توحید کا تعارف اور اس کی اہمیت

برادرانِ عزیز!

اسلام میں انسانی اصلاح کا دار و مدار انسان کے خیالات اور اس کے اساسی نظریات کی اصلاح پر ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں انہی اساسی نظریات کو اعتقادات اور عقائدِ راسخہ کا نام دیا گیا۔ یعنی اگر عقائد کی اصلاح ہو جائے تو نتیجتاً انسان کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اسلام کے اساسی عقائد تین ہیں جنمیں توحید کی حیثیت اسلام میں ایسے ہے جیسے جسدِ انسانی میں دل۔ کہ اگر دل صحیح ہو تو جسم بھی صحیح ہے۔ اگر دل بیمار ہے تو جسم بھی بیمار ہے۔ اسی طرح عقیدۂ توحید میں اگر کہیں کمزوری، خرابی یا سقم پیدا ہو جائے تو پوری اسلامی زندگی اس سے متاثر ہوتی ہے۔ دین کا سارا نظام توحید سے روشن ہے۔ دین اگر ایک جسم ہے تو توحید اس کی روح اور اس کی آنکھ کی پتلی ہے اس کے بغیر نہ کوئی عقیدہ موثر ہو سکتا ہے نہ کوئی عمل مثمر۔ یہیں سے دین کا پہلا قدم اٹھتا ہے اور یہیں پر آخری قدم پڑتا ہے۔ یہی دین کا دائرہ ہے اور دین اس وقت تک محفوظ ہے جب تک اس دائرہ کے اندر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے سب سے زیادہ زور عقیدۂ توحید پر دیا ہے۔ قرآن کریم کی پہلی سورۂ یعنی سورہ فاتحہ کا آغاز بھی اسی عقیدہ سے ہوتا ہے اور قرآن کریم کا اختتام بھی اسی عقیدہ پر ہے۔

سورۃ النصر میں فتحِ مکہ کی خوشخبری اور سورۃ "لہب" میں باطل کی شکست کی پیش گوئی کے بعد سورۃ اخلاص رکھی گئی ہے جو خالص توحید کی سورت ہے۔

یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ دین کا مرکزی نکتہ توحید ہے اور اب دین اپنے مرکز پر پہنچ گیا ہے۔ اس کے بعد "معوذتین" رکھی گئی ہیں جو شیطان کی آفتوں سے اس خزانہ کی حفاظت کر رہی ہیں۔

اسلام کی تاریخ دعوت میں ایک نہایت اہم واقعہ ہجرت کا واقعہ ہے۔ اس سے کچھ عرصہ پیشتر سورۃ بنی اسرائیل نازل ہوئی جس میں ہجرت کی طرف اشارہ ہے اور پھر آنے والے حالات میں اسلامی ریاست کے تمام قیام اور اس کے بنیادی اصول یعنی (Manyfasto) کو بیان کیا گیا ہے۔ اس منشور کو بیان کرتے ہوئے جہاں دین فطرت کے قوانین کی تعلیم دی گئی ہے' اس کا آغاز

"لا تجعل مع اللہ الٰھا آخر
یعنی اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ کرو۔

اور اس کا اختتام'
ذالک مِمّا اوحٰی اِلیک رَبُّک مِنَ الحِکمَۃ ولا تجعَل مَع اللّٰہِ الٰھا آخَر یہ ان باتوں میں سے ہے جو تمہارے رب نے حکمت میں سے تمہاری طرف وحی کی ہیں اور خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو'
پر کیا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دین کا آغاز بھی توحید ہے اور دین کی انتہا بھی توحید ہے۔ رہے شرائع و احکام تو وہ درحقیقت توحید کامل تک پہنچنے کے وسائل اور ذرائع ہیں۔

توحید کی اسی اہمیت کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جتنے انبیاء کرام تشریف لائے سب کی نبوّت کا نکتۂ آغاز یہی عقیدہ رہا ہے۔ اس راستے میں انہوں نے زندگی کے بڑے سے بڑے دکھ اٹھائے مگر کبھی اس عقیدے کو بیان کرنے میں کسی طرح کی کمزوری یا تساھل کو گوارا نہ کیا۔ خود نبی اکرم نے ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز اسی نکتہ سے فرمایا اور پھر اسے اس توانائی اور اوالوالعزمی کے ساتھ پیش فرمایا کہ بقول حالی'

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ھادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

اور پھر اس راستے میں دنیا کی کون سی تکلیف، دکھ، صدمہ یا افتاد پیش نہیں آئی جسے آپ نے پورے صبر سے برداشت نہ فرمایا ہو۔

مشرکینِ مکہ آپ کی شخصیت، خاندانی وجاہت آپ کے ذاتی اثر و رسوخ اور احترام و ہر دلعزیزی کی وجہ سے ہمیشہ یہ خواہش رکھتے تھے کہ آپ اپنی دعوت توحید میں کچھ نرمی اور لچک پیدا فرمائیں تو وہ بھی اپنی مخالفت میں کچھ نرمی کریں۔ قرانِ کریم میں ہے،

ودوالو تدھن فیدھنون

کفار یہ چاہتے ہیں کہ آپ کچھ نرمی دکھائیں تاکہ وہ بھی چشم پوشی سے کام لیں۔

مگر آپ اس پر کبھی آمادہ نہ ہوئے۔ سورۃ الکافرون میں واضح طور پر ان کے Compromoiz کرنے کی کوششوں کا ذکر ہے۔ پھر اس سلسلہ میں انہوں نے جناب ابو طالب کو بھی واسطہ بنایا۔ ابو طالب بھی کسی حد تک متاثر ہوئے اور آپ کو بلا کر سمجھانا چاہا کہ جان من تم مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو مگر میری بوڑھی ہڈیاں اور میرا تنہا قبیلہ کب تک تمام قبیلوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ تم جس طرح چاہو اپنے رب کو پکارو مگر ان کے معبودوں کی مذمت نہ کرو۔ آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا،

”چچا جان اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند لا کر رکھ دیں میں پھر بھی اس دعوت میں کسی قسم کی کمزوری نہیں دکھاؤں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو غالب فرما دے یا اس راستہ میں میں کام آ جاؤں۔

مشرکین مکہ نے آپ کو مخالفتوں سے ڈرانا چاہا۔ ترغیب کے پھندے ڈالے۔ معزز ترین گھرانے میں شادی، دولت کے ڈھیر، سروری، سرداری، ساری ہی چیزیں پیش کی گئیں جن سے انسانی ضمیر خریدا جا سکتا ہے مگر ان ساری چیزوں کے باوجود آپ نے وہی توحید کی دعوت پیش فرمائی۔ حتیٰ کہ آخری

حربے کے طور پر آپ پر وطن کی زمین تنگ کر دی گئی۔ قتل کے منصوبے بنائے گئے۔ بالآخر آپ کو ہجرت پر مجبور کر دیا گیا مگر آپ نے توحید کی دعوت میں ایک لمحہ کے لئے بھی کسی قسم کی نرمی گوارا نہ فرمائی۔

مختصر یہ کہ تمام انبیاء کرام خصوصاً نبی اکرم کی ساری جدوجہد کا مقصود توحید خالص کا قیام ہے۔ انہوں نے خدا کے بندوں کو دوسروں کی بندگی سے چھڑا کر خالص اللہ کا بندہ بنایا اور اللہ کے بندوں کو اس بات کی تعلیم دی کہ وہ اسی کو خالق مانیں، اسی کو بادشاہ کہیں، اسی کی بندگی کریں، اسی کی اطاعت کریں، اسی پر اعتقاد اور توکل کریں، اسی سے مدد کے طالب ہوں نعمت ملے تو اسی کا شکر ادا کریں۔ مصیبت آئے تو اسی سے استفادہ کریں۔ طمع ہو یا خوف، امید ہو یا بیم ہر حال میں ان کی نظر اسی کی طرف ہو وہ اپنے تئیں بالکلیہ اس کے حوالے کر دیں۔ ان کی محبت اس کی محبت کے تابع اور ان کی پسند اس کی پسند کے ماتحت ہو۔ اس کی ذات میں اس کی صفات میں، اس کے حقوق میں اس کی یکتائی قبول کریں اور کسی پہلو سے ان چیزوں میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں نہ کسی فرشتے کو نہ کسی جن کو نہ کسی نبی کو نہ کسی ولی کو نہ کسی اور کو نہ ہی اپنی ذات کو۔ وہ اس بات پر یقین رکھیں کہ اس کی شہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں ہے۔

اس کے کارخانۂ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں۔ کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں۔ دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ شجر حجر جنگل، پہاڑ، صحرا دریا، سورج چاند، زمین، آسمان، انسان، حیوان، اور حشرات الارض سب اس کے آگے سربسجود اور اس کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں۔ سب کمزور ہیں وہی ایک قوت والا ہے۔ سب جاہل ہیں اس کو ہر چیز کا علم ہے سب فانی ہیں اسی کو بقاء ہے۔ سب محتاج ہیں وہی ایک بے نیاز ہے۔ سب اس کے بندے ہیں وہی ایک شہنشاہ ہے۔

غرض عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے اور اسی کی حکمرانی ہے۔ وہ ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے۔ وہ ہر

قسم کی صفات عالیہ، اوصاف کمالیہ اور محامد جمیلہ سے متصف ہے۔ اس کی مانند کوئی نہیں اس کی شبیہ اور مثال کوئی نہیں۔ وہ شبیہہ اور تمثیل سے بالاتر اور انسانی رشتہ و ناطہ سے پاک ہے۔ سورۃ الانعام آیت نمبر7 میں فرمایا،

> "غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا۔ خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ اس کو جانتا ہے۔ درخت کا کوئی پتہ نہیں گرتا نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہے لیکن وہ اس کے علم میں ہے"۔

> "اور اگر اللہ تمہیں مصیبت پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل و کرم کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے فضل و کرم سے ممتاز کرے اور وہی گناہوں کو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

آیت الکرسی میں ارشادِ خداوندی ہوتا ہے،

"اللہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہیں ہے وہ جیتا ہے اور سب اس کے سہارے جیتے ہیں۔ اس کو نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے اسی کا ہے۔ کون ایسا ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔ جو کچھ لوگوں کے روبرو ہے اور جو ان کے پیچھے ہے وہ سب کو جانتا ہے اور لوگ اس کے علم کا کچھ بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے۔ اس کا تخت آسمانوں اور زمینوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ ان آسمانوں اور زمین کی نگرانی اس کو تھکاتی نہیں۔ وہ سب سے اوپر اور سب سے بڑا ہے۔

سورۃ الحدید میں ارشاد ہے۔

> "جو زمین مین گھستا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا اور جو چڑھتا ہے وہ سب کو جانتا ہے اور تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور تم جو کچھ بھی

کرو اللہ اس کو دیکھتا ہے اور آسمانوں اور زمینوں پر بادشاہی اسی کی ہے اور تمام کاموں کا مرجع وہی ہے۔"

سورۃ القصص آیت نمبر 9 میں فرمایا

"اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے۔ اس کے ہاتھ میں فیصلے کی طاقت ہے۔"

سورۃ شوریٰ آیت نمبر 3 میں فرمایا

"لیس کمثلہ شئی وھو السمیع البصیر۔"

اس کی مانند کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

توحید کی اساسی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان تمام خیالات فاسدہ اور عقائد باطلہ کی بھی اصلاح فرمائی جن کی وجہ سے پہلی قوموں نے توحید کے رخ روشن کو داغدار کر دیا تھا۔ انسان اور اس کے خالق کے درمیان دوری اور بیگانگی کی دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔ انسان کو اس کے حقیقی شرف اور عظمت سے محروم کردیا تھا۔ شرک کی آلودگیوں کے باعث توحید کا سیدھا سادا مسئلہ فلسفیانہ موشگافیوں اور مذہبی رہنماؤں کی غلط تعبیروں سے الجھا دیا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان تمام گمراہیوں اور ضلالتوں کی اصلاح فرمائی۔ عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث مجوسیوں کے عقیدۂ ثنویت اور بعض دوسری مشرک قوموں کے عقائد فاسدہ کا ابطال کیا۔ خیر و شر کی حقیقت کو واضح فرما کر اللہ تعالیٰ کی طرف ان کے انتساب کی حقیقت واضح فرمائی۔

بزرگوں سے عقیدت و محبت میں غلو کی وجہ سے مختلف قوموں میں جو مشرکانہ عقائد پیدا ہوئے ان میں سے ایک ایک کا ازالہ فرمایا۔ اللہ اور بندوں کے درمیان جو مشرکانہ واسطے پیدا کر دیئے گئے تھے ان کی حقیقت بے نقاب فرمائی۔ خرق عادت افعال کی حقیقت بیان فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ اور اس کے مقبول بندوں کے درمیان تعلق کی حقیقت کی عقدہ کشائی کی اللہ ہی کی ذات کو تحریم و تحلیل کا حقدار ثابت کر کے ہر طرح کے

اقتدار، سند اور اتھارٹی کو اللہ تعالیٰ کی صفت قرار دیا اور اس طرح تاریخِ مذاہب میں انسانوں کو غلام بنانے کی جس قدر شکلیں رہی ہیں سب کا راستہ بند کر دیا۔

تمام منفی قوتوں کا ابطال فرما کر اللہ پر انسان کے توکل اور اعتماد کو بحال کیا اور انسان کی اندرونی کمزوریوں کے علاج کے طور پر اس کی قوت تسخیر کو توانا کیا۔ اللہ کی صفاتِ کاملہ کا علم دے کر اوہام و خرافات کا راستہ بند کر دیا پروردگار کو نفع و نقصان کا حقیقی مالک قرار دے کر ہر وہ مخلوق جس سے نفع کی امید کی جا سکتی ہے یا جس کی ہیبت سے ڈرا جاتا ہے ان تمام کو انسان کی مساعیٔ عمل کا میدان قرار دیا۔ امید و بیم اور نفع و نقصان کی ہر حالت میں اللہ ہی سے تعلق پیدا کرنے اور اس کے سامنے دست سوال دراز کرنے کا سلیقہ عطا فرما کر عبد اور معبود کے رشتے کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیا۔

آپ کی خالص دعوت توحید نے اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ لا الہ الا اللہ جو توحید کا عنوان ہے اسکو انسان کی ہر طرح کی دنیوی اور اخروی کامیابیوں کا ضامن قرار دیا۔

ارشاد فرمایا

کَلِمَةٌ وَاحِدَةٌ تُعْطُونِیهَا تَمْلِکُونَ بِهَا الْعَرَبَ وَتَدِینَ لَکُمْ بِهَا الْعَجَمَ

وہ ایک کلمہ ہے اسے اگر مجھ سے قبول کر لو تو اس کے ذریعے تم سارے عرب کو زیرِ نگین کر لو گے اور سارا عجم تمہارے پیچھے چلے گا۔

مزید فرمایا کہ اس کلمے پر تمہاری دنیا اور آخرت کا مدار ہے یعنی دنیا کی کامرانیاں وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی معاشرتی ہوں یا معاشی، سیاسی ہوں یا تہذیبی سب کا دارومدار اسی کلمے کے قبول کرنے اور اس پر مبنی زندگی کو اختیار کرنے میں ہے اسی طرح آخرت میں جنت اور اللہ کی رضا کا حصول بھی اسی پر موقوف ہے۔

جو کرنی ہو جہانگیری محمدؐ کی غلامی کر
عرب کا تاج سر پر رکھ خداوندِ عجم ہو جا

# حقیقتِ توحید اور اثباتِ توحید کے دلائل

برادرانِ عزیز! گذشتہ صحبت میں مَیں نے جو کچھ عرض کیا۔ اگر وہ پیش نظر رہے۔ تو اس تفصیل و توضیح سے پروردگارِ عالم کی شانِ کبریائی اور اس کی عظمت و جلال کے ایک گونہ تصور کے ساتھ ساتھ یہ تو معلوم ہو گیا کہ توحید صرف ایمان، حاصلِ ایمان اور مبدأ ایمان ہی نہیں بلکہ دنیا اور آخرت میں کامیابیوں اور کامرانیوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے نظامِ اجتماعی اور اس کی کامیابیوں کی ضمانت بھی ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر معاشرت، معیشت، حکومت اور ریاست کی بلند و بالا عمارت تعمیر ہوتی ہے اور جس کے نتیجے میں پروردگار نے خلافتِ ارضی دینے، خوف سے نکالنے اور رزقِ واسع دینے کا وعدہ فرمایا۔ ظاہر ہے کہ جو حقیقت اس قدر جامع اور ہمارے ایمان و عمل اور اجتماعی نظام پر محیط ہے اس کے بارے میں معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔

قرآنِ پاک کے نزول کے وقت اس وقت کی دنیا اللہ کے وجود سے غافل تو ضرور تھی مگر منکر نہیں تھی۔ اس زمانے میں کوئی قوم یا کسی قوم کا قابل ذکر حصہ ہمیں ایسا نہیں ملتا جو اللہ کے وجود کا منکر ہو۔ محدود تعداد میں اگر کہیں تاریخ میں منکرین کا وجود ملتا بھی ہے تو وہ ناقابل ذکر ہے۔ وہ لوگ ایک اللہ کے تصور سے واقف تھے البتہ اس کی حقیت سے آشنا نہیں تھے۔ یہ حادثہ صرف اس دور کا ہے کہ آج انسانوں میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو سرے سے کائنات کے خالق و مالک کے تصور سے ہی منکر ہیں۔ اس لئے قرآن کریم نے انکارِ خدا کو بنیادی مبحث کے طور پر قبول نہیں فرمایا کیونکہ اگر

ایسا ہوتا تو قرآن کریم کا خطاب مقتضائے حال کے موافق نہ ہوتا۔ اس لئے ہمیں قرآن کے مخاطبین کی دعوت توحید کے حوالے سے تین قسمیں معلوم ہوتی ہیں۔

1- مشرکین مکہ :- جو اللہ کے تصور سے واقف اور اس کے قائل تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ شرک کو بھی ایک حقیقت کے طور پر قبول کرتے تھے اور صفات خداوندی میں چند در چند اغلاط کا شکار تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ شرک فی الذّات اور شرک فی الصّفات کا ارتکاب کرتے تھے۔

2- یہود و نصاری :- یہ بنیادی طور پر توحید کے قائل تھے۔ مگر اپنے اعمال و اطوار میں بعض ایسی چیزیں بھی رکھتے تھے جو سراسر شرک کی بنیاد اور علامت تھیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی جن صفات کو مانتے تھے عمل کے اعتبار سے اس کے لوازمات کے منکر تھے۔ اس لحاظ سے یہ شرک فی الصفات اور شرک فی الحقوق کے مرتکب تھے۔ اگرچہ ان میں سے بعض گروہ شرک فی الذّات کے بھی مرتکب ہوتے تھے۔

3- منافقین :- جو توحید کے اسلامی تصورات سے واقف بھی تھے اور ان کو مانتے بھی تھے۔ بلکہ ان کی ظاہری زندگی اسلام کی تصویر تھی۔ مگر دل و دماغ میں فاصلہ ہونے کی وجہ سے ان کو توحید پر مکمل یقین نہیں تھا۔ اس کے نتیجے میں جب بھی ان کو موقع ملتا وہ مختلف صورتوں میں توحید کی بنیادوں کو مسمار کر دیتے تھے اور حقیقت توحید ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔

آج بھی یہود و نصاری اپنی حالت پر قائم ہیں اور مسلمانوں میں بفضلہ تعالیٰ اعتقادی نفاق تو بہت کم ہے مگر عملی نفاق کے نتیجے میں ان کی ایک بہت بڑی اکثریت توحید کی روح سے خالی ہے اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ نزول قرآن کے وقت جیسا کہ ذکر کیا گیا توحید کے منکرین بہت کم تھے مگر آج کمیونسٹوں کی شکل میں ان کی ایک بہت بڑی تعداد پائی جاتی ہے اس لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ

توحید کی حقیقت کو واشگاف کرتے ہوئے توحید کے مخالف دوسرے گروہوں کے خیالات کا ابطال کیا جائے وہاں آج کی ضرورت کے پیش نظر اللہ کے وجود پر بھی گفتگو کی جانی چاہئے۔ قرآن کریم نے اگرچہ اس کو بنیادی مبحث کے طور پر قبول نہیں کیا مگر اس نے شرک کی تردید کرتے ہوئے اس جامعیت کے ساتھ دلائل دیئے ہیں کہ وہ اگر ایک طرف وحدت الوہیت کو ثابت کرتے ہیں تو ساتھ ہی اللہ کے وجود کو بھی قطعی انداز میں دل و دماغ میں مرتسم کر دیتے ہیں۔ گویا کہ قرآن کریم کے پیش کردہ دلائل کا اصل موضوع توحید خالص کے حوالہ سے توحید فی الذات توحید فی الصفات اور توحید فی الحقوق کو ثابت کرنا ہے۔ مگر ضمناً وہ وجود باری تعالیٰ کو بھی نہایت قطعیت اور جامعیت کے ساتھ ثابت کرتا چلا جاتا ہے۔

## توحید کی اقسام

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ توحید اور اس کی اقسام کی تعریف اور وضاحت کر دی جائے۔ توحید قرآن و سنت کی نگاہ میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات (جس مفہوم میں وہ خدا کے لئے مستعمل ہیں) اور حقوق میں ہر طرح کی شرکت سے پاک ہے اس لحاظ سے توحید کی تین قسمیں ہوئیں۔ توحید فی الذات، توحید فی الصفات، توحید فی الحقوق۔

توحید فی الذات کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس بات سے پاک ہے کہ اسے کسی سے یا کسی کو اس سے قرار دیا جائے۔ کسی کو اس کی ذات برادری سمجھا جائے۔ کسی کو اس کا باپ یا بیٹا مانا جائے۔ مثلاً عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ مسیح خدا کے جوہر سے ہیں یا خدا نے ان کو جنا ہے یا حضرت مریم خدا کی ماں ہیں۔ یا عربوں کا یہ عقیدہ کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں کیونکہ یہ ساری باتیں خدا کے قدیم اور ازلی و ابدی ہونے اور اس کی صفات کمال کے منافی ہیں۔

## توحید فی الصّفات

توحید فی الصّفات کا مفہوم یہ ہے کہ جو صفات کمال پروردگار کے لئے

مخصوص ہیں مثلاً" خلق تدبیر' قدرت علم اور حکمت وغیرہ۔ ان میں کسی اور کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ لیکن اس میں قید یہ ہے کہ جس مفہوم میں وہ خدا کے لئے مستعمل ہیں۔

## توحید فی الحقوق

توحید فی الحقوق کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کمال سے جو باتیں لازم آتی ہیں یا وہ حقوق جو ہم پر عائد ہوتے ہیں ان میں کسی کو اس کا ہمسر اور شریک نہ مانا جائے۔ مثلاً" وہ خالق ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ تمام عالم میں حکم و انتظام اسی کا ہو۔ اب اگر ہم کائنات کی تدبیر اور اس کے انتظام و انصرام میں کسی اور کو شریک مانیں تو یہ توحید فی الحقوق کے منافی ہو گا۔ الا لہ الخلق والامر اور پھر جب تمام کائنات کی تدبیر امر اسی کے ہاتھ میں ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ بندگی صرف اسی کی کی جائے اطاعت مطلقہ اور محبت تامہ بھی اسی کے ساتھ مخصوص ہو۔

قرآن کریم نے مندرجہ بالا اقسام توحید کو اپنے مخصوص انداز میں پیش فرمایا ہے جسے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ چند حقائق کو پیش نظر رکھا جائے کیونکہ آج کے دور کا انداز یہ ہے کہ وہ عموماً" ایسے دلائل کو پسند کرتا اور اس سے متاثر ہوتا ہے جن کی بنیاد حسّی استدلال اور عقلی براہین پر ہو۔ حالانکہ پروردگار عالم کا وجود اگر فطرت انسانی کا داعیہ ہے تو اس کے لئے سب سے موثر دلائل وہ ہونے چاہئیں جو اس کی فطرت کے قریب ہوں۔ عقل ہمیشہ عقلی تقاضوں کا ہی جواب دیتی ہے مگر فطرت کے داعیات کو بالعموم نظر انداز کر جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آج ایک بات کو عقل تسلیم کرتی ہے تو کل اس کا انکار کر دیتی ہے۔

"عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے"۔

اس لئے قرآن کریم کا اسلوب بیان یہ نہیں ہے کہ نظری مقدمات اور ذہنی مسلّمات کی شکلیں ترتیب دے پھر اس پر بحث و تقریر کر کے مخاطب کو ردو

تسلیم پر مجبور کرے اس کا تمام تر خطاب انسان کے فطری وجدان و ذوق سے ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا پرستی کا جذبہ انسانی فطرت کا خمیر ہے اگر ایک انسان اس سے انکار کرنے لگتا ہے تو یہ اس کی غفلت ہے اور ضروری ہے کہ اسے غفلت سے چونکا دینے کے لئے دلیلیں پیش کی جائیں۔ لیکن یہ دلیل ایسی نہیں ہونی چاہیئے جو محض دل و دماغ میں کاوش پیدا کر دے بلکہ ایسی ہونی چاہیئے جو اس کے نہان خانۂ دل پر دستک دے دے اور اس کا فطری وجدان بیدار کر دے۔ اگر اس کا وجدان بیدار ہو گیا تو پھر اثباتِ مدعا کے لئے بحث و تقریر کی ضرورت نہیں ہو گی۔ خود اس کا وجدان ہی اسے مدعا تک پہنچا دے گا البتہ قرآن کریم تے کہیں کہیں عقلی دلائل کی طرف اشارہ ضرور فرمایا تاکہ عقل کے پرستار اگر عقلی دلیل سے ہی اطمینان چاہیں تو ان کے لئے اطمینان کا سامان میسر رہے۔ مثلاً قرآن کریم میں ارشاد ہوا۔

## توحید پر عقلی دلائل

وللہ غیب السموت والارض والیہ یرجع الامر کلہ فاعبدہ و توکل علیہ"

اور خدا ہی کے پاس ہے زمین و آسمان کی چھپی باتیں اور اسی کی طرف ہر بات لوٹائی جاتی ہے۔ پس اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ کرو۔

سورۂ نجم میں فرمایا

"وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی"

اور یہ کہ تمہارے رب کی طرف ہے سب کی انتہا

اہل فلسفہ اور متکلمین اس کو اپنی اصطلاحات میں یوں بیان کرتے ہیں کہ عالم میں ہر چیز کے لئے علل و اسباب کا سلسلہ ہے۔ یہ سلسلہ یا تو کہیں جا کر ختم ہو گا یا یونہی مسلسل چلا جائے گا اگر یہ یونہی مسلسل چلا جائے تو لازم آتا ہے کہ ہر چیز کے پیدا ہونے پر غیر متناہی علل گذر جائیں اور غیر متناہی علل کا خاتمہ نہیں ہو سکتا اور نہ کہیں ان کا آغاز ہو سکتا ہے۔ اس لئے کوئی چیز پیدا بھی نہیں ہو

سکتی۔ تسلسل عقلاً" بھی محال ہے بلکہ انسان اس کے تخیّل سے بھی عاجز ہے اس بناء پر لا محالہ سلسلہ علل کا کہیں خاتمہ ہونا ضروری ہے جس علتِ کل پر تمام علتیں ختم ہو جاتی ہیں وہی خلق و پیدائش اور وجود و کون کی اصل علتِ العلل ہے۔ یہ دلیل گو بہت پیچیدہ اصطلاحات سے لبریز اور بہت سے محذوف مقدمات پر مبنی ہے تاہم وہ انسانی عقل میں آتی ہے اور بہتوں کے لئے تسکین کا باعث ہے۔ اسی طرح اللہ کے ایک ہونے پر قرآنِ کریم نے جن دلائل کی طرف اشارے فرمائے ہیں ان کو فلاسفہ اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں عالمِ کائنات معلول ہے اس کی کوئی علتِ تامہ ہو گی ظاہر ہے کہ ایک معلول کی دو علتِ تامہ نہیں ہو سکتیں کیونکہ علتِ تامہ اس کو کہتے ہیں جس کے وجود کے بعد معلول کے وجود کے لئے کسی اور چیز کا انتظار نہ ہو۔ اب عالم کی علتِ تامہ اگر ایک نہ ہو بلکہ دو ہوں تو سوال یہ ہے کہ ایک علت تامہ کے وجود کے بعد عالم کے وجود میں دوسری علت نامہ کا انتظار رہے گا یا نہیں اگر رہے گا تو پہلی شے علت نامہ نہیں رہے گی اور اگر انتظار نہیں رہے گا تو دوسری شے علت نامہ نہ ہو گی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عالم کی علت نامہ ایک ہی ہو سکتی ہے، اور اگر آج کی زبان میں اللہ کے وجود پر اس دلیل کو اپنے الفاظ میں بیان کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ متحرک ہے۔ حرکت محرک کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ یہی محرک اشیاء کی رفتار، سمت اور منزل معین کرتا ہے۔ حرکت کی علت یہی ہے اور علت ہمیشہ معلول سے مقدم ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو اپنے وجود کی علت خود ہو۔ ورنہ وہ اپنے آپ سے مقدم ہو جائے گی اور یہ محال ہے۔ کائنات میں حرکت و تخلیق ازل سے قائم ہے اور ابد تک قائم رہے گی۔ اس لئے ہمیں ایک ایسی علت کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا جو دائم و قائم ہے۔ قرآن کہتا ہے،

"اللّٰہ لا الٰہ الاّ ھو الحیّ القیّوم، لا تاخذہ سِنۃٌ ولا نوم، لہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض۔"

اللہ کے سوا کوئی اور ذات عبادت کے قابل نہیں۔ وہ زندہ اور قائم

ہے۔ نہ اسے اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔

اسی طرح قرآن کریم نے اثبات توحید میں عقلی دلائل کی طرف اشارے کئے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ عقل کا اصلا" یہ میدان نہیں لیکن اس میدان میں عقل کی کوتاہی اس کا اپنا نقص نہیں بلکہ یہ قصور عقل کو اس میدان میں استعمال کرنے والے کا ہے اگر کوئی عقلمند آدمی عقل کی حدود سے آشنا ہے اور وہ اس کی بساط کو جانتا ہے تو وہ یقیناً" یہ بات سمجھ لے گا کہ عقل کا دائرہ محسوسات اور معقولات تک محدود ہے۔ جب ہم اسے الٰہیات اور عالم غیب میں استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر اس کے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں کرپاتے تو اس میں قصور عقل کا نہیں بلکہ صاحب عقل کا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی آدمی کسی صراف کے پاس جاکر یہ کہے کہ تمہارے ترازو کا تول اگر صحیح ہے تو مجھے اس میں یہ پہاڑ تول کر دکھاؤ یا یہ دیوار تول کر دکھاؤ اور جب وہ ایسا نہ کرسکے اور یقیناً" ایسا نہیں کرسکے گا تو پھر یہ شور مچانا شروع کر دے کہ تم کیسے یہ دعوی کرتے ہو کہ تمہارا یہ تراوز بالکل صحیح ہے۔ وہ صراف جواب میں یقیناً" یہ کہے گا کہ بھائی تراوز بالکل صحیح ہے لیکن تم اس میں وہ چیز تلوانا چاہتے ہو جو اس کی حدود سے ماورا ہے۔ تو اس میں غلطی تمہاری ہے میرے ترازو کی نہیں۔ یہی غلطی ہم اس وقت کرتے ہیں جب ہم عقل کے دائرے میں پروردگار عالم اور اس کی صفات کی معرفت کو لانے کی کوشش کرتے ہیں اب ظاہر ہے کہ ہماری عقل کا دائرہ ذات خداوندی اور اس کی صفات سے یکسر مختلف اور اس کی وسعت اور بساط اللہ تعالی کی لامحدود ذات کے سامنے انتہائی محدود اور کوتاہ' نتیجہ معلوم کہ عقل ہزار کوشش کے باوجود بھی اللہ تعالی کی حقیقی معرفت سے عاجز رہتی ہے۔

اکبر مرحوم نے ٹھیک کہا

جو ذہن میں گھر گیا لاانتہا کیونکر ہوا
جو سمجھ میں آ گیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہی عقل کا غلط استعمال ہے جس نے ہمیشہ توحید

اللہ میں شرک کے لیے آسانیاں پیدا کی ہیں کیونکہ انسان نے جب پروردگار کو عقل کی ترازو میں تولنے کی کوشش کی اور چونکہ اس عقل کا دائرہ محسوسات میں سمٹا ہوا ہے تو اس نے ہمیشہ یہ سمجھا کہ پروردگار کا بھی کوئی پیکرِ محسوس ہو گا یا ہونا چاہیے جسے دیکھ سکیں، محسوس کر سکیں، سمجھ سکیں۔ یہیں سے شرک کی تمام آلودگیوں کے لیے راستہ کھلا۔ نتیجتہً" نوع انسانی کبھی اصنام پرستی کا شکار ہوئی، کبھی اوہام پرستی کا۔ کبھی اس نے مظاہر فطرت کی پوجا کی اور کبھی طاقت و قدرت کی۔ قرآن کریم نے ان گمراہیوں کی اصلاح فرماتے ہوئے قوموں کے سامنے یہ نقطہ فاش کیا کہ پروردگار کی معرفت تو ایک مشکل بات سہی مگر جن لوگوں کو تم علم و معرفت کے حوالے سے، اخلاقی بلندی کے حوالے سے، انکشاف اور اکتشاف کے حوالے سے، کارہائے نمایاں کے حوالے سے، ایجاد و اختراع کے حوالے سے، عظمت کا مینار سمجھتے ہو غور کرو ان کو دیکھنے کا طریقہ کیا ہے؟ کیا کسی بڑے آدمی کو دیکھنے سے اس کی حقیقی عظمت نظر آ جاتی ہے؟ کیا کسی موجد کو دیکھنے سے اس کی قوت ایجاد دکھائی دے دیتی ہے؟ کیا کسی معمار کو دیکھنے سے اس کا وہ جوہر جو پتھر کو آئینے کی شکل دیتا ہے نظر آ جاتا ہے؟ کیا اگر تمہارے سامنے بقراط یا سقراط یا افلاطون کو لا کر کھڑا کر دیا جائے یا ارسطو مجسم صورت میں تمہارے سامنے آ جائے یا لقمان کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو تو کیا وہ جوہر جس کی وجہ سے دنیا میں ان کا نام ہے تمہاری آنکھوں کے راستے سے تمہارے دل کا حصہ بن جائے گا؟ ظاہر ہے یہ سارے انسانوں جیسے انسان ہی تھے۔ ان کو اگر دیکھو گے تو صرف یک انسان کے سراپا کو دیکھو گے۔ ان کی حقیقی شخصیت ااور حقیقی معرفت کو کبھی نہ پا سکو گے۔ ان کو جاننے کا صحیح راستہ ان کو دیکھنا نہیں بلکہ ان کی صفات کو جاننا ہے۔ معمار اپنی تعمیر میں شاعر اپنے شعر میں، ناظم اپنے نظم میں، ادیب اپنے ادب میں، خطیب اپنے خطاب میں، فلسفی اپنے فلسفے میں اور مفکر اپنی فکر میں نظر آتا ہے۔ یہ معرفت کا وہ صحیح طریقہ ہے جو حقیقی معرفت کا سراغ دیتا ہے۔ بالکل اسی طریقے سے تم اپنے خالق و مالک کو جان سکتے ہو، وہ خالق ہے تو اس کو صفت خلق میں دیکھو، وہ مالک ہے تو اس کی

ملک میں اسے جانو، وہ رازق ہے تو اس کو رزق رسانی میں تلاش کرو، وہ رحیم ہے تو رحم و کرم کے آئینے میں اسے ڈھونڈو، اس طرح ہوا کا ایک جھونکا، پانی کی ایک بوند، روشنی کی ایک ایک کرن، درخت کا ایک ایک پتہ، پھول کی ایک ایک پنکھڑی حتی کہ خود انسان کی اپنی ذات اس کی خبر دیتی ہوئی معلوم ہوگی۔ وہ بے ساختہ پکار اٹھے گا کہ:

ہر کہ بینم در جہاں غیرے تو نیست
یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

چنانچہ قرآن کریم نے اسی فطری طریق استدلال کو کام میں لاتے ہوئے تین طرح سے دلائل پیش کئے ہیں۔

(1) دلائل آفاق (2) دلائل انفس (3) دلائل بلحاظ مسلمات مخاطب۔

1) دلائل آفاق سے مراد کائنات کی ایک ایک مخلوق اور موجود چیز سے اس کے خالق اور موجد پر استدلال ہے۔ مزید برآں وہ قوانین جن کا اس کائنات میں ہر آن مشاہدہ ہو رہا ہے اور جن سے ایک خدا کی اور اس کی ان تمام صفتوں کی شہادت مل رہی ہے جو قرآن نے خدا کے لیے بیان کی ہیں۔

2) دلائل انفس کا ماخذ درحقیقت خود انسان کا نفس ہے اور اس سے ہماری مراد وہ فطری وجدان و اذعان ہے جو فاطر السموات والارض نے نفوس کے اندر ودیعت فرمایا ہے۔

3) دلائل بلحاظ مسلمات مخاطب سے مراد وہ استدلال ہے جو مخالف کے اقرارات و اعترافات پر مبنی ہے۔ مثلاً جب ایک آدمی اللہ تعالیٰ کو اپنا الہ مانتا ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ ن تمام صفتوں اور باتوں کو مانے جن پر یہ لفظ مشتمل ہے یا جو آدمی اللہ کی بنیادی صفتوں کو مانتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ ان صفتوں کو بھی مانے جو ان صفتوں کے لوازم میں سے ہیں نیز ان صفات سے ان کی ترجمانی نہ کرے جو ان صفات کے منافی ہیں۔ مزید برآں ان صفتوں کے تسلیم کرنے سے

آدمی پر جو ذمہ داریاں اور حقوق واجب ہوتے ہیں ان کا بھی اقرار کرے۔

قرآن کریم نے اپنے استدلال کے ان تینوں ماخذوں کی خود تصریح کی ہے اور اپنے استدلال کی بنیادیں خود بیان فرمادی ہیں۔ "سنریھم آیاتنا فی الآفاق و فی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق۔ ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق اور ان کے نفسوں میں بھی دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ یہ بالکل حق ہے۔ و فی الاَرض آیاتٌ لِلمُوقنین۔ و فی اَنفُسکُم اَفَلاَتبصُرُون۔ و فی السَّمَاءِ رزقُکم وَمَا توعَدُون۔ فَوَربّ السَّماءِ والاَرضَ اِنّه لحَقّ مِثلَ مَانکم تَنطقُون ○ اور زمین میں بھی نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور خود تمہارے نفسوں میں بھی کیا تم دیکھتے نہیں اور آسمان میں تمہاری روزی بھی ہے اور وہ چیز بھی جس کی تمہیں وعید سنائی جا رہی ہے۔ پس آسمان و زمین کے خداوند کی قسم یہ بات شدنی ہے جس طرح تم بول دیتے ہو۔

چنانچہ ہم بھی اسی ترتیب سے پروردگار کے وجود اس کی یکتائیت اور ہر طرح کے شرک سے پاک ہونے پر استدلال کریں گے۔ یہی طریقہ عہد اول میں صحابہ کرامؓ کا تھا اور یہی طریقہ ہر دور میں سلف صالحین کا رہا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پوچھا گیا کہ آپ نے اپنے خالق کے وجود کو کیسے جانا؟ فرمایا شہتوت کے پتے سے۔ سائل نے حیران ہو کر پوچھا کہ وہ کیسے؟ فرمایا۔ شہتوت کے پتے کو ریشم کا کیڑا کھاتا ہے تو ریشم بنتا ہے ختن کا آہو کھاتا ہے تو اس کے ناف سے کستوری نکلتی ہے اور اگر کوئی اور جانور کھاتا ہے تو گوبر کر دیتا ہے۔ شہتوت کے پتے میں کوئی خصوصیت ہوتی تو ہر جگہ اس کا اظہار ایک ہی صورت میں ہوتا۔ یہ اظہار کی مختلف صورتیں اور مختلف چیزوں کا وجود میں آنا خود بولتا ہے کہ شہتوت کے پتے کے پیچھے کوئی ہاتھ کارفرما ہے اور یہ اسی کی کارفرمائیاں ہیں جسے ہم مختلف صورتوں میں دیکھ رہے ہیں۔ پس وہ ہاتھ میرے خالق کا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

"افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت' والی السماء کیف

رفعت، والی الجبال کیف نصبت، والی الارض کیف سطحت۔

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اونٹ کو کیسے پیدا کیا گیا، آسمان کو کیسے بلند کیا گیا، پہاڑوں کو کیسے میخوں کی طرح گاڑ دیا گیا اور زمین کو کیسے بچھونے کی طرح بچھا دیا گیا۔ یعنی ایک عرب چاہے وہ مالی لحاظ سے کتنا بھی گیا گزرا کیوں نہ ہو وہ جب آنکھ کھولتا ہے تو اس کی نگاہ ان چار چیزوں پر ضرور پڑتی تھی۔ وہ اونٹ پر سواری کرتا تھا۔ آسمان پر بادل بہت کم آتے تھے اس لیے وہ کھلے آسمان کو ہمیشہ دیکھتا تھا۔ پہاڑ ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے گڑے رہتے تھے، زمین پر وہ چلتا پھرتا تھا۔ انہی چار چیزوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا کہ تم میں سے کم سے کم عقل رکھنے والا آدمی بھی ان چار چیزوں کو دیکھتا ہے تو کیا وہ سوچتا نہیں کہ آخر یہ چاروں چیزیں کیسے وجود میں آئیں اور اگر گہری نظر رکھنے والا اور علم و بصیرت کا حامل آدمی ان چاروں چیزوں کو دیکھے تو اس کے سامنے علم و دانش کی وہ حیرت انگیز دنیا واشگاف ہوتی ہے کہ سوائے اس آدمی کے جس کی عقل پر پتھر پڑ جائیں کوئی بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ یقیناً اس زمین، آسمان اور ان پہاڑوں اور اونٹوں کا کوئی خالق ہے جس نے ان میں ہمارے لیے منفعت کی ایک دنیا بسا دی ہے اور حقائق کا ایک جہاں سمو دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی نے مخلوق پر اس لحاظ سے نظر ڈالی ہے تو وہ اپنے خالق کو پہچانے بغیر نہیں رہ سکا۔ عرب کے ایک بدو سے جب پوچھا گیا کہ تم نے اپنے خالق کو کیسے پہچانا؟ تو اس نے انتہائی سادگی سے کہا کہ ریگستان میں پڑی ہوئی اونٹ کی لید سے۔ سائل نے حیران ہو کر کہا وہ کیسے؟ کہا اونٹ کی لید یقیناً کسی گزرنے والے اونٹ کی خبر دیتی ہے اور اونٹ ریگستان میں بغیر سوار کے نہیں گزرتا اور کوئی سوار اس بدامنی کے دور میں تنہا سفر نہیں کرتا یقیناً کسی قافلے کے ہمراہ گزرتا ہے تو اونٹ کی لید دیکھ کر میں یقین کر لیتا ہوں کہ کوئی قافلہ گزرا ہوگا۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے کہا کہ اگر اونٹ کی لید سے میں ایک قافلے کا یقین کرسکتا ہوں تو کیا اس وسیع و عریض کائنات کو دیکھ کر میں اس کے خالق کا یقین نہیں کرسکتا۔ اس لیے پروردگار نے فرمایا:

"ما غرک بربک الکریم الذی خلقک فسوٰک فعدلک فی ای صورۃ ماشاء رکبک"

کس نے تجھے اپنے رب کریم سے غفلت میں ڈالا ہے۔
جس نے تجھے پیدا کیا اور پھر ہر لحاظ سے درست کیا اور پھر جس شکل و صورت میں تجھے چاہا بنا دیا۔

اس آیت پر غور فرمائیے پروردگار انسان کو اس کے وجود کی طرف توجہ دلا کر یہ بتا رہا ہے کہ تم اگر اپنے آپ کو غور سے دیکھو تو یقیناً تمہیں تمہارے ایک ایک ریشے، ایک ایک بال، ایک ایک عضو، ایک ایک احساس، ایک ایک صلاحیت اور استعداد کے پیچھے اپنے خالق و مالک کی قوت تخلیق دکھائی دے گی۔ آخر اتنی واضح شہادت کے بعد وہ کون سی چیز ہے جس نے تجھے اپنے اللہ سے غافل کر دیا؟

انسان کا وجود ہی نہیں بلکہ جب آدمی اس کی صلاحیتوں، اس کے دل و دماغ کی قوتوں اس کے تجسّس اور شعور اور اعضاء کی مختلف حالتوں پر غور کرتا ہے تو حیرت میں ڈوب کر رہ جاتا ہے۔ ایک سائنس دان نے اپنی لیبارٹری میں اپنی نواسی کے کان کو دیکھ کر کہا کہ یہ سماعت کا حیرت انگیز پرزہ ایسا ہے جس کی مثال لانے سے انسان عاجز ہے۔ اور پھر سراپا حیرت بن کر کہا جس خالق نے اس کان کو پیدا کیا، کیا وہ خود سنتا نہیں ہوگا؟ پورے جسم کے ایک ایک ریشے پر غور کیا جائے تو حیرت انگیز چیزیں سامنے آتی ہیں بالخصوص ایک انگوٹھے کو دیکھ لیجئے جو کس قدر چھوٹا ہے لیکن اس کی پور پر کھنچے ہوئے خط جن کی تعداد ہزاروں میں ہوگی ان میں یہ عجیب و غریب بات ہے کہ ایک انگوٹھے کے خط دوسرے انگوٹھے سے کبھی نہیں ملتے۔ اسی وجہ سے انسان کے انگوٹھے کو دستاویزات میں قابل اعتبار سمجھا گیا ہے۔ انسانی چہرہ جو ایک بڑی محدود جگہ ہے، جس میں آنکھیں، ناک ہے، منہ ہے، پیشانی ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی اربوں انسان پیدا ہوئے مگر ایک دوسرے سے ملتی دکھائی نہیں دیتی۔ آپ جب غور کریں گے تو ضرور ایک دوسرے سے فرق محسوس کریں گے۔ اس لیے یورپ کے فلسفی

نے کہا تھا کہ کائنات میں سب سے بڑا معمہ یہ انسان ہے اور اس سے بڑا معمہ اس کا دماغ جو ذہانت، تجسس، شعور، حافظہ اور فکر اور خرد کے اوصاف سے آراستہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان اوصاف کا خالق کون ہے؟ جواب ہے، وہ جسے دل نے تو ہمیشہ پہچانا لیکن خرد ضرور اس سے غافل رہی۔ پھر قرآن نے اسی دلیل کو آگے بڑھاتے ہوئے انسانی ضروریات ہی نہیں بلکہ تمام مخلوق کی ضروریات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ احساس دلایا ہے کہ خالق کائنات صرف خالق ہی نہیں بلکہ تمہاری زندگی کی بقا کا سروسامان کرنے والا بھی ہے۔ تم اس کی عطا کردہ نعمتوں سے فائدہ تو اٹھاتے ہو مگر عطا کرنے والے کو بھول جاتے ہو۔ حالانکہ انسان اپنے کھانے پر ہی غور کرے تو اسے سوچنا چاہیے کہ یہ آخر کہاں سے آیا کہ انسان اپنی غذا کے لیے دانۂ گندم زمین میں کاشت کر کے اسے دفن کر کے آ جاتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ یہ دانہ مر جائے مگر بجائے مرنے کے اس میں زندگی کی سوئی پھوٹتی ہے جو بڑھتے بڑھتے تنا بنتی ہے۔ پھر اسے خوشے لگتے ہیں۔ خوشوں میں دانوں کے موتی بھر دیئے جاتے ہیں۔ سورج کی کرنیں پانی کے ڈول بھر بھر کر فضا میں ابر کی چادریں پھیلا دیتی ہیں۔ ابر پانی برسا کر کھیتی کی آبیاری کا سامان کرتا ہے۔ سورج اسے گرمی پہنچاتا ہے۔ چاند اسے حلاوت دیتا ہے۔ ہوا اسے لوریاں دیتی ہے۔ زمین اپنی قوت نمو بروئے کار لاتی ہے اور پھر قدرت نہ جانے کیسی کیسی قوتوں کو وہاں کام میں لا کر انسان کے لیے غذا فراہم کرتی ہے۔ سائنس دان کہتا ہے کہ نائیٹروجن حیوانی و نباتی حیات کا لازمی جزو ہے۔ یہ دو طریقوں سے زمین میں داخل ہوتی ہے۔ اول خورد بینی اجرام یا بکیٹریا کے ذریعے جو زمین کی بالائی تہہ میں رہتے ہیں۔ اور کھاد وغیرہ کھا کر ایک ایسا رس خارج کرتے ہیں جن میں نائیٹروجن بہت زیادہ ہوتی ہے۔ نصف چھٹانک زمین میں ان کی تعداد ایک کھرب، پینتیس ارب کے قریب ہوتی ہے اور زمین کے ہر ایکڑ میں میں ان کا کام بارہ آدمیوں کے برابر ہوتا ہے۔ اگر 100 ایکڑ کھیت میں 10 کسان ہل چلا رہے ہیں تو 1200 مزدوروں کا ایک مخفی لشکر بھی وہاں کام کر رہا ہوتا ہے۔ غور فرمائیے اس غذا کو مہیا کرنے اور اسے

پروان چڑھانے میں انسان کا حصہ کتنا ہے اور اللہ کا کتنا؟ پروردگار خود فرماتے ہیں:

"افرءیتم ما تَحرُثُون، ءَاَنتم تزرَعُونَہ ام نحنُ الزرَاعُون"
کیا تم نے اپنے کھیتی پر کبھی غور کیا۔ زراعت کون کرتا ہے تم یا ہم؟

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

"فلیَنظُر الانسانُ الیٰ طعَامِہ۔ اِنّا صَبَبنا الماءَ صبًا ثم شَقَقنا الارضَ شقًا، فانبتنا فیھا حبًا۔ وعِنبًا و قضبًا۔ و زیتونًا و نخلًا۔ وحَدائِق غلبًا۔ و فاکھۃً و ابًا۔ متَاعًا لّکم ولأنعامِکم۔"

انسان ذرا اپنی غذا پر نظر ڈالے (کہ کہاں سے آئی) ہم نے مینہ برسا کر زمین کا سینہ چیرا۔ اس سے غلے، انگور، ترکاری، زیتون، کھجوریں، گھنے باغ، میوے اور چارہ پیدا کیا۔ یہ سب کچھ تمہارا اور تمہارے مویشیوں کا متاع حیات ہے۔

اس کو اقبال مرحوم نے اپنے انداز میں نظم کیا:

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ ساز گار
خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی یہ خوئے انقلاب

انسان کی دوسری فوری اور ناگزیر ضرورت پانی ہے۔ آدمی پانی حقیقت پر غور کرے اور پھر اس کے فوائد سمجھنے کی کوشش کرے تو اللہ

قدرت نمایاں نظر آتی ہے جس کے آئینے میں انسان اپنے پروردگار کو دیکھ سکتا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس قدر فراخی اور وسعت کے ساتھ اللہ نے پانی کے خزانے پیدا فرمائے اور زمین کی تخلیق کے ساتھ جب پانی کو پیدا فرمایا گیا تو کس طرح قیامت تک کی مخلوقات کی ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا نہ جانے کتنے زمانے گزر گئے لیکن آج تک پانی کے خزانوں میں کبھی کمی نہیں آئی اور پھر چونکہ یہ انسان کی ایسی ضرورت ہے جس سے انسان کبھی صرف نظر نہیں کر سکتا اس لیے ہوا کے بعد اس کے ناپیدا کنار سمندر پیدا فرمائے اور کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں پانی کا پہنچنا آسان نہیں کیا گیا۔ کہیں سمندروں کو پیدا کیا گیا۔ کہیں چشمے جاری کر دیئے گئے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ انتظام فرمایا کہ سردیوں میں پہاڑوں پر برف جما کر گرمیوں میں اسے پگھلا کر زمین کی آبیاری کا سامان کیا گیا۔ اور پھر ایک ایسا حیرت انگیز انتظام دیکھنے میں آتا ہے کہ سمندر سے بھاپ اٹھا کر بادلوں کی چادریں بچھائی جاتی ہیں اور انہیں اس طرح برسایا جاتا ہے کہ زمین کا ایک ایک ریشہ اس سے معمور ہو جاتا ہے اور پھر ایسا نہیں ہوتا کہ سارا پانی زمین میں جذب ہو جائے اور زمین دلدل بن جائے اور نہ ایسا ہوتا ہے کہ سارا پانی بہہ جائے اور ندی نالوں میں پہنچ جائے اور زمین مناسب آبیاری سے محروم رہ جائے۔ بلکہ قرآن کہتا ہے کہ ضرورت کے مطابق ہم پانی زمین میں جذب کرتے ہیں جہاں مزید ضرورت ہوتی ہے اس کو روک دیتے ہیں۔ اور باقی پانی ہم ندی نالوں اور جدولوں کی شکل میں واپس دریاؤں اور سمندروں میں لے جاتے ہیں۔ اور پھر پانی کے اوصاف کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے اور بے ساختہ اپنے رب کی یاد آنے لگتی ہے۔ ان میں چند ایک یہ ہیں۔

1- پانی کو سیال پیدا کیا گیا اگر ایسا نہ ہوتا تو اس سے پیاس بجھتی' نہ کپڑے صاف ہوتے اور نہ کھیتیاں سیراب ہوتیں۔

2- جب پانی جمنے لگتا ہے تو وہ کثیر مقدار میں حرارت خارج کرتا ہے جس سے نیچے کا پانی متاثر ہوتا ہے اور غیر منجمد رہتا ہے۔ اگر سردیوں میں سارا پانی جم جاتا تو تمام مچھلیاں اور پانی کے دیگر جانور مر جاتے۔

3- برف پانی سے ہلکی ہوتی ہے یہ پانی کی سطح پر رہ کر نیچے کے پانی کو انجماد سے بچاتی ہے۔

4- اگر سمندر منجمد ہوتے تو دنیا سردی سے ہلاک ہو جاتی۔ اگر ابل رہے ہوتے تو گرمی سے مر جاتی۔ اس کا اعتدال ہی بقائے حیات کا باعث ہے۔

اسی طرح جب ہم اپنے گرد و پیش نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں نباتات کی چاروں طرف پھیلی ہوئی ایک دنیا دکھائی دیتی ہے۔ درخت سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ سبزے کی چادریں بچھی ہوئی ہیں، فصلیں لہلہا رہی ہیں۔ لیکن کبھی ہم نے نباتات کے اعجاز پر غور نہیں کیا کہ یہ نباتات صرف کائنات کا حسن ہی نہیں یہ ہمارے لیے مدار حیات بھی ہے۔ یہ غلہ اور پھول جو ہم کھاتے ہیں، یہ کپڑے جو ہم پہنتے ہیں، یہ چائے، کافی اور شربت جو ہم پیتے ہیں، سب نباتات سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ ربڑ، یہ کاغذ، یہ کوئلہ، یہ تیل، یہ صابن، سب نباتات کا کرشمہ ہے۔ ہماری یہ الماری میں سجی ہوئی کتابیں وہ جنگل ہیں جنہیں مزدور کاٹ کر کاغذ کے کارخانوں تک لے گئے تھے۔ پھولوں کے ننھے سے پودے سے لے کر چنار کے درخت تک آپ کو نباتات کی کروڑوں اقسام نظر آئیں گی۔ ان میں سے کچھ باغوں کی آرائش ہیں، کچھ ہماری غذا ہیں، اور کچھ متاع حیات۔ یہ سب ایک ہی زمین سے اگتی ہیں اور ایک ہی پانی سے نشوونما پاتی ہیں۔ لیکن کمال تخلیق دیکھیے کہ سب کی حیثیت، رنگ، قامت، تاثیر، بو، اور ذائقہ الگ الگ ہے۔

> "وَ فِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ
> وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَاءٍ وَّاحِدٍ
> وَّ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ
> لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔"
>
> زمین میں پاس پاس ایسے قطعات ہیں جن میں کہیں کھیتی، کہیں انگور اور کہیں کھجور کے درخت ہیں۔ ان میں سے

کچھ ایک جڑ سے نکلتے ہیں ہیں اور کچھ الگ جڑوں سے۔
ان سب کی پرورش ایک ہی پانی سے ہوتی ہے لیکن ان کے
ذائقے الگ الگ ہیں۔ ان باتوں میں ارباب دانش کے لیے
کتنے ہی اسباب و شواہد موجود ہیں۔

درخت اپنے پتوں کا دامن ہوا اور سورج کے سامنے پھیلا کے ان سے زندگی کی بھیک مانگتے ہیں۔ ان کی جڑیں بطنِ زمین سے پانی اور غذا لے کر بلند شاخوں تک پہنچاتی ہیں اور پھلوں میں رس‘ مٹھاس اور خوشبو بھرتی ہیں۔ کیا یہ سب کچھ اتفاقا” ہو رہا ہے اور اس انتظام کے پیچھے ایک ہمہ بین آنکھ‘ اور ہمہ دان دانش کارفرما نہیں؟

# کائنات کے حسن و جمال سے حسن الخالقین پر استدلال

میرے بھائیو اور عزیزو!

گزشتہ صحبت میں آپ نے اللہ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر مختلف حوالوں سے دلائل سماعت فرمائے ہیں۔ آج کے خطبے میں گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے تفکر اور تدبر کے مزید اوراق الٹنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں مزید غور و فکر اور تدبر سے جو چیزیں ہماری نظر کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کائنات کا حسن و جمال ہے۔ جو ہر گوشے میں جلوہ آراء ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کوئی چیز بھی سادہ و بے رنگ نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کائنات کے لیے صرف پرورش اور تربیت کا سامان مہیا کیا گیا ہے بلکہ پرورش سے بھی زیادہ بنانے سنوارنے اور فائدہ پہنچانے کی حقیقت کام کر رہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی فطرت میں بناؤ ہے۔ اس کے بناؤ میں خوبی ہے۔ اس کے مزاج میں اعتدال ہے۔ اس کے افعال میں خواص ہیں۔ اس کی صورت میں حسن ہے۔ اس کی صداؤں میں نغمہ ہے اور اس کی بو میں عطر بیزی ہے۔ آسمان سے لے کر زمین تک کوئی چپہ ایسا نہیں جہاں سے انسان غافل و بے پرواہ گذر سکے۔ ہر جگہ اس کے دل کو کھینچنے اور اس کی آنکھوں کو بیدار کرنے اور کانوں کو کھولنے کے لیے دلفریب مناظر‘ بے حجاب جلوے‘ اور شیریں نغمے موجود ہیں۔ پھر ہم زمین کو دیکھتے ہیں تو دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں کہ اس کی سطح پھلوں اور پھولوں سے لدی ہوئی ہے۔ اس کی تہہ میں آب شیریں کی سوتیں بہہ رہی ہیں۔ گہرائی

سے سونا چاندی نکل رہا ہے۔ سائے کے لیے درخت سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ چلنے پھرنے کے لیے سبزے کا ایک مخملیں فرش بچھا دیا گیا ہے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے سبزے کی چادریں بچھا دی گئی ہیں۔ پھولوں میں رنگ و حسن پیدا کر دیا گیا ہے۔ میدانوں کے اکتائے ہوئے لوگوں کے لیے سربفلک پہاڑ اٹھا دیئے ہیں ان میں آبشاریں ہیں جو سینوں کو مسرت سے بھرے دے رہی ہیں۔ اس میں قسم قسم کے درخت ہیں جن کی حسن افروزی اپنی ایک شان رکھتی ہے۔ پھر باغ و انہار ہیں، سبزیاں ہیں، پھل ہیں، قسم قسم کی بیلیں ہیں، پھر زمین کے چارپائے، فضا کے پرند پانی کی مچھلیاں، یہ سب کیا ہے؟ ظاہر ہے یہ ساری چیزیں انسان کی ضرورت کے لیے ضروری نہیں تھیں۔ انسان کے لیے لکڑی کی ضرورت تھی لیکن کیا ضروری تھا کہ درختوں کو چھتریاں بنا دیا جاتا انسان کو غلے کے ضرورت تھی لیکن لہلاتی فصل کو نقرئی لباس پہنانے کی کیا ضرورت تھی۔ پرندے گوشت کے لیے ضروری سہی لیکن ان کو خوبصورت آوازیں، کوئل کی کوک، مور کا ناچ، پپیہے کی پی، چڑیوں کے چہچہے، اور عام پرندوں کے ترانے یہ تو انسان کی ضرورت نہ تھے اور اگر آسمان کی طرف دیکھا جائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہم پر ایک چھت تانی گئی ہے لیکن ستاروں کا نظام اور ان کی سیر و گردش سورج کی روشنی اور اس کی بوقلمونی، چاند کی گردش اور اس کا اتار چڑھاؤ، فضائے آسمانی کی وسعت اور اس کی نے رنگیاں، بارش کا سماں اور اس کے تغیرات یہ سب کیا ہے؟

انسان جب اپنے اردگرد کے حسن و جمال کے یہ بوقلموں جلوے دیکھتا ہے تو دفعتہ" اس کے اندر ان کو بنانے والے کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کیونکہ وہ یہ تصور کرنے سے بالکل قاصر ہے کہ اتنی دلفریبیوں سے معمور یہ دنیا خود بخود وجود میں آگئی اور اگر اس پر حیوانی بلادت کا غلبہ نہیں تو بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔

"فتبارک اللہ احسن الخالقین
پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ بہترین پیدا کرنے والا۔"

مغرب کا ایک سائنس دان رابرٹ کار اسی احساس سے سرشار ہو کر کہتا ہے کہ اے میرے آقا جب میں ان حسین دنیاؤں کو دیکھتا ہوں جو ترے مقدس ہاتھوں نے تعمیر کی ہیں، جب میں ان جھلملاتے تاروں، نشیلی گھٹاؤں، نیلی فضاؤں پر نظر ڈالتا ہوں تو میری روح بے ساختہ پکار اٹھتی ہے کہ اے رب تو کتنا عظیم ہے" ٹالسٹائی جو روس کا مشہور ادیب اور فلسفی گذرا ہے یہی تجربہ مذہب سے منحرف ہونے کے بعد اس کے ایمان لانے کا سبب بنا۔ وہ اپنی کتاب؟ "اے کنفشن" میں لکھتا ہے:

> "مجھے یاد پڑتا ہے کہ خدا سے منحرف ہونے کے بعد میں ایک شام ایک حسین جنگل میں تنہا پھر رہا تھا۔ ہر طرف سے پراسرار آوازیں میرے کانوں میں موسیقی انڈیل رہی تھیں۔ رنگ برنگ چڑیاں شاخوں پر پھدک رہی تھیں اور حسن فطرت پھوار کی طرح برس رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اس بے پناہ حسن، موسیقی، مستی اور سرور کا کوئی نہ کوئی خالق ہونا چاہیے۔ اور یوں میں تین سال تک بھٹکنے کے بعد پھر خدا پر ایمان لے آیا۔ اس ایمان سے مجھے کائنات کے ہر تغیر کی توجیہ مل گئی حریم دل میں بجھی ہوئی شمع پھر فروزاں ہوگئی۔ جس کے اجالوں سے تشکیک و اضطراب کی ظلمتیں کافور ہوگئیں اور مجھ میں یہ احساس پیدا ہوگیا کہ میں بیک وقت زمین پر بھی ہوں اور آسمان پر بھی۔"

کائنات بہت حسین ہے۔ ٹالسٹائی نے جس سہانی شام کا ذکر کیا تھا وہ آج بھی موجود ہے۔ وادیٔ کائنات میں حسن کے دریا بہہ رہے ہیں۔ اسے دیکھنے کے لیے ایک خاص نظر چاہیے اگر نیلی فضاؤں، اودی گھٹاؤں، سبزہ زاروں، کوہساروں، سمندروں، ساحلوں، لہلہاتی کھیتیوں، مسکراتی ہوئی کلیوں میں اللہ نظر نہیں آتا تو پھر وہ جنت میں بھی نظر نہیں آئے گا۔

یہ جابجا پھیلا ہوا حسن اور کائنات کے دلکش نظارے صرف اس لیے ہیں کہ انسان کی حسِّ باطن کو بیدار کریں اور اس میں یہ بصیرت پیدا ہو کہ ایسی حسین و جمیل دنیا بغیر کسی خالق کے وجود میں نہیں آسکتی اور وہ خالق صرف خالق ہی نہیں بلکہ کمالِ قدرت، کمالِ صنعت و حکمت اور کمالِ خیر و برکت کی صفات سے بھی متصف ہے۔

> "افلم یَنظُروا آلی السَّماء فَوقَھم کیفَ بنینٰھا و زینّٰھا ومالھا من فروج والاَرض مدنٰھا والقینا فیھا رواسیِ وانبتنا فِیھا من کلِّ زَوجِ بَھِیج تَبصِرَۃً و ذکریٰ لِکُلِّ عبدٍ مُّنیب"
>
> کیا انھوں نے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا۔ کس طرح ہم نے اس کو بنایا۔ اور اس کو سنوارا۔ اور کہیں اس میں کوئی رخنہ نہیں اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ گاڑ دیئے اور اس میں ہر قسم کی خوش منظر چیزیں اگائیں ہر متوجہ ہونے والے بندے کی بصیرت اور یاد دہانی کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص آسمان و زمین کے ان جلوؤں کو دیکھے اور یونہی گذر جائے۔ اگر آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو اس دنیا کا مشاہدہ انسان میں نہ صرف اپنے پروردگار کے وجود کا ہی یقین پیدا کرتا ہے بلکہ اس کی صفاتِ حسنیٰ اور اس کی یکتائیت کا بھی یقین پیدا کرتا ہے۔ بلکہ اس سلسلۂ تدبر میں جب ہم مزید ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔

## کائنات میں ہمہ گیر ہم آہنگی سے استدلال :

تو کائنات کا مطالعہ ہمارے سامنے نصیحت و عبرت اور علم و دانش کے عجیب و غریب ابواب کھول دیتا ہے کہ ان میں سے ہر باب اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی یکتائیت، اس کے مدبر اعلیٰ اور ہمہ مقتدر ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ ہم

دیکھتے ہیں کہ کائنات میں جو کچھ پیدا کیا گیا ہے ان میں سے بعض مخلوقات ایسی ہیں کہ ان میں ضدین کا تعلق پایا جاتا ہے قرآن کریم خود کہتا ہے:

"ومن کلّ شئیٍ خلقنا زوجین"

ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے اور ان میں باہمی نسبت، سازگاری کی نہیں بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہونے کی ہے۔ بایں ہمہ ان کے درمیان ہمیں حیرت انگیز توافق اور سازگاری نظر آتی ہے۔ بجائے ایک دوسرے سے ٹکرانے اور الجھنے کے ایک دوسرے کے وجود کی حفاظت اور مقصد تخلیق کی تکمیل میں اس طرح لگے ہوئے ہیں کہ ایک کا بغیر دوسرے کے وجود بالکل بے معنی دکھائی دیتا ہے۔ خود انسان ہی کو دیکھئے اس کو مرد اور عورت کے دو انواع میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور پھر دونوں کو الگ الگ طبعی خصوصیات، جبلی صفات اور اندرونی احساسات کا اختلاف دے کر بالکل ایک دوسرے سے الگ الگ شخصیتیں بنا دیا مگر دونوں میں ایک دوسرے کی کشش اور ایک دوسرے کی تکمیل کی فکر اس طرح دلوں میں راسخ کر دی گئی کہ مرد کے پاس جو کچھ ہے وہ عورت کے لیے مطلوب و مرغوب بنا دیا گیا ہے اور عورت کے پاس جو کچھ ہے اسے مرد کے تقاضوں کا جواب ٹھہرایا گیا۔ اس طرح باہم ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہو گئے یہی حال اس کائنات کے تمام اجزائے مختلفہ کا ہے۔ زمین و آسمان، شب و روز، گرمی و سردی نور و ظلمت، حرارت و برودت، سب زوجین کی طرح ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں مگر باہم شدید اتصال بھی رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک کا دوسرے کے بغیر وجود بے مقصد معلوم ہوتا ہے توافق کا یہ قانون ہم صرف ضدین میں ہی نہیں پاتے بلکہ اس کائنات کے نظام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک ہمہ گیر توافق اور سازگاری ہے۔

ہر چیز اپنی ہستی کی بقا اور اپنے وجود کی نشوونما کے لیے اس بات کی محتاج ہے کہ یہ پورا کارخانہ اس کے لیے سرگرم کار رہے۔ گیہوں کا ایک پودا ہی لے لیجئے یہ اپنے وجود میں کمال کو نہیں پہنچ سکتا تاوقتیکہ زمین اس کے لیے

گھوارے کا کام نہ دے۔ سورج اس کے لیے سمندر سے پانی کے ڈول بھر بھر کر فضا میں ابر کی چادریں پھیلا کر اس کے لیے آبیاری کا سامان نہ کرے۔ موسم اس کے لیے نگرانی کا فرض انجام نہ دے۔ آفتاب اس کو ٹھنڈک نہ پہنچائے، سورج اس کے لیے گرمی مہیا نہ کرے اور ہوائیں اس کو لوریاں نہ دیں، یہ سارے عناصر باہم مل جل کر سرگرم کار رہتے ہیں تب جا کر گندم کا ایک پودا اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے اور گیہوں کا ایک دانہ تیار ہو کر خرمن تک پہنچنے کے قابل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے اسی حقیقت کو مختلف جگہ بیان فرمایا۔ سورۃ بقرہ کی آیت نمبر21 اور 22 میں فرمایا گیا:

ترجمہ:

> "اے لوگو، بندگی کرو اپنے اس رب کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے گذرے ہیں۔ تاکہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہو۔ اس کی بندگی کرو جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس نے تمہاری روزی کے لیے پھل پیدا کیے تو تم اللہ کا ہمسر نہ بناؤ در آں حالانکہ تم جانتے ہو۔"

سورہ نحل کی آیت نمبر 65 تا 69 میں کائنات کی ہم آہنگی کو زیادہ تفصیل سے بیان فرمایا:

ترجمہ:

> "اللہ ہی نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس سے زمین کو زندہ کیا اس کے خشک ہو جانے کے بعد۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانی ہے جو بات کو سنتے ہیں۔ اور بے شک تمہارے لئے چوپایوں میں بڑا سبق ہے۔ ہم ان کے پیٹوں کے اندر کے گوبر اور خون کے درمیان سے تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار

اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے بھی۔ تم ان سے نشہ کی چیزیں بھی بناتے ہو اور کھانے کی اچھی چیزیں بھی۔ بے شک اس کے اندر بڑی نشانی ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر القا کیا کہ تو پہاڑوں اور درختوں اور لوگ جو چھتیں اٹھاتے ہیں ان میں چھتے بنا' پھر ہر قسم کے پھلوں/ پھولوں سے رس چوس' پھر اپنے پروردگار کے ہموار راستوں پر چل۔ اس کے پیٹ سے مشروب نکلتا ہے۔ جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے بے شک اس کے اندر بڑی نشانی ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔

ان آیات میں اس عالم کی ہمہ گیر ہم آہنگی کی طرف اشارات ہیں۔ بادلوں سے پانی برستا ہے۔ اس سے زمین لہلہا اٹھتی ہے اس کی نباتات کو چوپائے چرتے ہیں ان سے ان کے اندر دودھ بنتا ہے۔ آلائشوں اور خون کے اندر سے سفید دودھ کی دھاریں نکلتی ہیں اور یہ دودھ پینے والوں کے لیے نہایت لذیذ اور قوت بخش غذا کا کام دیتا ہے اور پھر اسی بارش کے پرورش کئے ہوئے انگور اور کھجور کے پھلوں سے انسان اپنی لذت اور ضرورت کی طرح طرح کی چیزیں پیدا کرلیتا ہے۔ پھر شہد کی مکھیاں ہیں جو پہاڑوں کی بلندیوں' پر درختوں کی شاخوں پر انگور کی ٹٹیوں میں اپنا چھتہ بنالیتی ہیں۔ پھول پھول کے رس چوس کر ان کو جمع کرتی ہیں۔ جن کے رنگ بھی مختلف اور مزے بھی مختلف۔ انسان ان کو پاتا ہے۔ ان سے لذت بھی حاصل کرتا ہے اور بیماریوں میں شفا بھی ان مناظر کو جو شخص بھی دیدۂ عبرت سے دیکھے گا کس طرح باور کرسکتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے یہ تمام حیرت انگیز مظاہر بالکل ایک حادثے کی طرح ظہور میں آگئے ہیں۔

سائنسدان ہمیں بتاتے ہیں کہ آغاز تخلیق میں جب زمین آفتاب سے

الگ ہوئی تھی تو اس کا درجہ حرارت وہی تھا جو سورج کا ہے یعنی 12000 بارہ ہزار فارن ہائیٹ جب یہ حرارت کم ہوتے ہوتے 4000 فارن ہائیٹ ہوگئی تو آکسیجن کی ایک خاص مقدار ہائیڈروجن کی طرف بھاگی اور پانی تیار ہوگیا۔ ان گیسوں کی مختلف مقادیر پر سے کروڑوں مرکبات تیار ہوسکتے ہیں لیکن پانی ان کی صرف ایک ترکیب تقریباً" دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن سے بنتا ہے اور باقی تمام مرکبات زہر ہوتے ہیں سوال یہ ہے کہ اوزان و مقادیر کا یہ تعین خود بخود ہوگیا تھا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کیسٹ کی دوکان میں مفرد ادویہ از خود ایک دوسرے سے مل کر مرکب بن جائیں یا لکڑی کے تختے کشتی کی صورت اختیار کرلیں۔

زمین کے سلسلہ میں اس پر غور فرمائیں کہ یہ زمین کہاں سے آئی۔ ماہرینِ ارض نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ آج سے ہزار ہا صدیاں پہلے ایک بہت بڑا ستارہ سورج کے قریب سے گذرا۔ زورِ کشش سے سورج کے چند ٹکڑے کٹ کر دور خلا میں گھومنے لگے ان میں سے ایک زمین تھی۔ ان ٹکڑوں کو قریب کے ستاروں نے کھینچ کر متوازن کر دیا۔ زمین کی دو حرکتیں ہیں ایک اپنے گرد جو 24 گھنٹوں میں مکمل ہوتی ہے اور دوسری آفتاب کے گرد جو 365 دن لیتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق زمین کو آفتاب سے جدا ہوئے آج دو عرب صدیاں گذر چکی ہیں لیکن ان گردشوں میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آیا۔ ورنہ علمائے ہیئت کے تمام حساب غلط ہو جاتے۔ اپنے گرد زمین ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے اور آفتاب کے گرد 68000 میل فی گھنٹہ کے حساب سے۔ اگر اس کی پہلی رفتار کو دس گنا کم کر دیا جائے تو شب و روز دس گنا لمبے ہو جائیں گے۔ جون میں 140 گھنٹے کا گرم دن زمین کو جھلس کر رکھ دے گا۔ اور جنوری کی اتنی ہی طویل رات ہر شے کو منجمد کر دے گی اور اگر اسے بڑھا دیا جائے تو ہر شے کا وزن کم ہوتا جائے گا۔ اور جب یہ رفتار 16200 میل فی گھنٹہ تک پہنچے گی تو کسی چیز میں کوئی وزن نہیں رہے گا۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا درختوں اور مکانوں کو گرا دے گا اور ہاکی کا بال ہٹ ہونے کے بعد

ہوا میں اڑ جائے گا اور پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔

زمین کا وزن پانچ ارب بلین ٹن ہے۔ اگر آدھا ہوتا تو کشش ثقل نصف رہ جاتی اور اشیاء کا وزن آدھا ہو جاتا اگر یہ وزن دوگنا ہوتا تو ہر چیز کا وزن ڈبل ہو جاتا۔

زمین سورج سے تقریبا” 9 کروڑ 29 لاکھ میل دور ہے۔ اگر یہ فاصلہ کم ہوتا تو ہم گرمی سے مرجاتے اور زیادہ ہوتا تو سردی سے مرجاتے۔ کرۂ زمین کا رخ آفتاب کی طرف بالکل سیدھا نہیں بلکہ 23 درجہ کے قریب ایک طرف کو جھکا ہوا ہے۔ یہی جھکاؤ موسموں کا سبب ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر دن پچھلے دن جیسا ہوتا اور ہم سردی و گرمی' بہار اور برسات کے مناظر' غذاؤں اور پھلوں سے محروم رہ جاتے۔

آغاز آفرینش میں جب زمین ٹھنڈی ہوئی تو دو گیسیں یعنی نائٹروجن اور آکسیجن باہم مل کر ہوا میں تبدیل ہو گئیں نائٹروجن کی مقدار 78.3 تھی اور آکسیجن 20.99- آکسیجن ایک آتش پذیر گیس ہے۔ اگر فضا میں اس کی مقدار زیادہ ہوتی تو آسمانی بجلی کے ایک شرر سے آگ بھڑک اٹھتی اور سب کچھ جل جاتا اور اگر موجودہ مقدار سے نصف ہوتی تو نہ چولہوں میں آگ جلتی اور نہ حیوانی زندگی باقی رہتی۔ کرۂ ہوا میں ذراتِ گرد آبی بخارات اور گیسوں کی وجہ سے کچھ کثافت ہو جاتی ہے اگر یہ نہ ہوتا تو لاتعداد شہاب جو کثیف ہوا کی رگڑ سے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں ہم پر اتنے شرر اور پتھر برساتے کہ زندگی ختم ہو جاتی۔

سمندر کے پاس ہوا کا دباؤ 15 پاؤنڈ فی انچ ہوتا ہے اور ہزار 1000 فٹ کی بلندی پر تقریبا” ساڑھے چودہ پاؤنڈ فی انچ۔ انسان کے کندھے اندازا” 10 مربع انچ جگہ گھیرتے ہیں۔ ان پر ہوا کا دباؤ 1160 پاؤنڈ یعنی ساڑھے چودہ من ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان اس بوجھ کے نیچے پس کیوں نہیں جاتا۔ جواب یہ ہے کہ اس حکیم علی الاطلاق اور عقل کل نے ہوا اور پانی دونوں میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ ان کا دباؤ ہر سمت سے ہر سمت کو ہوتا ہے یعنی اوپر سے

نیچے اور نیچے سے اوپر اس لیے بوجھ کا احساس نہیں ہوتا یہ صورت حال اس امر کا نہایت قوی ثبوت ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک حکیم اور اس کا قوی ارادہ ہے جو اس کو وجود میں لایا ہے اور جو علم و قدرت اور ربوبیت و حکمت کی تمام صفات سے متصف ہے۔ وہی ہے جو اپنے علم و حکمت سے اس کے اجزائے مختلفہ میں ربط و اتصال پیدا کرتا اور ان کو صالح مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور ساتھ ہی اس امر کی شہادت بھی مل رہی ہے کہ آسمان سے لے کر زمین تک اور زمین و آسمان کے درمیان صرف ایک ہی ہے جو مالک و متصرف ہے۔ کوئی دوسرا اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ اگر آسمان اور زمین کے الگ الگ ناظم و مدبر ہوتے یا خیر و شر اور نور و ظلمت کے الگ الگ خدا ہوتے تو کائنات کے ان مختلف افراد میں یہ توافق اور یہ ربط نہ ہوتا جو ہم اس دنیا کے ہر گوشے میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔

انگلستان کے ایک سائنس دان جارج ارس ڈیوس کہتے ہیں کہ میں مدت سے کائنات کے پیچیدہ نظام کا مطالعہ کر رہا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک ذرے سے لے کر آفتاب تک ہر جگہ ایک حیرت انگیز نظم و نسق پایا جاتا ہے روشنی کی ہر شعاع، قطرۂ شبنم کی ہر لرزش اور ہر فطری کیمیائی تغیر پابند آئین ہے۔ یہ امر ناقابل تصور ہے کہ یہ نظم و ضبط اور یہ ترتیب کسی ناظم کے بغیر خود بخود وجود میں کیسے آ گئی۔

### خلاصہ بحث اور نتیجہ :

مختصر یہ کہ کائنات کے مطالعہ کے نتیجے میں غور و فکر اور تحقیق کا قدم جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے آدمی کے سامنے عجیب و غریب حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ کہیں وہ مخلوق کے آئینے میں خالق کو دیکھتا ہے تو کہیں اس کائنات کا حسن اس کے جمال کو آشکارا کرتا ہے۔ کہیں عناصر میں باہمی توافق اور پاسداری اللہ کی بے پناہ قدرت کا یقین دلاتی ہے تو کہیں ضد سے ضد کا وجود اسے حیرت میں ڈال دیتا ہے کہیں مظاہر کائنات کی تسخیر ایک ہمہ مقتدر ذات کا یقین دلاتی ہے تو

کہیں کائنات کی محکم تدبیر اور حیرت انگیز نظم و ترتیب ایک مدبر اعلیٰ کا اذعان پیدا کرتی ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان بالآخر یہ مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کائنات کا حاکم ایک ہے جس کی حاکمیت غیر منقسم ہے۔ اس حاکمیت میں کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں۔ کیونکہ ہم اپنی اجتماعی زندگی میں کسی اجتماعی تنظیم کا تصور اس وقت تک نہیں کر سکتے۔ جب تک حاکمیت کو کسی ایک خاص مرکز میں مرتکز نہ کر دیں۔ اب غور کیجئے کہ یہ دنیا بے شمار اجزاء پر مشتمل ہونے کے باوجود نہ صرف قائم ہے بلکہ پوری قوت و استحکام کے ساتھ قائم ہے۔ اس میں مختلف قویٰ کا تصادم بھی ہے' اضداد کی آویزشیں بھی ہے خیر و شر کے معرکے بھی ہیں لیکن اس دنیا کی کشتی ہے کہ ان موجوں کے تلاطم کے اندر سے بچتی' سنبھلتی' اچھلتی اور کتراتی ہوئی چلتی جا رہی ہے اور اس خوبی اور صفائی کے ساتھ کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس صورت حال کا مشاہدہ ہم میں سے ہر وہ شخص کر رہا ہے جو اس بادشاہی کے نظام پر غور کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کون سی بات عقل سے قریب تر ہے کیا مشرکین کا یہ عقیدہ کہ آسمان و زمین کے معبود الگ الگ ہیں یا یہ حقیقت کہ ایک ہی ہے جو زمینوں کا بھی خدا ہے اور آسمانوں کا بھی؟ کیا اس کائنات سے اس بات کی شہادت مل رہی ہے کہ نور و ظلمت کے الگ الگ الٰہ ہیں یا اس بات کی کہ روشنی اور تاریکی دونوں کو نکالنے والا ایک ہی ہے؟ کیا یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ یہ دنیا بے شمار دیوتاؤں کی ایک رزم گاہ ہے؟ یا یہ نظر آتی ہے کہ اس نظام کا ناظم و مدبر صرف اللہ واحد القہار ہے؟ اگر پہلی بات صحیح ہے تو یہ شیرازہ بکھر کیوں نہیں جاتا؟ یہ نظام درہم برہم کیوں نہیں ہو جاتا؟ عرش والے کے خلاف بغاوت کیوں نہیں پھوٹ پڑتی؟ حاکمیت کے ایسے تشتت و انتشار کے ساتھ یہ وحدت کیونکر قائم ہے؟ یہی حقیقت ہے جو قرآن کریم نے عربوں کے سامنے اور ان تمام مشرک قوموں کے سامنے پیش کی ہے جو اس کائنات میں کسی نہ کسی نوعیت سے حاکمیت کے انقسام کو تسلیم کرتی ہیں۔

"اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ، لَوْ كَانَ

فیہما الہۃ الا اللہ لفسدتا فسبحٰن اللہ رب العرش عما یصفون

کیا انہوں نے زمین کے الگ الہ معبود ٹھرا لیے ہیں وہ زمین کو شاداب کرتے ہیں اگر ان دونوں کے اندر اللہ کے سوا الگ الہٰ ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو کر رہ جاتے۔ تو اللہ عرش کا مالک ان چیزوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔"

دوسری جگہ فرمایا:

"قل لو کان معہ الہۃ کما یقولون اذا لا ابتغوا الیٰ ذی العوش سبیلا سبحٰنہ و تعلیٰ عما یقولون علوا کبیرا

کہہ دو اگر کچھ اور اللہ بھی اس کے شریک ہوتے، جیسے یہ دعویٰ کرتے ہیں تو وہ عرش والے پر ضرور چڑھائی کر دیتے، وہ پاک اور بہت برتر ہے ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں۔"

## دلائل انفس :

پھر اسی پر بس نہیں بلکہ آدمی کے اندر کی دنیا اس کے باطن کا شعور، اس کی طبیعت کا اقتضا اور اس کی تخلیق کا جوہر، انسان کو یہ بات ماننے پر مجبور کرتے ہیں کہ تمہارا کوئی نہ کوئی خدا ہے اور وہ صرف ایک ہے اور یہی وہ فطری طلب ہے جو انسان کو بعض دفعہ مختلف آستانوں پر جھکنے پر مجبور کرتی ہے اور یہی وہ جستجو ہے جس کا سراغ کبھی وہ مظاہر فطرت میں لگاتا ہے اور کبھی مظاہر قدرت میں۔ یہی چیز کبھی محبت بن کر جھلکتی ہے اور کبھی عقیدت و عبدیت بن کر آشکارا ہوتی ہے۔ لیکن انسان کے اندر کی بے چینی اور بے تابی اس وقت تک سکون پذیر نہیں ہوتی جب تک وہ اپنے حقیقی مالک کے آستانے کو تلاش نہیں کر لیتا۔ اس کے اندر شکر کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے احسان مندی

کا جذبہ اس کے دل کی آواز ہے۔ اس کی تنہائیاں کسی محبوب کے تصور سے آباد ہونے کے لیے بے قرار رہتی ہیں۔ مختلف قوتوں کا پیدا کردہ خوف اسے کسی آغوش کی جستجو پر مجبور کرتا ہے اور اسے اس وقت تک قرار نہیں آتا جب تک یہ حقیقی آغوش اسے میسر نہیں آجاتی۔ شرک کی مختلف صورتوں نے انسان کے لیے عقیدت و محبت کے مختلف پیکر اور عبادت و عبودیت کے مختلف آستانے ضرور تراشے لیکن انسان کو حقیقی سکون صرف اس وقت ملا جب اسے احکم الحاکمین کا آستانہ مل گیا۔ جس طرح کسی نمبروں والے تالے کے مختلف نمبر گم ہو جائیں تو انسان ان نمبروں کی تلاش میں رہتا ہے بالآخر جب وہ نمبر جو کھولنے کی ضمانت ہیں وہ مل جائیں تو یہ بند تالا کھل جاتا ہے۔ یہی حال انسان کے قلب و ضمیر کے قفل کا ہے کہ انسان مختلف تجاویز آزماتا رہتا ہے مگر یہ قفل کھلنے میں نہیں آتا یہ اس وقت کھلتا ہے جب وہ اپنے خالق و مالک کو پالیتا ہے انسان کی پوری تاریخ اس پر شاہد و عادل ہے کہ لوگوں نے شرک کی ہزاروں صورتیں اختیار کیں لیکن انہیں سکون کی دنیا صرف توحید کے دامن میں نصیب ہوئی۔ اس لیے پروردگار فرماتا ہے:

> ”الذینَ امنُوا و تَطمَئنُّ قلوبُهم بذکرِ اللہ الا بِذکرِ اللہ
> تطمَئنُّ القلوب“

ترجمہ:

> ”کہ جو لوگ ایمان لائے ان کے دل اللہ کی یاد سے ہی سکون پاتے ہیں۔ خبردار اللہ کا ذکر ہی دلوں کے سکون کا باعث ہے۔

مزید برآں

انسان کی پوری تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ انسانی ضمیر اور اس کے دل کی اجڑی ہوئی دنیا جب بھی آباد ہوئی ہے اللہ کے وجود کے تصور اور اس کی توحید کی حقیقت کو قبول کرنے سے آباد ہوئی ہے اور جیسا کہ عرض کیا گیا یہی وہ شبنم ہے جو دلوں کو ٹھنڈک عطا کرتی ہے، یہی وہ آب حیات ہے

جو مردہ دلوں کو زندگی بخشتا ہے۔ یہی وہ امرت ہے جو بے سکونی اور بے چینی کے ہر مرض کی دوا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ قلب و ضمیر کی اس طلب کے باوجود انسانی دماغ اور انسانی عقل جب قلب و ضمیر پر حاوی ہو جاتے ہیں اور انسان کا علم اور ایجاد کے مصنوعی قالب جب انسانوں کو اپنے حصار میں لے لیتے ہیں تو پھر انسان سے عجیب و غریب غلطیاں سرزد ہوتی ہیں ان میں سے ایک حیران کن غلطی یہ بھی ہے کہ وہ قلب و ضمیر کی آمادگی کے ساتھ توحید الٰہی کو اور اس کی صفات کو تسلیم تو کرتا ہے مگر اس کے لوازم کا انکار کر دیتا ہے۔ مثلاً" وہ ایک طرف تو اس کو کائنات کی ہر چیز کا خالق مانتا ہے مگر ساتھ ہی اولاد کی طلب کے لیے نہ جانے کہاں کہاں دست سوال دراز کرتا ہے۔ ایک طرف تو اسے تمام کائنات کا مدبر اور قادر مطلق سمجھتا ہے اور اس کے علم اور قدرت کو تمام کائنات پر محیط جانتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی علم و ایجاد کے کتنے حوالے ہیں جنہیں وہ اللہ کی ذات سے باہر تلاش کرتا ہے۔ نہ جانے کتنے آستانے ہیں جہاں وہ قدرت اور حکمت کی نمود دیکھتا ہے۔ اسی طرح وہ صفت خلق کو اس کے لیے لازم جانتا ہے لیکن صفت امر کو اس کی خصوصیت سمجھنے کے باوجود اپنی عملی زندگی میں اسے اختیار کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ یہ مانتا ہے کہ میرا وجود، میری جان، میرا ارادہ، میرا احساس، میری تمام صلاحیتیں، میری فعلی اور انفعالی قوتیں ان سب کا خالق وہی ایک خدا ہے مگر بایں ہمہ وہ اسے حاکمیت مطلقہ اور اقتدار اعلیٰ کا مالک سمجھنے سے انکار کر دیتا ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ اپنے سامنے اس کی آخری کتاب کی شکل میں اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی صورت میں آئین اور قانون کو موجود پاتا ہے مگر پھر بھی قانون سازی پر اصرار کرتا ہے۔ اپنے قلب و ضمیر میں اسے موجود سمجھنے کے باوجود دوسروں کی اطاعت کرتا ہے۔ دوسروں سے خوف کھاتا اور دوسروں سے امیدیں باندھتا ہے۔ نماز میں اس کے سامنے جھکتا ہے مگر قانون کی اطاعت کے حوالے سے کبھی کسی آمر کے سامنے، کبھی کسی بادشاہ کے سامنے، کبھی اپنی برادری کے سامنے اور کبھی پارلیمنٹ کے سامنے جھکتا ہے۔ یہ ہمارے قلب و

ضمیر اور عقل و فراست کا وہ تضاد ہے جسے ہم شرک فی الحقوق کا نام دیتے ہیں کہ بندگی صرف اللہ کا حق ہے، اطاعت صرف اسی کو زیب دیتی ہے۔ کبریائی کا تاج اسی پر سجتا ہے۔ اقتدار اعلیٰ کا مالک وہی ہے مگر ہم ان تمام حقوق میں جو سراسر ذات خداوندی کے لیے مخصوص ہیں ہم بندوں کو دینے پر اصرار کرتے ہیں اور کبھی یہ نہیں سمجھتے کہ یہ کتنا بڑا شرک ہے جو سراسر توحیدِ خداوندی کے خلاف ہے اور یہی وہ شرک ہے جس میں آج پوری امت مسلمہ مبتلا ہے۔ اسی وجہ سے وہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہی ہے اور ذلت و نکبت اس کا مقدر بن گئی ہے۔ حالی مرحوم نے اس کے انہی حقوق کی صراحت کے سلسلہ میں کتنی اچھی تشریح کی ہے:

کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق
اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اپنی اس سے لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ
اسی پر ہمیشہ بھروسہ کرو تم
اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم
اسی کی طلب میں مرو جب مرو تم
مبرّا ہے شرکت سے اس کی خدائی
نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی

اور اقبال مرحوم نے اپنے انداز میں اسے سمیٹتے ہوئے یوں ادا کیا:

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

اگر غور و فکر کی دنیا میں مزید ایک قدم اٹھایا جائے تو توحید ایک بیش با

افتادہ حقیقت معلوم ہوتی ہے جس سے صرف نظر کرنا کم از کم انسانیت کے لیے ممکن نہیں ہے بلکہ انسانیت کی توہین ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ توحید کے ایک تو دلائل وہ ہیں جنہیں ہم نے دلائل آفاق، دلائل انفس، اور خود انسانی مسلمات کے لوازم کی حقیقت سے پیش کیا ہے لیکن توحید کی ایک دوسری دلیل جس کا گواہ خود انسان کا اپنا وجود ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوقات پر من حیث المجموع فضیلت اور برتری عطا فرمائی ہے۔ فرشتے جو کارکنان قضاء و قدر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی سب سے پاکیزہ مخلوق ہیں، اس حضرت انسان کو ان کا مسجود بنایا۔ تمام عناصر کائنات کو مسخر فرما کر اس کی خدمت میں لگا دیا۔ زمین اپنی ساری سنگینیوں کے باوجود اس کے لیے گہوارے کا کام دے رہی ہے۔ اس کے اندر کی تمام تر قوتیں اس کی خدمت کے لیے وقف ہیں، اس کا سینہ ہروقت اس کی ضرورتوں کے لیے شق ہونے کو بے چین ہے۔ سمندر اس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہمہ تن آمادہ ہے۔ ہوا اس کو لوریاں دینے کے لیے ہروقت میسر ہے۔ سورج کی گرمی، چاند کی ٹھنڈک، شبنم کی تراوت، بارش کی آبیاری، سبزے کا بستر، درختوں کا سایہ، غرضیکہ یہاں کی ایک ایک چیز ہمہ تن اس کے لیے آمادۂ خدمت ہے۔ قرآن کریم نے جابجا فرمایا:

> ”خلق لکم ما فی الارض جمیعا“
>
> ”زمین میں جو کچھ ہے وہ سب ہم نے تمہارے لئے پیدا فرمایا۔“
>
> (سورہ البقرہ)
>
> ”ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے خشکی اور تری میں ان کو سواری دی اور ستھری چیزوں کی ان کو روزی بخشی، اور اپنی بہت ساری پیدا کی ہوئی چیزوں پر ان کو فضیلت عطا کی۔“
>
> (سورہ بنی اسرائیل)
>
> ”ہم نے انسان کو بہتر انداز پر پیدا فرمایا۔“

(سورہ التین)

"رات اور دن کو، چاند اور سورج کو تمہارے لیے مسخر کیا،
اور ستارے اس کے حکم سے کام میں لگے ہوئے ہیں۔"

(سورہ النحل)

وہی خدا ہے جس نے سمندر کو تمہارے لیے مسخر کیا تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور پانی میں سے تم آرائش کے موتی پہننے کے لیے نکالو اور دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر کو چیرتے پھرتے ہیں تاکہ تم خدا کے فضل و کرم کو تلاش کرو۔ اور پھر اسی پر بس نہیں بلکہ اس خالق کائنات نے اس زمین پر انسان کو اپنا خلیفہ بنایا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ انسان جو اللہ کی مخلوق میں سب سے افضل و بالا ہے پھر جو زمین پر اللہ کا نائب ہے تمام مخلوق جس کی خدمت کے لیے مسخر کر دی گئی ہیں اور جسے حق ہے کہ زمین پر اپنے لیے اللہ کی مرضی نافذ کرنے کے لیے کائنات میں جس چیز کو چاہے اسے اپنے استعمال میں لائے کیا اسے یہ بات زیب دیتی ہے کہ کائنات کی وہ قوتیں جو اس کے لیے خادم بنائی گئی ہیں ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے؟ کیا کائنات کی کسی ایسی چیز کے سامنے وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جائے جس سے وہ خود افضل ہے یا کسی ایسی شخصیت کی بندگی کرنے لگے کہ جس سے خدمت لینے اور چاکری کرانے کا اسے یہ کہہ کر حکم دیا گیا کہ تم زمین پر میرے خلیفہ ہو۔

اگر انسان اپنی اس حیثیت کو اور اپنی حقیقت کو واقعی سمجھ لے تو پھر اس کے لیے اللہ کی توحید کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ پھر وہ پانی کو کبھی جل دیوتا نہیں سمجھ سکتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ تو میری خدمت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ کبھی وہ دریاؤں اور سمندروں کو، پہاڑوں اور چٹانوں کو، سورج اور چاند کو، قوت و ہیبت کی علامت سمجھ کر ان کے سامنے جھکنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا جب تک وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ سارے تو میری خدمت کے لیے بنائے گئے ہیں۔ سورج اس لیے چمکتا ہے کہ میرے لیے روشنی مہیا کرے، اور گرمی کا سامان مہیا کرے، چاند کو اس لیے پیدا کیا گیا کہ وہ رات کو چراغ راہ کا کام دے

سکے، ستارے میرے لیے جھلملاتے ہیں، کلیاں میرے لیے چٹکتی ہیں، پھول میرے لیے مسکراتے ہیں، پرندوں کے نغمے میرے لیے ہیں، سبزے کے مخملیں فرش میرے لیے بچھائے گئے ہیں، برق و رعد کے کرشمے اور برسات کی گھٹائیں یہ سب میری آسودگی کے لیے ہیں۔ یہ حسن کے حوالے سے جو کچھ ہے وہ میرے جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لیے ہے۔ مشکلات اور موانع میں سے جو کچھ ہے وہ میری اولوالعزمیوں کے امتحان کے لیے ہے۔ جب انسان اس طرح خود شناسی کی منزل سے گذر کر خود آگاہی کی منزل میں داخل ہو جاتا ہے اور صرف اس ایک ذات سے اپنا تعلق جوڑ لیتا ہے تو پھر اگر قطرہ بھی ہو تو سمندر کے خواص اس میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ اگر کمزور بھی ہو تو اس بے پناہ کی بے پناہی کا عکس اس میں اتر آتا ہے۔ وہ جسمانی کمزوریوں، غذا کی ضرورتوں اور ارلووں کی ناتوانیوں کے باوجود بھی استغنا، بے نیازی، بے خوفی، دل و دماغ کی پاکیزگی، بھروسے اور توکل کی توانائی، نعمتوں کی شادکامی، صبر اور شکر کی بے پناہی کا پیکر بن کر اس طرح اٹھتا ہے کہ اس کی منزل صرف آخرت اور اس کی طلب صرف ذات خداوندی بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ صرف ایک اللہ اور اس کی رضا کے لیے جیتا ہے اور اسی کے راستے میں مرنے کو اپنی سعادت سمجھتا ہے۔ چونکہ اس کی نگاہوں میں اللہ کی قدرتیں بس جاتی ہیں اس لیے وہ دنیا کی کسی بڑی سے بڑی قوت کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ اور چونکہ اس کا دل صرف اللہ کی یاد سے آباد اور اسی کی رضا کی طلب میں مضطرب اور بے چین رہتا ہے اس لیے وہ دنیا میں رہ کر بھی دنیا اور اہل دنیا سے دل نہیں لگاتا بلکہ وہ توحید کا عملی پیکر بن کر جوہر مرحوم کے اس شعر کی تصویر ہوتا ہے۔

؎ توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

# رسالت کا مفہوم

## انسانی رہنمائی کے لیے رسالت کی ضرورت، حواس اور عقل کی نارسائی

میرے بھائیو اور عزیزو! خالقِ کائنات نے اپنی آخری کتاب میں تکوین وجود کے چار مراتب بیان فرمائے ہیں۔ خلق، تسویہ، تقدیر اور ہدایت۔ کائنات کی ہر مخلوق کا عدم سے وجود میں آنا اس کی صفتِ خلق کا اظہار ہے۔ مگر ہر مخلوق کا اس طرح پیدا کیا جانا جس طرح اسے ہونا چاہیے تھا اور اس کے نک سک کا درست ہونا اور اس میں انتہا درجے کا تناسب پایا جانا اور ہر طرح اپنے ماحول سے اس کا مناسبت رکھنا اور ماحول کا اس کے ساتھ مناسب ہونا یہ وہ چیز ہے جس کو تسویہ کہا گیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کی ہر مخلوق اپنے وجود کے اعتبار سے اس طرح واقع ہوئی ہے کہ اس کا جسم اور اس کا ماحول باہم دِگر ایک دوسرے کے لیے معاون و مددگار بن گئے ہیں۔ پرند ہوا میں اڑتے ہیں تو انہیں پر عطا کیے گئے۔ مچھلیاں پانی میں پیدا ہوتی ہیں تو انہیں تیرنا سکھایا گیا۔ حشرات الارض کوڑا کرکٹ میں پیدا ہوتے ہیں تو انہیں رینگنا سکھایا گیا۔ چرند اور درند جنگل میں دوڑ پھر رہے ہیں تو انہیں دوڑنا سکھایا گیا۔ مچھلی خشکی میں پیدا نہیں کی گئی۔ پرندے پانی میں پیدا نہیں کیے گئے اس لیے کہ ان کا جسمانی تناسب اس کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں بلکہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہر مخلوق کے لیے پہلے سے یہ طے کر دیا گیا کہ اسے کس طرح کا کام انجام دینا ہے؟ اس کی حدودِ کار کیا ہوں گی؟ اس کی قوت عمل کس طرح کی

ہوگی؟ اسے کب تک کس حال میں رہنا ہے؟ اور کس حد تک اپنے کام کو انجام دینا ہے؟ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اور اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے اسے کون سی صلاحیت درکار ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے قرآن کریم میں تقدیر کا نام دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورج کو پیدا کیا گیا تو اس کا مقصد وجود مقرر کر دیا گیا۔ چاند کو پیدا کیا گیا تو اس کے عمل کا ایک دائرۂ ٹھہرا دیا گیا۔ ستارے بنائے گئے تو انہیں ان کی ڈیوٹیاں سمجھا دی گئیں۔ نباتات سے لے کر آسمان کی ہر مخلوق تک ہر ایک کے لیے ایک تقدیر بنا دی گئی۔ چنانچہ یہ ممکن نہیں ہے کہ سورج اپنے دائرۂ کار سے باہر نکل جائے اپنے مقصدِ وجود یعنی کائنات کو روشنی دینے اور گرمی پہنچانے سے رک جائے۔ یہ ممکن نہیں کہ چاند اپنی حلاوت سے اہل زمین کو محروم کر دے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ستارے جھلملانا چھوڑ دیں۔ یہ ناممکن ہے کہ پھول خوشبو دینے اور پانی پیاس بجھانے سے انکار کر دے۔ ہر ایک اپنے اپنے کام پر لگا ہوا ہے اور انہیں اپنا مقصد وجود اور دائرۂ کار اچھی طرح معلوم ہے اور پھر شعور کی آنکھ سے اگر مزید کام لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ تمام مخلوقات کو یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ تمہیں اپنے اپنے فرائض کس طرح انجام دینا ہیں۔ مچھلی کو اگر پانی میں تیرنے کا حکم دیا گیا ہے تو ایسا نہیں ہے کہ اس کو تیرنا نہ سکھایا گیا ہو۔ پرند کے لیے اگر ہوا میں اڑنے کو مقدر کیا گیا تو ایسا نہیں ہے کہ اسے اڑنے کی تعلیم نہ دی گئی ہو۔ سورج چاند اور ستاروں کو جس کام پر لگا دیا گیا ہے ایسا نہیں ہے کہ انہیں اس کی ہدایت نہ دی گئی ہو۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ:

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ

> کہ سورج کی مجال نہیں کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور رات کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ دن سے آگے بڑھ جائے۔
> ہر ایک کا اپنا ایک دائرہ ہے اور اپنے دائرے میں مصروفِ عمل ہے۔

اس کی ہدایت کی ہمہ گیری کا عالم یہ ہے کہ کائنات کی کوئی چیز ایسی

دکھائی نہیں دیتی کہ اسے وجود ملا ہو اور وہ غایت وجود سے بے خبر ہو اور پھر اس کو روبعمل لانے سے وہ بے بہرہ ہو۔ اس نے کلیوں کو پیدا کیا ہے تو انہیں چٹکنا بھی سکھایا۔ اس نے پھول کو پیدا کیا تو اسے مہکنا بھی سکھایا۔ اس نے درختوں کو پیدا کیا تو انہیں لہکنا بھی سکھایا۔ اس نے ستاروں کو پیدا کیا تو انہیں جھلملانا اور ٹمٹمانا بھی سکھایا ہے۔ اس نے بادل کو پیدا کیا تو اسے کڑکنا بھی سکھایا۔ اس نے رعد کو گرجنا اور بجلی کو چمکنا سکھایا۔ اس نے پرندے کو چہکنا اور ہوا کو لہکنا سکھایا۔ اس نے آگ کو جلانا اور پانی کو بہنا سکھایا۔ اس نے حسن کو مچلنا اور عشق کو پگھلنا سکھایا۔ غرض یہ کہ کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں جسے اس نے تقدیر اور ہدایت سے نہ نوازا ہو۔ حتی کہ غور و فکر کے اگر چند اور اوراق الٹے جائیں تو بعض چیزیں ایسی سامنے آتی ہیں کہ آدمی حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مچھلیوں میں سے دو کا سفر بہت حیرت انگیز ہے۔

### 1- سامن مچھلی :

یہ اگر کسی ندی میں پیدا ہو تو جوان ہونے کے بعد یہ پہلے دریا میں اور وہاں سے سمندر میں چلی جاتی ہے وہاں مدتوں رہتی ہے اور جب اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی موت قریب آگئی ہے تو وہ واپس چل پڑتی ہے یہ سمندر اور دریا سے ہوتی ہوئی ندی کے اس مقام پر جا رکتی ہے جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔ اگر دوران سفر میں وہ کسی غلط ندی کی طرف مڑ جائے تو اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے اور واپس آجاتی ہے۔

### 2- ایل مچھلی :

یہ کسی ندی میں ہو یا دریا میں جوان ہونے کے بعد اپنے وطن سے چل پڑتی ہے اور ہزاروں میل دور جزائر برموده (اوقیانوس) میں چلی جاتی ہے۔ وہاں بچے دے کر مرجاتی ہے یہ بچے وہاں سے چل کر اپنی ماں کے وطن میں آجاتے ہیں اور وہاں سے پھر جزائر برموده میں پہنچ کر پہلے بچے دیتے ہیں بعد ازاں مرجاتے ہیں۔

تکوینِ وجود اور تکمیل وجود کے یہ چار مراحل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو پیدا فرمایا۔ پھر اس کا تسویہ کیا' پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کر دی اور پھر اسے اس تقدیر کے مطابق زندگی اور معیشت کی راہ پر چلنے کا طریقہ سکھایا۔ یعنی ہدایت عطا فرمائی۔ اس ہدایت پر اگر غور کیا جائے تو اس کے چار طریقے معلوم ہوتے ہیں۔ نباتات میں یہ ہدایت فطرتی رہنمائی کا درجہ رکھتی ہے جس کے نتیجے میں بیلیں زمین پر پھیلتی' پودے سر اٹھاتے' درخت تن کر کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی ہدایت کے مطابق برگ و بار لاتا ہے اور پھل اور پھول دیتا ہے۔ لیکن حیوانات میں ہم اس فطری ہدایت کو اندرونی الہام کی شکل میں دیکھتے ہیں کہ ہر حیوان کا بچہ ادھر پیدا ہوتا ہے اُدھر کوئی الہام کرنے والا اسے یہ الہام کرتا ہے کہ تیری غذا ماں کے سینے میں یا تیرے قریب ہی رکھ دی گئی ہے وہاں سے تجھے اس طرح حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ ہم بلی کے بچے کو دیکھتے ہیں کہ ابھی اس نے آنکھیں کھولی نہیں اور خارج کے موثرات نے اسے چھوا تک نہیں مگر وہ اپنی ماں کی چھاتی کو ٹٹولتا ہے اس پر منہ مارتا ہے اور پستان کو منہ میں لے کر چوسنے لگتا ہے اور بلی فرطِ محبت سے اسے چاٹ رہی ہے۔ آپ نے بلی کو دیکھا ہو گا جسے اس سے پہلے بچے کو جننے کا کوئی تجربہ نہیں ہے مگر جیسے ہی اس کے وضعِ حمل کے دن قریب آتے ہیں وہ الگ تھلگ کونے کی تلاش میں ماری ماری پھرتی ہے اور پھر کسی الگ کونے کو عافیت کی جگہ سمجھتے ہوئے بیٹھ جاتی ہے اور بچے جن دیتی ہے اور پھر وہ جس طرح اپنے بچوں کی نگہداشت کرتی ہے اور ایک موہوم خطرے کو محسوس کرتے ہوئے مختلف جگہیں بدلتی ہے یہ سوائے اس کے اور کیا ہے کہ کوئی اندرونی الہام ہے جو اسے ہر معاملہ کی ہدایت دے رہا ہے۔ خود انسان کا بچہ جو جانوروں کے بچوں سے بھی زیادہ بے بس ہوتا ہے جس کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے کہ:

"ھُوَ الَّذِی اَخرَجَکُم مِّن بُطُونِ اُمَّھَاتِکُم لَا تَعلَمُونَ شَیئاً"

وہ ذات ہے جس نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حال میں کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی ماں کی مامتا بے تاب ہو کر اسے سینے سے لگاتی ہے اور وہ ماں کی چھاتی کے ساتھ منہ مارنے لگتا ہے اور پستان منہ میں لے کر چوسنے لگتا ہے تاکہ اپنی غذا حاصل کرے۔ سوال یہ ہے کہ آخر اس بچے کو یہ کون سکھاتا ہے کہ تیری غذا ماں کی چھاتی میں ہے اور تجھے اس طرح اسے چوسنا ہے یہ وہ اندرونی الہام ہے جس کے ذریعے کے انسان کو سب سے پہلی ہدایت دی جاتی ہے۔

ہدایت کا دوسرا مرتبہ حواس اور مدرکاتِ ذہنی کی ہدایت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ حیوانات اس جوہر دماغ سے محروم ہیں جسے عقل و فکر سے تعبیر کیا جاتا ہے تاہم فطرت نے انہیں ادراک و احساس کی وہ تمام قوتیں دے دی ہیں جن کی زندگی و معیشت کے لیے ضرورت تھی اور ان کی مدد سے وہ اپنے رہنے سہنے' کھانے پینے' توالد و تناسل اور ہدایت و نگرانی کے تمام فرائض حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہتے ہیں۔ پھر حواس و ادراک کی یہ ہدایت ہر حیوان کے لیے ایک ہی طرح کی نہیں ہے بلکہ ہر وجود کو اتنی ہی اور ویسی ہی استعداد دی گئی ہے جتنی اور جیسی استعداد اس کے احوال و ظروف کے لیے ضروری تھی۔ چیونٹی کی قوت شامہ نہایت دور رس ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اسی قوت کے ذریعے وہ اپنی غذا حاصل کر سکتی ہے۔ چیل اور عقاب کی نگاہ تیز ہوتی ہے کیونکہ اگر ان کی نگاہ تیز نہ ہو تو بلندی میں اڑتے ہوئے اپنا شکار نہ دیکھ سکیں۔ یہی وہ ہدایت ہے جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی اشار کیا گیا فرعون نے جب پوچھا کہ:

”فَمَنۡ رَّبُّکُمَا یا موسیٰ.....“

کہ اے موسیٰ تمہارا پروردگار کون ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

رَبُّنَا الَّذِی اعطیٰ کُلَّ شئی خَلقَہ ثُمَّ ھدٰی

ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ پھر اسے ہدایت دی، یعنی اس پر زندگی اور معیشت کی راہ کھول دی۔ پھر یہی وہ ہدایت ہے جسے دوسری جگہ راہِ عمل آسان کر دینے سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا:

”من ای شئی خلقه من نطفة خلقهٖ فقد زه ثم
السبیل یسره

اس نے انسان کو کس چیز سے پیدا کیا۔ نطفہ سے پیدا کیا پھر اس کی تمام ظاہری و باطنی قوتوں کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا دیا پھر اس پر زندگی اور عمل کی راہ آسان کر دی۔ ہدایت کے یہ دو مرتبے ہوئے جسے ہم ہدایتِ الہام اور ہدایتِ حواس کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ دونوں مرتبے انسان اور حیوان سب کے لیے ہیں۔ الہام کی ہدایت انسان اور حیوان میں سعی و طلب کا ولولہ پیدا کرتی ہے۔ حواس کی ہدایت کا مرتبہ اس سے بلند تر ہے۔ یہ ہمیں دیکھنے، سننے، چکھنے، چھونے اور سونگھنے کی قوتیں بخشتی ہے اور انہی کے ذریعے ہم خارج کا علم حاصل کرتے ہیں اور یہ ہدایت ہمارے لیے معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ حیوان کے لیے تو ہدایت کے یہ دونوں مرتبے کافی ہیں۔ کیونکہ اسے زندگی کا جو طریقہ اور جو نصب العین سکھایا گیا ہے اس کے لیے کسی تیسرے مرتبے یا ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن انسان کے لیے ایک تیسرے مرتبہ ہدایت کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کے لیے مجرد احساس کافی نہیں اور نہ صرف محسوسات کا علم اس کے لیے کفایت کرتا ہے۔ انسان کو تو استنباط اور استنتاج کی بھی ضرورت ہے۔ احکام کی بھی ضرورت ہے اور کلیات کی بھی ضرورت ہے اور یہ کام صرف حواس کی ہدایت سے ممکن نہیں۔ اس لیے انسان کو ایک تیسرے مرتبۂ ہدایت سے نوازا گیا۔ یہ وہ ہے جسے جوہر عقل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جوہرِ عقل دراصل اسی قوت کی ایک ترقی یافتہ حالت ہے جس نے حیوانات میں الہام و وجدان اور حواس کی روشنی پیدا کر دی ہے۔ جس طرح انسان کا جسم اجسامِ ارضی کی سب سے اعلیٰ کڑی ہے اسی طرح اس کی معنوی

قوت بھی تمام معنوی قوتوں کا برترین جوہر ہے۔ روح حیوانی کا وہ جوہرِ ادراک جو نباتات میں مخفی اور حیوانات کے وجدان و مشاعر میں نمایاں تھا انسان کے مرتبہ میں پہنچ کر درجۂ کمال تک پہنچ گیا اور جوہر عقل کے نام سے پکارا گیا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ہدایتِ فطرت کے ان تینوں مرتبوں میں سے ہر مرتبہ اپنی قوت و عمل کا ایک خاص دائرہ رکھتا ہے اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور اگر اس مرتبہ سے ایک دوسرا بلند تر مرتبہ موجود نہ ہوتا تو ہماری معنوی قوتیں اس حد تک ترقی نہ کرسکتیں جس حد تک فطرت کی راہنمائی سے ترقی کر رہی ہیں۔

الہام کی ہدایت ہم میں طلب و سعی کا جوش پیدا کرتی ہے۔ مطلوبات زندگی کی راہ پر لگاتی ہے لیکن ہمارے وجود سے باہر جو کچھ موجود ہے اس کا ادراک حاصل نہیں کرسکتی۔ یہ کام مرتبہ حواس کی ہدایت کا ہے۔ وجدان کی راہنمائی جب درماندہ ہو جاتی ہے تو حواس کی دستگیری نمایاں ہوتی ہے۔ آنکھ دیکھتی ہے، کان سنتے ہیں، زبان چکھتی ہے، ہاتھ چھوتا ہے، ناک سونگھتی ہے اور اس طرح ہم اپنے وجود کے باہر کی تمام محسوس اشیاء کا ادراک حاصل کرلیتے ہیں لیکن حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد تک ہی کام دے سکتی ہے اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آنکھ دیکھتی ہے مگر صرف اسی حالت میں جبکہ دیکھنے کی تمام شرطیں موجود ہوں اور اگر کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے مثلاً روشنی نہ ہو یا فاصلہ زیادہ ہو تو ہم آنکھ رکھتے ہوئے بھی ایک موجود چیز کو براہ راست نہیں دیکھ سکتے۔ علاوہ بریں حواس کی ہدایت صرف اتنا ہی کرسکتی ہے کہ اشیاء کا احساس پیدا کر دے لیکن مجرد احساس کافی نہیں ہے ہمیں استنباط و استنتاج کی بھی ضرورت ہے۔ جس کے نتیجے میں ہم کلیات وضع کرتے ہیں اور کلیات سے احکام نکالتے ہیں اور یہ کام عقل کی ہدایت کا ہے۔

اسے مثال سے یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ حواس تعمیر کے کام میں مزدوروں کی طرح ہیں۔ جن کا کام خام مواد مہیا کرنا، بکھری ہوئی چیزیں فراہم کرنا، مسالہ بہم پہنچانا اور عقل کی حیثیت ایک معمار کی ہے جس کا کام بکھرے ہوئے مواد کو جوڑ کر ایک عمارت کو تشکیل دینا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر مرتبہٴ

حواس کے بعد عقل کا جوہر عطا نہ کیا جاتا تو ہماری بکھری ہوئی معلومات، ہمارے منتشر محسوسات، ہماری زندگی کے کسی شعبہ کے لیے معاون ثابت نہ ہوتے کیونکہ ان سے کام لینا، انہیں ترتیب دینا اور ان سے کلیات وضع کرنا اور پھر ان سے احکام استنباط کرنا۔ عقل کا کام ہے اور عقل کی عدم موجودگی میں ظاہر ہے یہ کام نہیں ہو سکتا تھا اور ہم زندگی کے میدان میں ناکام ہو جاتے ۔ پھر ایک اور پہلو بھی انتہائی قابل غور ہے وہ یہ کہ جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ وجدان اور فطری الہام کی نگرانی کے لیے حواس کی راہنمائی کی ضرورت ہے کیونکہ وجدان اور احساس انسانی ضرورتوں کی راہنمائی کے لیے کافی نہیں۔ نیز ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وجدان اور احساس غلطیوں سے مبرا نہیں۔ ان کی تصحیح و نگرانی کے لیے ہمیں حواس کی راہنمائی کی ضرورت ہے اسی طرح ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حواس کی راہنمائی بھی نارسائی کا شکار ہوتی ہے اور غلطیوں سے محفوظ بھی نہیں۔ مثلاً" ہم دور سے ایک چیز دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں ایک سیاہ نقطے سے زیادہ حجم نہیں رکھتی۔ حالانکہ وہ ایک عظیم الشان گنبد ہوتی ہے۔ ہم بیماری کی حالت میں شہد جیسی میٹھی چیز چکھتے ہیں لیکن ہماری قوت ذائقہ ہمیں یقین دلاتی ہے کہ اس کا مزا کڑوا ہے۔ ہم تالاب میں ایک لکڑی کا عکس دیکھتے ہیں لکڑی بالکل سیدھی ہوتی ہے لیکن عکس میں ٹیڑھی دکھائی دیتی ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی عارضے کی وجہ سے کان بجنے لگتے ہیں اور ہمیں ایسی صدائیں سنائی دیتی ہیں جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہے۔ اب اگر مرتبۂ حواس سے ایک بلند تر مرتبہ ہدایت کا وجود نہ ہوتا تو ممکن نہیں تھا کہ ہم حواس کی درماندگیوں میں حقیقت کا سراغ پا سکتے لیکن ان تمام حالتوں میں عقل کی ہدایت نمودار ہوتی ہے۔ وہ حواس کی درماندگیوں میں ہماری راہنمائی کرتی ہے۔ وہ ہمیں بتلاتی ہے کہ سورج ایک عظیم الشان کرہ ہے۔ اگرچہ ہماری آنکھ اسے ایک سنہری تھال سے زیادہ محسوس نہیں کرتی۔ وہ ہمیں بتاتی ہے کہ شہد کا مزا ہر حال میں میٹھا ہے اور اگر ہمیں کڑوا محسوس ہوتا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ ہمارے منہ کا مزا بگڑ گیا ہے۔ وہ ہمیں بتلاتی ہے کہ بعض اوقات خشکی بڑھ جانے

سے کان بجنے لگتے ہیں اور ایسی حالت میں جو صدائیں سنائی دیتی ہیں وہ خارج کی صدائیں نہیں ہوتیں خود ہمارے ہی دماغ کی گونج ہوتی ہے۔ گزشتہ معروضات میں آپ نے دیکھا کہ وجدان اور الہام کی ہدایت کے بعد حواس کی ہدایت نمودار ہوئی۔ کیونکہ وجدان کی ہدایت ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی اور پھر حواس کے بعد عقل کی ہدایت نمودار ہوئی۔ کیونکہ حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی اور اس کے ساتھ یہ بات بھی کہ وہ غلطیوں سے اور نارسائیوں سے محفوظ بھی نہیں تھی۔ ٹھیک اسی طرح ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ دونوں کمزوریاں عقل کے ساتھ بھی لگی ہوئی ہیں۔ کیونکہ عقل زندگی کے ہر شعبہ میں نہ تو مکمل راہنما ہے اور نہ بالکل صحیح راہنما ہے۔ اس کا بھی ایک محدود دائرۂ عمل ہے جس سے یہ آگے نہیں بڑھ سکتی اور اس کی کارفرمائی بھی غلطیوں سے مبرا نہیں۔ کیونکہ اس کا دائرۂ عمل جیسا کچھ بھی ہے وہ محسوسات کے دائرے میں محدود ہے۔ یعنی وہ صرف اس حد تک کام دے سکتا ہے جس حد تک ہمارے حواس خمسہ معلومات بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ لیکن محسوسات کی سرحد سے آگے کیا ہے؟ پردے کے پیچھے کیا ہے؟ جس سے آگے ہماری چشمِ حواس نہیں بڑھ سکتی یہاں پہنچ کر عقل یک قلم درماندہ ہو جاتی ہے اس کی ہدایت ہمیں کوئی روشنی نہیں دے سکتی۔ بقول اقبال:

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغِ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے

یوں کہنا چاہیے کہ عقل ایک صحیح راہنما ہے۔ لیکن مکمل نہیں۔ غلطی ہماری ہے کہ ہم اسے ایک مکمل راہنما سمجھ کر زندگی کے ہر دائرۂ عمل میں اس سے راہنمائی کے طالب ہوتے ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ جیسے کسی آدمی نے کسی صراف سے یہ پوچھا کہ صراف میاں تمہارا میزان کیسا ہے؟ اس نے کہا بالکل صحیح ہے۔ بالکل صحیح تولتا ہے۔ ذرہ بھر کمی بیشی نہیں ہونے دیتا۔ اس نے

کہا اگر تمہاری بات صحیح ہے تو پھر اس میں اپنی دوکان تول کر دکھاؤ۔ اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا بھلے آدمی یہ دوکانیں تولنے کے لیے تھوڑے ہی بنایا گیا ہے اس میں تو سونا چاندی تولتے ہیں۔ اس نے کہا کہ تم نے تو کہا تھا کہ تمہارا میزان بالکل صحیح ہے۔ اس نے کہا میں نے صحیح کہا تھا۔ یہ غلطی میزان کی نہیں غلطی تمہاری ہے کہ تم اس میں وہ چیز تلوانا چاہتے ہو جو اس کے دائرۂ کار سے باہر کی ہے۔ ہم بھی جب عقل سے وہ کام لینا چاہتے ہیں جو اس کے دائرۂ کار میں نہیں آتا۔ اس کا دائرۂ کار محسوسات تک محدود ہے۔ طبیعات تک محدود ہے رہی یہ بات کہ محسوسات کے دائرۂ کے پیچھے کیا ہے اور مابعد الطبیعات کیا ہے عالمِ لاہوت اور عالمِ الہیات کیا ہے، عالمِ ملکوت کا کیا حال ہے؟ عالمِ برزخ میں کیا ہو رہا ہے؟ عالمِ آخرت میں کیا ہوگا۔ موت اور زندگی کی حقیقت کیا ہے۔ روح کس چیز کا نام ہے؟ کائنات کی ابتداء کیا ہے اور انتہا کیا ہے؟ اللہ کی صفات کیا ہیں؟ اخلاقی مسلمات کی حقیقت کیا ہے؟ قوموں کے عروج و زوال کے اصل اسباب کیا ہیں؟ وہ اخلاقی نقطہ کیا ہے جس سے انسانیت کا آغاز ہوتا ہے اور پھر انسانیت پروان چڑھتی ہے؟ انسانیت کے مسلمہ مسائل کا اجتماعی حل کیا ہے؟ انسان کے اندر بیٹھا ہوا انسان کس چیز سے مرتا اور کس چیز سے جیتا ہے۔ یہ وہ زندگی اور کائنات کے حقائق ہیں جس سے پردہ اٹھانا عقل کی بساط سے باہر ہے لیکن جب ہم انہی چیزوں کا جواب عقل سے مانگتے ہیں تو ہم اس پر ایک ایسا بوجھ لاد دیتے ہیں جس کا تحمل اس میں نہیں ہے۔ بلکہ بعض دفعہ ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کے بالکل پیش پا افتادہ حقائق بھی انسانی عقل کی گرفت سے باہر معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً آپ غور فرمایئے کہ نفس انسانی طرح طرح کی خواہشوں اور جذبوں سے کچھ اس طرح گھرا ہوا ہے بلکہ اس طرح مقہور واقع ہوا ہے کہ جب بھی عقل اور جذبات میں کشمکش ہوتی ہے تو اکثر حالتوں میں فتح جذبات ہی کی ہوتی ہے۔ بسا اوقات عقل ہمیں یقین دلاتی ہے کہ فلاں فعل مضر اور مہلک ہے لیکن جذبات ہمیں ترغیب دیتے ہیں اور ہم اس کے ارتکاب سے اپنے آپ کو نہیں روک سکتے۔ عقل کی بڑی سے بڑی

دلیل بھی ہمیں ایسا نہیں بنا دے سکتی کہ غصے کی حالت میں بے قابو نہ ہو جائیں اور بھوک کی حالت میں مضر غذا کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں۔

جذبات تو پھر بھی ایک زور دار شے ہے۔ وہم تو انسانی احساسات میں سے ایک کمزور حس کا درجہ رکھتا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات وہم جیسا کمزور جذبہ بھی عقل انسانی پر غالب آجاتا ہے۔ عقل جانتی ہے کہ ایک انسان کو گذرنے کے لیے ایک فٹ یا زیادہ سے زیادہ دو تین فٹ چوڑی گذر گاہ کافی ہے۔ اگر کسی عقل کے پرستار سے یہ پوچھا جائے کہ دریا کے اوپر گذر گاہ بنانے کے لیے کتنا چوڑا پل ہونا چاہیے تو وہ عقل کے مطابق اتنی ہی چوڑائی تجویز کرے گا۔ لیکن اگر کسی عقل کے پرستار سے کسی ایسے پل سے گذرنے کو کہا جائے جو تین فٹ چوڑا ہو لیکن اس کے نیچے سے گذرنے والا دریا طغیانی پر آیا ہوا ہو جس کی موجیں اچھل کر دریا کے پل کو چھو رہی ہوں تو یہی عقل کا پرستار بھی اس پل پر سے گذرنے کی جرات نہیں کرے گا۔ بلکہ اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہو کر گذرنے سے صاف انکار کر دے گا۔ غور فرمائیے یہ اندیشہ ہائے دور دراز کس چیز نے جنم دیئے ہیں۔ یقیناً اسی قوت نے جسے ہم وہم سے تعبیر کرتے ہیں۔ اب ذرا غور فرمائیے کہ جس عقل کو جذبات اپنا اسیر بنالیں اور وہم اسے شکست دے دے وہ زندگی کے معاملات حل کرنے میں کہاں تک مؤثر ہو سکتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ عقل کے میزان ہونے اور مؤثر راہنما ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب اس کے دائرۂ کار سے باہر اس کو استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اسے ایک مکمل راہنما سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کی کمزوری کا عالم بھی آپ نے دیکھا کہ وہ اپنے آپ کو جذبات اور وہم کی زنجیروں سے آزاد کرنے سے بھی عاجز ہے۔ یہاں تک تو معاملہ پھر بھی عقل کے موثر نہ ہونے کا ہے لیکن اس وقت تو معاملہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے جب عقل نہ صرف یہ کہ مؤثر نہیں رہتی بلکہ بعض دفعہ اپنی راہنمائی میں وہ غلط نتائج پیدا کرتی ہے جس کے نتیجے میں اخلاقی زندگی تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ موقع وہ ہے جب

عقل کو خواہشات کا غلام بنا دیا جاتا ہے انسان عجیب واقع ہوا ہے کہ وہ اصلاً ان خواہشات کی پیروی کرنا چاہتا ہے لیکن اسے بروئے کار لاتے ہوئے نام عقل کا رکھتا ہے۔ حالانکہ اگر دیانت داری سے غور کیا جائے تو وہاں عمل دخل عقل کا نہیں بلکہ سراسر خواہشات کا ہوتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن کریم نے ایک جگہ ارشاد فرمائی:

> "وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ
> کہ اگر حق ہوائے نفس کی پیروی کرنے لگے تو زمین و آسمان اور اس میں جو کچھ ہے وہ تباہ ہو جائے۔

اور یہ کوئی مفروضہ نہیں بلکہ امر واقعہ ہے کہ فلسفۂ قانون میں فلاسفہ کا ایک گروہ پایا جاتا ہے جن کا نمایاں نمائندہ مشہور ماہر قانون ڈاکٹر فرائیڈ مین ہے۔ انہوں نے اپنے نظریہ کی وضاحت کے لیے "لیگل تھیوری" کے نام سے ایک کتاب لکھی اس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "عقل صرف انسانی جذبات و خواہشات کی غلام ہے اور اس کو انہی کا غلام ہونا بھی چاہیے۔ عقل کا اس کے سوا کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ان جذبات کی بندگی اور ان کی اطاعت کرے۔"

پھر اس نظریے سے جو نتیجہ نکلنا چاہیے وہ ڈاکٹر فرائیڈ مین کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

> "کہ اس کے سوا ہر چیز یہاں تک کہ اچھے برے کے تصورات اور یہ الفاظ کہ فلاں کام ہونا چاہیے اور فلاں کام ہونے کے لائق ہے کلی طور پر جذباتی باتیں ہیں اور دنیا میں اخلاق نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔"

ممکن ہے کہ آپ اسے محض ایک فلسفی کی بڑ سمجھیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں عقل کی برتری کا دعویٰ کیا جاتا ہے بلکہ عقل کی غلامی کی جارہی ہے وہاں عملی زندگی میں یہی فلسفہ ہمیں حاکم دکھائی دیتا ہے جس کے

نتیجے میں اخلاق کی ہر قدر رفتہ رفتہ شکست و ریخت کا شکار ہے۔ رحم اتنی بڑی اخلاقی قدر ہے کہ شائد کوئی اس کا انکار نہ کرسکے۔ ہیرو شیما اور ناگا ساکی پر گرائے جانے والے بموں سے انسانیت پر جو ظلم ہوا انسانیت کی پیشانی آج بھی اس سے عرق آلود ہے۔ لیکن اندازہ فرمائیے کہ جب اس واقعہ کو خالصتاً عقل کی نگاہ سے دیکھا گیا تو اسے ظلم کی بجائے رحم بنا دیا گیا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جیسی علمی اور عالمی کتاب میں ان تباہ کاریوں کا ذکر بعد میں کیا گیا جو ایٹم بم کی بدولت ہیرو شیما اور ناگاساکی میں برپا ہوئیں لیکن ایٹم بم کے تعارف میں یہ جملہ سب سے پہلے لکھا گیا ہے:

> "یعنی سابق وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ ایٹم بم نے جنگ کو مختصر کر کے دس لاکھ امریکی سپاہیوں اور اڑھائی لاکھ برطانوی سپاہیوں کی جانیں بچائیں۔"

اندازہ فرمائیے کہ اس قسم کی منطق میں کون سے ظلم و ستم اور کون سی سفاکی ایسی ہے جسے عقل کے خلاف کہا جاسکے۔ اسی طرح شرم و حیاء انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے لیکن خالص عقل کے پیروکاروں نے جس طرح اس کی مٹی پلید کی ہے اور اس بنیادی قدر کو جس طرح انسانی زندگی سے خارج کر دیا ہے اس کو سمجھنے کے لیے میں شرم و حیاء سے معذرت کے ساتھ آٹھ سو سالہ پرانی ایک مثال پیش کر رہا ہوں۔

"تاریخ اسلام میں ایک فرقہ "باطنیہ" کے نام سے گذرا ہے۔ اس کا ایک مشہور لیڈر عبید اللہ القیروانی اپنے ایک مکتوب میں لکھتا ہے:

> "وما العجب من شیئی کالعجب من رجل یدعی العقل ثم یکون له اخت او بنت حسناء، و لیست له زوجة فی حسنها فیحرمها علی نفسه و ینکحها من اجنبی ولو عقل الجاهل لعلم انه احق باخته و بنته من الاجنبی، وما وجه ذلک الا ان صاحبهم حرم علیهما الطیبات (الفرق بین الفرق لعبدالقاهر البغدادی

> یعنی اس سے زیادہ تعجب کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شخص عقل کا دعویدار ہونے کے باوجود ایسی حماقتیں کرتا ہے کہ اس کے پاس نہایت خوبصورت بہن یا بیٹی موجود ہوتی ہے اور خود اس کی بیوی اتنی حسین نہیں ہوتی مگر وہ اس خوبصورت بہن یا بیٹی کو اپنے اوپر حرام قرار دے کر اسے کسی اجنبی سے بیاہ دیتا ہے۔ حالانکہ ان جاہلوں کو اگر عقل ہوتی تو وہ یہ سمجھتے کہ ایک اجنبی شخص کے مقابلے میں اپنی بہن اور بیٹی کے وہ خود زیادہ حقدار ہیں۔ اس بے عقلی کی وجہ دراصل صرف یہ ہے کہ ان کے آقا نے ان پر عمدہ چیزوں کو حرام کر دیا ہے۔"

آپ ممکن ہے کہ اسے آٹھ سو سالہ پرانی غیر ترقی یافتہ حالت کی عکاس سمجھ کر نظرانداز کر دیں لیکن امرواقعہ یہ ہے کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں جس طرح عقل خالص کی پیروی میں اضافہ ہوا ہے اسی طرح اس کے نتیجے میں اخلاقی اقدار کی پامالی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ آج کے دور میں بہن سے نکاح باقاعدہ ایک نعرہ بن چکا ہے اور امریکہ کی بعض ریاستوں میں باقاعدہ اس کے حق میں جلوس نکالے گئے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے اس بداخلاقی کو روکنے کے لیے میڈیکل سائنس کے حوالے سے یہ دلیل دی جاتی رہی ہے کہ استلذاذ بالاقارب سے طبی نقصانات ہوتے ہیں لیکن آج مغربی دنیا میں اس موضوع پر کتابیں آ رہی ہیں انہوں نے نہ صرف طبی نقصانات کی اس توجیہ کو غلط ثابت کر دیا ہے بلکہ استلزاز بالاقارب کو انہوں نے انسان کی فطری خواہش یعنی ہیومین ارج قرار دے کر انسان کا بنیادی حق تسلیم کرانے کی کوشش کی ہے اور اس پر باقاعدہ کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ اور اسی رویہ کا نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ کی پارلیمنٹ ہم جنس پرستی کے جواز کا بل تالیوں کی گونج میں منظور کر چکی ہے اور یہ اخلاقی اعتبار سے انتہائی قابل نفرت خصلت جس کی وجہ سے قوم لوط پر اللہ کا

عذاب نازل ہو چکا ہے۔ نہ صرف کوئی برائی نہیں رہی بلکہ اسے باقاعدہ ایک علم بنا دیا گیا ہے۔ آپ امریکہ کی لائبریروں میں جائیں تو وہاں آپ کو اس برائی کے حق میں لکھی ہوئی کتابوں پر مشتمل علیحدہ سیکشن ملے گا۔ جس کا یہ عنوان ہوگا۔ ”گے اسٹائل آف لائف“

کچھ عرصہ پہلے امریکی رسالے ٹائم نے لکھا کہ خلیج کی جنگ میں حصہ لینے والے فوجیوں میں سے تقریباً ایک ہزار افراد کو صرف اس لیے فوج سے نکال دیا گیا کہ وہ ہم جنس پرست تھے۔ لیکن اس اقدام کے خلاف امریکہ میں شور مچ رہا ہے۔ مظاہرے ہو رہے ہیں اور چاروں طرف سے آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ آپ نے جن لوگوں کو ہم جنس پرست ہونے کی وجہ سے فوج کے عہدوں سے برخاست کیا ہے یہ آپ نے ایک خلاف عقل حرکت کی ہے۔ اس لئے ان کو دوبارہ بحال ہونا چاہیے اور اس کے حق میں دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ یہ ایک ہیومین ارج ہے اور ہیومین ارج کو دبایا نہیں جاسکتا اور یہ سب کچھ عقل کی بنیاد پر ہو رہا ہے اور اب تو یہ معاملہ یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ بات صرف جنس انسانی کی نہیں رہی بلکہ اب تو جانوروں، کتوں، گدھوں اور گھوڑوں تک نوبت پہنچ گئی ہے اور اس کو بھی باقاعدہ فخریہ بیان کیا جارہا ہے۔

اس تمام بحث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسان اور حیوان کی زندگی کے تحفظ اور اس کو معیشت کی راہ پر لگانے کے لیے سب سے پہلے فطری راہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ ایک خاص حد تک اپنا کام کرتی ہے۔ اس کے بعد باہر کی زندگی کی راہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے حواس خمسہ کی راہنمائی مہیا فرمائی۔ حواس خمسہ نے محسوسات کے دائرے میں رہ کر انسانی زندگی کو آگے بڑھایا۔ پھر جب انسان کے قدم محسوسات سے آگے بڑھے تو اسے عقل کی راہنمائی عطا فرمائی گئی۔ اب ہم نے تفصیل سے دیکھا کہ عقل انسان کی راہنمائی کے لیے بہت موثر راہنما ہونے کے باوجود اعمال کی درستگی اور انضباط کے لیے کافی نہیں۔ وہ قدم قدم پر جذبات کی اسیر ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ قوت واہمہ سے شکست کھا جاتی ہے اور اگر یہ جذبات ہوائے نفس کی لپیٹ میں

آجائیں تو پھر عقل نہ صرف اس کے سامنے بے دست و پا ہو جاتی ہے بلکہ عموماً وہ ہوائے نفس کی وکالت کرنے لگتی ہے۔ جس کے نتیجے میں اخلاقی قدریں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ عقلی مسلمات شکست و ریخت کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ اب جس پروردگار نے قدم قدم پر حیوان اور انسان کی راہنمائی فرمائی کیا یہ ممکن ہے کہ وہ انسان کو غلطان و پیچان چھوڑ دے کہ وہ ہوائے نفس کا شکار ہو کر اپنی زندگی اور آخرت کو تباہ کر لے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس پروردگار کی رحمت سے یہ بات یقیناً بعید ہے کہ وہ عقل کے بعد انسان کو کسی اور راہنمائی سے محروم فرما دے۔ بلکہ قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جس طرح وجدان کے بعد حواس کی راہنمائی پروردگار نے عطا فرمائی اور حواس کے بعد عقل کی، اسی طرح اس نے اپنے ذمہ یہ بات لے رکھی ہے کہ عقل کے بعد زندگی کو راہنما سے محروم نہیں رکھے گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے جابجا ان مراتب ہدایت کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

> "اِنَّا خَلَقْنَا الانسَانَ مِن نُطْفَةٍ اَمشَاجٍ نَّبتَلِيهِ فَجَعَلنَاهُ
> سَمِيعًا بَصِيرًا اِنَّا هَدَينٰهُ السَّبِيلَ اِمَّا شَاكِرًا وَ اِمَّا
> كَفُورًا اَلَم نَجعَل لَّهٗ عَينَينِ وَلِسَانًا و شَفَتَينِ و
> هَدينٰهُ النَّجدَينِ وجَعَلَ لَكُمُ السَّمعَ والاَبصَارَ
> والاَفئِدَةَ قَلِيلاً مَّا تَشكُرُونَ"

ترجمہ:

> ہم نے انسانوں کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا جسے ایک کے بعد ایک، مختلف حالتوں میں پلٹتے ہیں۔ پھر اسے ایسا بنا دیا کہ سننے والا دیکھنے والا وجود ہو گیا۔ ہم نے اس پر راہ عقل کھول دی۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ یا تو شکر کرنے والا ہو یا ناشکرا۔ یعنی یا تو خدا کی دی ہوئی قوتیں ٹھیک کام میں لائے اور فلاح و سعادت کی راہ اختیار کرے یا ان سے کام نہ لے اور گمراہ ہو جائے۔

> کیا ہم نے اسے ایک چھوڑ دو دو آنکھیں نہیں دے دی ہیں (جن سے وہ دیکھتا ہے) اور زبان اور ہونٹ نہیں دیئے ہیں (جو گویائی کا ذریعہ ہیں) اور کیا اس کو ہم نے (سعادت و شقاوت کی، دونوں راہیں نہیں دیکھا دیں؟ اور اللہ نے تمہارے لیے سننے اور دیکھنے کے حواس پیدا کر دیئے اور سوچنے کے لیے دل (یعنی عقل) تاکہ تم شکر گذار رہو (یعنی خدا کی دی ہوئی قوتیں ٹھیک طریقہ پر کام میں لاؤ۔)

ان آیات اور ان کے ہم معنی آیات میں حواس اور مشاعر اور عقل و فکر کی ہدایت کی طرف اشارے کیئے گئے ہیں، لیکن وہ تمام مقامات جہاں انسان کی روحانی سعادت و شقاوت کا ذکر کیا گیا ہے وحی و نبوت کی ہدایت سے متعلق ہیں۔ مثلاً:

> ”اِنَّ عَلَینَا لَلھُدٰی وَاِنَّ لَنَا لَلاٰخِرَۃَ والاُولٰی وَاَمَّا ثَمُودُ فَھَدَینٰھُم فَاستَحَبُّوا العَمٰی علَی الھُدٰی وَالَّذِینَ جَاھَدُوا فِینَا لَنَھدِیَنَّھُم سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ المُحسِنِین
>
> بلاشبہ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم راہنمائی کریں اور یقیناً آخرت اور دنیا دونوں ہمارے ہی لیے ہیں۔ اور باقی رہی قوم ثمود، تو اسے بھی ہم نے راہ حق دکھلا دی تھی لیکن اس نے ہدایت کی راہ چھوڑ کر اندھے پن کا شیوہ اختیار کیا اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جانفشانی کی تو ضروری ہے کہ ہم ان پر اپنی راہیں کھول دیں اور بلاشبہ اللہ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو نیک عمل ہیں۔

انسانی زندگی کی ضرورتیں جہاں کھانا پینا، اوڑھنا پہننا، لوگوں سے میل جول رکھنا، عناصر قدرت اور عناصر فطرت سے مستفید ہونا ہیں وہاں اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ یہ جانے کہ باہمی میل جول کے آداب کیا ہیں،

خود میری زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ میری زندگی کے کیا فرائض اور کیا حقوق ہیں؟ شائستگی اور دل بستگی کیا ہے؟ ان کے آداب کیا ہیں؟ دوسروں کے مجھ پر حقوق کیا ہیں؟ ہمسائیگی کیا ہے؟ اخوت اور محبت کسے کہتے ہیں؟ ماں باپ کا احترام کیا ہے؟ علم کس چیز کا نام ہے اور اس کی حدود کیا ہیں؟ عورت اور مرد کا رشتہ کیا ہے اور اس کی نزاکتیں کیا ہیں؟ محرم کسے کہتے ہیں اور نامحرم کون ہے؟ عبادات کی حقیقت کیا ہے؟ یہ دنیا ہمیشہ رہے گی یا ایک دن ختم ہو جائے گی؟ اس کا انجام فنا ہے یا بقا؟ کیا کوئی دوسری دنیا بھی ہے؟ تو اس کی حقیقت کیا ہے؟ کیا میں مرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاؤں گا؟ یہ عالم برزخ کیا ہے؟ اور عالم آخرت کیا ہے؟ اللہ کی صفات کیسی ہیں؟ وہ اگر ہمارا مالک ہے تو وہ کن باتوں میں راضی ہے اور کن باتوں سے ناراض ہوتا ہے؟ قربانیوں کی حقیقت کیا ہے؟ آدمی ایک دوسرے کے لیے ایثار کرتا ہے تو اس کا صلہ کیا ہوگا؟ اخلاقی مسلمات کیا ہیں اور ان کی حقیقت کیا ہے؟ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کیا ہیں؟ روح کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کن کاموں سے زندہ ہوتی ہے اور کن کاموں سے مرجاتی ہے؟ اس طرح کے بے شمار سوالات ہیں جن کا جواب انسان کو ملنا چاہیے۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ ان کا جواب نہ حواس کے پاس ہے اور نہ عقل کے پاس۔ اب اگر ہمیں اپنے محسوسات کی دنیا میں جواب دینے کے لیے حواس اور عقل کی راہنمائی دی گئی ہے تو کیا عالم ناسوت اور عالم ملکوت کی حقیقتوں کے لیے اور اپنی دنیا میں سرفرازی اور آخرت میں سرخروئی کے لیے اور اس آنکھ کے پردے کے پیچھے کے حقائق کو جاننے کے لیے کیا ہمیں کوئی راہنمائی نہیں دی جائے گی؟ اور ہم بے خبری میں غلط ملط فیصلے کرتے رہیں گے۔

یقیناً وہ ذات جس نے چیونٹی تک کی ضرورتیں پوری کی ہیں وہ انسان کو اس سے بے خبر نہیں رکھ سکتی۔ چنانچہ اس نے حواس اور عقل کے ذریعے کے بعد ہمیں ایک اور ذریعہ علم بھی بخشا جس کا نام وحی اور رسالت ہے اور اس وحی کے حاملین کو 'پیغمبر' نبی یا رسول کہتے ہیں۔ اس ذریعہ سے انسانوں کو

وہ سب کچھ بتایا گیا جو اس کی دنیوی' اخروی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ضرورت تھی بلکہ اس ذریعہ علم کے ذریعے انسانوں کی دنیا بھی اور آخرت بھی تباہ ہونے سے بچالی گئی۔ تاریخی حقائق ہمارے سامنے ہیں کتنی قومیں اس صفحہ ہستی پر قوت کا نشان بن کر اٹھیں لیکن اپنی اخلاقی بے راہ روی اور غلط فیصلوں کے نتیجے میں اللہ کے عذاب کا نشانہ بنیں۔ آسمانی کتابوں نے جابجا اس تاریخ کو بیان کیا ہے تاکہ انسان اس بات کو سمجھے کہ انسانی بقاء کا دارومدار اس کی اخلاقی زندگی اور توانائی پر ہے۔ کیونکہ اخلاقی زندگی میں گراوٹ انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی۔ بلکہ انسانیت سے تہی دامن کر دیتی ہے وہ شرم و حیاء سے عاری ہو کر کتوں' بلیوں کی سطح پر آجاتا ہے رحم اور مروت سے بے بہرہ ہو کر درندوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ حرام و حلال سے بے گانہ ہو کر حشرات الارض کی جگہ نشے کی حالت میں گلی کوچوں میں پڑا دکھائی دیتا ہے۔ آخرت کی محبت سے محروم ہو کر اور حبِّ دنیا کا اسیر بن کر بندۂ درہم و دینار بن جاتا ہے۔ اس ناگفتہ بہ صورت حال سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم اس ذریعۂ علم کو پہچانیں جسے وحی الٰہی کہا جاتا ہے اور ان کے حاملین کا راستہ اختیار کریں جنہیں پیغمبر اور رسول کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج دنیا میں بہت کچھ بدل گیا ہے اور بگڑ گیا ہے مگر پھر بھی آپ کو جہاں تہاں بھی کوئی روشنی دکھائی دیتی ہے اور انسانیت کی نمود ملتی ہے وہ سراسر ان انبیاء کا ورثہ ہے کیونکہ اگر یہ نہ ہوتے تو ہم اس راہنمائی سے یکسر محروم رہ جاتے۔

# انبیاء کرام بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چند خصوصیات اور ختمِ نبوت

برادران عزیز! رسالت کا مفہوم ناتمام رہے گا اگر یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ انبیاء کرام ایک طرف تو اپنے اللہ سے ایک ایسا تعلق رکھتے ہیں جو تعلق دوسرے انسانوں کا نہیں ہوتا اور دوسری طرف وہ انسانی ہدایت کے منصبِ جلیلہ پر فائز ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی حیثیت دوگونہ ہے۔ کہ ایک طرف تو ان کا تعلق خدائے بزرگ و برتر سے ہے اور دوسری طرف انسانوں سے۔ اللہ سے اپنے تعلق کی وجہ سے وہ اپنے اندر وہ قوتیں اور خصوصی امتیازات رکھتے ہیں جو دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتے کیونکہ کوئی انسان بھی یہ طاقت نہیں رکھتا کہ وہ اپنے مالک اور پروردگار سے براہ راست استفادۂ علم کرسکے۔ قرآن کہتا ہے:

> ”وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَن يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْياً اَوْمِن وَّرَاءِ حِجَابٍ اَوْيُرْسِلَ رَسُولاً“
>
> کہ کسی انسان کی یہ مجال نہیں ہے کہ وہ اپنے اللہ سے ہم کلام ہوسکے سوائے وحی کے ذریعے سے یا حجاب کے پیچھے سے یا فرشتے کے واسطے سے۔

تو چونکہ ہر پیغمبر کو کبھی براہ راست اور کبھی فرشتے کے واسطے سے اللہ کا پیغام وصول کرنا پڑتا ہے اس لیے اس میں عام انسانوں سے زیادہ قوتِ برداشت اور تحمل کی طاقت رکھی جاتی ہے۔ اس کے دل کی وسعتیں سمندروں سے زیادہ ہوتی ہیں تاکہ وہ اللہ کے پیغام کو بلاکم و کاست وصول کرسکے۔ چنانچہ

حدیث میں آنحضرت کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ آپ کی اپنی تمام تر غیر معمولی قوتوں کے باوجود وحی کے نزول کے وقت یہ حالت ہوتی تھی کہ سخت سردیوں میں آپ پسینے سے شرابور ہو جاتے تھے اور سخت گرمیوں میں آپ کے دانت بجنے لگتے تھے اور آپ کے روئے مبارک کا رنگ کھجور کے خشک پتے کی طرح پیلا ہو جاتا تھا۔ اگر آپ کسی سواری پر سوار ہوتے تو وہ بمشکل تمام وحی کا بوجھ برداشت کر پاتی بلکہ بعض دفعہ تو بلبلانے لگتی۔ حضور ﷺ خود فرماتے ہیں کہ جب مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میری روح کھنچی جارہی ہو۔ اسی وجہ سے آپ کو غیر معمولی صلاحیتیں عطا فرمائی گئیں۔ مثلاً" ہم ایک دو روز سے زیادہ بھوک برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ جبکہ آنحضرت ﷺ تین تین دن کے صوم وصال رکھتے تھے اور فرماتے تھے تم میں سے میرے جیسا کون ہے۔ مجھے تو میرا رب کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی۔ ہم صرف سامنے دیکھ سکتے ہیں جبکہ حضور ﷺ پیچھے دیکھنے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور تھے۔ ایک تو پیغمبر کا یہ خصوصی وصف ہے جیسے کہ کہا گیا کہ وہ خصوصی اوصاف لے کر اور غیر معمولی قوتیں لے کر آتا ہے۔ اور دوسری طرف چونکہ وہ انسانی ہدایت کے لیے مبعوث ہوتا ہے اس لیے اسے انسان بنایا جاتا ہے کیونکہ ہر جنس اپنے ہم جنس سے ہی کسب فیض کر سکتی ہے اس لیے انسانوں کی ہدایت کے لیے انسان ہی کی ضرورت تھی۔ اگر کوئی ایسا پیغمبر آتا جو انسان نہ ہوتا تو وہ انسانی مسائل میں انسانون کو کیا راہنمائی دیتا۔ اسے کبھی بھوک نہ لگتی اس لئے وہ نہ جانتا کہ بھوک کی شدت کیا ہوتی ہے۔ وہ کبھی بیمار نہ ہوتا اسلئے بیماری کی کلفتو سے کبھی آگاہ نہ ہوتا تو بیماروں کیلئے سراپا شفا کیسے بن جاتا اور بھوکوں کیلئے باعث راحت کیسے ہوتا؟ کبھی اسے زخم نہ لگ سکتا تو وہ زخمیون کیلئے مرہم کیوں رکھتا۔ اسے کبھی غم کی کیفیت لاحق نہ ہوتی تو وہ دنیا کے غم و آلام دور کرنے کیلئے کبھی بے قرار نہ ہوتا۔ وہ یتیم ہو کر بھی چونکہ انسانی احساس سے عاری ہوتا اسلئے وہ کبھی یتیموں کے سر پر ساۂ رحمت نہ بنتا۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے ہر پیغمبر کو انسان اور بشر پیدا کیا۔ لیکن یہ خیال رہے کہ وہ صرف

بشر نہیں ہوتا بلکہ خیر البشر ہوتا ہے۔ جس طرح ایک ہیرہ اپنی ذات مین ایک پتھر ہی ہوتا ہے لیکن اپنی چمک دمک اور قیمت اور رعنائی مین پتھر سے اسے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ ایسے ہی ہر پیغمبر بشر تو ہوتا ہے لیکن بشری کمزوریوں سے پاک ہوتا ہے۔ اس کے سر پر عصمت اور معصومیت کا تاج سجایا جاتا ہے۔ کبھی اس سے خلافِ شریعت امور کا صدور نہیں ہوتا اور کبھی اس سے گناہ سرزد نہیں ہوتا کیونکہ اگر اس سے گناہ سرزد ہونے لگے تو وہ پوری نوع انسانی کے لیے آئیڈیل کیسے بنے اور اسے اسوۂ حسنہ سے کیسے تعبیر کیا جاسکے۔ انسان کی سرشت میں بھول چوک اور خطا لکھی گئی ہے لیکن پیغمبر کو اس سے معصوم بنایا گیا ہے تاکہ ساری نوع انسانی کی ہر طرح کی خطاؤں اور غلطیوں میں وہ مینارۂ نور ثابت ہو۔ ممکن ہے کہ آپ کو یہ خیال گذرے کہ جب ہر انسان غلطی کرتا ہے تو پیغمبر انسان ہونے کی وجہ سے غلطیوں سے کیسے مبرا رہ سکتا ہے۔ لیکن یہ محض خیال ہے اگر آپ خود اپنے جسم پر غور فرمائیں تو آپ دیکھیں گے کہ جن عناصر سے تمام جسم وجود میں آیا ہے انہی سے آنکھ بھی پیدا کی گئی ہے۔ لیکن آنکھ کی صفات میں اور باقی جسم کی صفات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جسم کا ہر جوڑ ہر طرح کی آلودگی اور ہر طرح کے بوجھ کو برداشت کرسکتا ہے لیکن آنکھ میں اگر غبار بھی اڑ کر پڑ جائے تو فورا" آنسو آکر اسے دھوڈالتا ہے کیونکہ آنکھ اس کا تحمل نہیں کرسکتی اور یہ صفت آنکھ میں کیوں رکھی گئی اس لیے کہ آنکھ دیکھتی ہے اور راہنمائی دیتی ہے اور جسم اس کے پیچھے چلتا ہے۔ پیغمبر چونکہ انسانی دنیا میں دیدۂ بینا کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے اگر یہ آنکھ دھندلا جاتی اور غلطی کرنے لگتی تو ساری نوعِ انسانی ضلالت و گمراہی کا شکار ہو جاتی۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا کیا ٹھکانہ ہے کہ اس نے اپنے رسولوں کو ایک طرف تو انسان بنایا تاکہ وہ انسانی کمزوریوں سے پوری طرح آگاہ ہو کر انسانوں کو بہتر سے بہتر راہنمائی مہیا کریں اور ساتھ ہی ان کے دلوں میں انسانیت کے لیے وہ بے پناہ سوز و گداز اور محبت اور شفقت رکھی کہ جس کا تصور بھی دوسرے انسانوں میں مشکل ہے۔ خصوصا" آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی

شفقت و رحمت کا ایک ایسا پیکر ہے کہ جس کی نظیر دوسرے انسانوں میں تو کیا ملے گی خود اولوالعزم رسولوں میں تلاش کرنا بھی مشکل ہے۔ احادیث مبارکہ میں ہمیں اس کی تفصیلات ملتی ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ راتیں آرام کے لیے بنی ہیں لیکن آنحضرت ﷺ بعض دفعہ رات کا بیشتر حصہ اپنی امت کی بھلائی کے لیے' ان کو ایمان سے بہرہ ور کرنے اور آخرت میں ان کی سرخروئی کے لیے دعاؤں میں صرف فرما دیتے اور پھر یہ دعائیں ایسی بے کلی اور سوز و گداز سے مانگی جاتیں کہ آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا برستی اور داڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ حتی کہ آنحضرت ﷺ کو جب معراج شریف جیسے عظیم سفر پر بلایا گیا اور آپ لامکان میں داخل ہو کر جب حریم قدس میں ذات خداوندی کے سامنے پیش ہوئے تو وہاں بھی آپ کو اپنی امت نہیں بھولی اور آپ نے وہاں اپنی امت کے لیے وہ کچھ مانگا جس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ حتی کہ زندگی کے ہولناک لمحات میں جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زخموں کی بے پناہ تکلیف میں مبتلا تھے اور اہل طائف کے پتھروں ڈ نے آپ کا انگ انگ زخمی کر ڈالا تھا۔ اس وقت بھی فرشتہ جب حاضر ہو کر اللہ کا حکم پہنچاتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو میں طائف کے دونوں طرف کے پہاڑوں کو آپس میں ملا دوں تاکہ یہ ظالم اس میں پس کر رہ جائیں۔ تو آپ نے کس قدر شفقت اور محبت اور دلسوزی سے فرمایا تھا کہ نہیں' میں ان کی تباہی نہیں دیکھ سکتا۔ میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہی میں سے اہل ایمان کو اٹھائے گا۔ اور ان کی اولادوں کو ایمان کی توفیق دے گا اب ظاہر ہے کہ جس قلب مبارک میں شفقت' رحمت' محبت اور رقت کا ہر وقت دریا موجزن رہے وہ اپنی امت کی ہدایت کے لیے کیا کچھ نہیں کر گذرے گا۔ اور دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس سراپا رحمت اور شفقت ذات -کو ہر طرح کی لغزش سے اور غلطی سے اس طرح محفوظ کر دیا گیا کہ خلاف شریعت امور کے صادر ہونے کا تو سوال ہی کیا؟ البتہ اجتہادی امور میں بھی اگر کہیں کوئی لغزش ہو گئی تو وحی الٰہی نے اس کی بھی اصلاح فرما دی تاکہ آنے والی دنیا جب کسی ایسے راہنما کو تلاش کرے جس سے وہ ہدایت

حاصل کرنا چاہتی ہو تو اسے پورا اطمینان ہو کہ کم از کم محمد رسول ﷺ کی ذات گرامی میں ایک ایسا راہنما موجود ہے کہ جس کی راہنمائی کو قبول کرنے کے بعد نوع انسانی ہر طرح کے اندیشے سے محفوظ ہو جائے گی۔ آج جبکہ انسان اپنے انفرادی اور اجتماعی معاملات میں قدم قدم پر ٹھوکروں کا شکار ہے وہ آئے روز راہنما بدلتا ہے کیونکہ راہنماؤں کی صورت میں اسے ڈاکوؤں سے واسطہ پڑتا ہے یہ انہیں اپنا ہمدرد و غمگسار سمجھتا ہے لیکن بالاخر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمدردی کے پردے میں اس کا نقد دل لوٹ چکے ہیں اور اگر کوئی ہمدردی سے راہنمائی دیتا بھی ہے تو اپنے علم و بصیرت کی کم مائیگی اور کوتاہی فکر کی وجہ سے قدم قدم پر خود بھی ٹھوکریں کھا کر گرتا ہے۔ اور پیچھے چلنے والوں کو بھی تباہی کا شکار کر دیتا ہے۔ اسی صورت حال میں انسانیت کے لیے اللہ کا آخری رسول کس قدر عظیم نعمت ہے کہ ایک طرف وہ شفقت اور محبت کا پیکر ہے جس سے کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہو سکتا اور دوسری طرف وہ غلطیوں سے مبرا ہے جس کی وجہ سے اس کے پیچھے چلنے والے اپنی منزل مقصود سے کبھی نہیں بھٹک سکتے۔ اس لیے ان دو حیثیتوں سے بہرہ ور فرما کر اولا" تو تمام پیغمبروں کو لیکن اب صرف آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی کو نوع انسانی کے لیے آخری نجات دھندہ بنا کر اس کی اطاعت کا غیر مشروط حکم دیا گیا بلکہ اس کی اطاعت کو پرودگار نے اپنی اطاعت ٹھہرایا اور تمام نوع انسانی کو دعوت دی کہ اگر دنیا و آخرت میں سرخرو ہونا چاہتے ہو تو صرف یہی ایک راستہ ہے جس کی سرے پر اللہ کا وہ آخری پیغمبر کھڑا تمہیں پکار رہا ہے۔ تم اس کی پکار سنو اور اس کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو محفوظ بنا کر اس کے بنائے ہوئے جادۂ عمل کو اختیار کرکے دنیا اور آخرت کی سرخروئی کا سامان کرلو اور پھر مزید کرم یہ فرمایا کہ اس ذات عظیم کو صرف منصب رسالت پر ہی فائز نہیں کیا بلکہ اس کے سر پر ختم رسالت کا تاج رکھا تاکہ نوع انسانی اب مزید گروہی وابستگیوں اور ہمہ نوعی سرگشتگیوں سے محفوظ رکھی جاسکے کیونکہ جب تک مختلف انتسابات باقی رہیں گے اور ہر انتساب اپنے برحق ہونے کا دعویٰ دار رہے گا اس وقت تک

انسانوں کو مختلف گروہوں، مختلف جتھوں، مختلف تہذیبوں، اور مختلف مذہبوں میں تقسیم ہونے سے نہیں بچایا جاسکتا۔ اب چونکہ انسانیت اپنے شباب پر ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کے سامنے ایک مذہب، ایک تہذیب، ایک قانون موجود ہو تاکہ اس کو قبول کرنے کے بعد وہ ایک پلیٹ فارم پر اکٹھی ہوسکے۔ اور اس کے لیے ایک ایسا راہنما ہونا چاہیے جو تمام پہلے پیغمبروں کی تصدیق کے ساتھ ساتھ قیامت تک کے لیے ایک لائحہ عمل اور ایک اسوۂ حسنہ دے تاکہ اس دنیا کی ایک امت خالدہ کی شکل میں شیرازہ بندی ہوسکے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کو خاتم النبین بناکر اہل دنیا پر یہ احسان کیا گیا کہ لوگو یہ نبی آخری نبی ہے اس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس کی شریعت آخری شریعت ہے۔ اس پر نازل ہونے والی کتاب آخری کتاب ہے۔ اور اس پر ایمان لانے والے آخری امت ہوں گے۔ اب نسل، نسب، خون، جغرافیہ، یہ تمام رشتے ختم ہو جائیں گے صرف ایک رشتہ اس ایمان کا باقی رہے گا جس کی وجہ سے انسانوں میں وہ عالمگیریت پیدا ہوگی اور تمام انسان ایک دوسرے کے قریب ہو کر بھائی بھائی بن سکیں گے۔ چنانچہ جس طرح رسالت کو ماننا لازم ٹھہرایا گیا اسی طرح ختم رسالت کو بھی ماننا لازم کیا گیا۔ یہ ہماری انتہائی بد نصیبی ہے کہ وہ امت جس پر ختم رسالت کا احسان کیا گیا تھا خود اس امت میں مختلف مواقع پر ختم رسالت کے خلاف فتنے اٹھے اور بعض پاجی قسم کے لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اس طرح اس امت کے شیرازہ کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی گئی اور یہ سوال اٹھایا گیا کہ نبوت تو ایک رحمت ہے اس کو بند کیسے کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ کہنے والے اس کا ادراک نہ کرسکے کہ انسانیت کے بلوغ کے بعد وحدتِ انسانیت کی غیر معمولی طلب نے اب نبوت کو نہیں بلکہ ختم نبوت کو سب سے بڑھ کر رحمت بنا دیا ہے کیونکہ نبوت اس وقت رحمت ہوتی ہے جب اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ بلا ضرورت نبوت رحمت نہیں ہوتی بلکہ وہ لوگوں کے لیے امتحان بن جاتی ہے کیونکہ ہر نبی کے آنے کے بعد اگر وہ نبی سچا ہو تو لوگوں کی نجات کا دارومدار اس پر ایمان لانے پر ہوتا ہے اور اگر وہ نبی جھوٹا ہو تو پھر ان کی نجات کا

دارومدار اس کے انکار پر ہوتا ہے۔ اس طرح نبی کے آنے کے بعد اس دور کے لوگ ایک امتحان میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر تو اس وقت نبی کی ضرورت ہے تو اس امتحان کا کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر ضرورت نہیں تو پھر بلا وجہ ایسا امتحان جس پر دنیا اور آخرت میں نجات کا دارومدار ٹھہرے ایک بہت بڑا ظلم ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ ضرورت کیا ہے جس کے بعد نبی کا آنا ضروری ہو جاتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ ضرورتیں چار ہیں۔

1- اس قوم کی طرف نبی آتا ہے جس قوم کی طرف اب تک ہدایت نہ آئی ہو اور کوئی اس کی طرف نبی معبوث نہ ہوا ہو۔

2- بعض دفعہ ایک نبی کی موجودگی میں دوسرا نبی اس کی معاونت کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ جیسے حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معاونت کے لیے نبی بنائے گئے۔

3- اس وقت نبی آتا ہے جب پہلا نبی نامکمل شریعت لے کر مبعوث ہوا ہو یا اس کی بعثت کسی محدود علاقے میں ہو۔ اس صورت میں تکمیل دین کے لیے یا باقی لوگوں کی ہدایت کے لیے کسی اور نبی کا آنا قرین عقل بھی ہے اور قرین انصاف بھی۔

4- کسی قوم کی طرف اس سے پہلے نبی آیا ہو مگر اس کی لائی ہوئی ہدایت محفوظ نہ رہی ہو اور اس پر اترنے والی کتاب ترمیم و تحریف کا شکار ہوگئی ہو۔ اب ان کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے وہ اصل ہدایت کو جان سکیں۔

یہ چار ضرورتیں ہیں جن کی بنا پر بالعموم کوئی پیغمبر تشریف لاتا ہے۔

اس سوال یہ ہے کہ کیا اب ان چاروں ضرورتوں میں سے کوئی ضرورت پیدا ہوگئی ہے؟ کیا اس امت کی طرف اللہ کا کوئی رسول نہیں آیا؟ کیا اب کوئی رسول موجود ہے کہ اس کی معاونت کے لیے کسی اور رسول کا آنا ضروری ہو؟ کیا آنحضرت ﷺ کسی مخصوص علاقے کے لیے تشریف لائے تھے یا آپ کی

بعثت تمام نوع انسانی کے لیے اور قیامت تک کے لیے تھی؟ کیا آپ کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت مٹ چکی ہے؟ کیا قرآن کریم محفوظ نہیں رہا؟ کیا خود آنحضرت ﷺ کی سنت اور آپ کے حالات ہمارے پاس محفوظ نہیں ہیں؟ اور اگر ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں تو پھر ظاہر ہے اللہ تعالیٰ انسانوں پر یہ ظلم نہیں کر سکتا کہ ایک ایسے پیغمبر کی موجودگی میں جس کی لائی ہوئی ہدایت یہ تمام و کمال محفوظ ہو، جس پر اترنے والی کتاب ہر طرح کی ترمیم اور تحریف سے پاک ہو، جس کی لائی ہوئی شریعت تمام نوع انسانی کی ضرورتوں کے لیے کافی ہو، کسی اور پیغمبر کو بھیج کر نوع انسانی کو بلاوجہ امتحان میں ڈال دے۔ آپ کی ختم نبوت کے اثبات کے لیے صرف یہ عقلی دلیل ہی بس نہیں کوئی۔ بلکہ امرواقعہ یہ ہے کہ اسلام کے اساسی عقائد میں ختم نبوت کا عقیدہ شامل ہے اور قرآن و سنت میں نہایت صراحت سے اس عقیدہ کو بیان کیا گیا ہے۔ اس بارے میں قرآن کریم میں تقریباً" 100 آیات ایسی موجود ہیں جس میں کہیں اشارۃً اور کہیں صراحۃً" آپ کی ختم نبوت کا ذکر آیا ہے اور ایک آیت میں تو واضح طور پر آپ کو خاتم النبیین کہا گیا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس دور میں بعض گمراہ لوگوں نے خاتم النبیین کو عجیب و غریب معانی پہنانے کی کوشش کی۔ ہم اس سلسلے میں صرف ایک بات عرض کرتے ہیں وہ یہ کہ کسی لفظ کے معانی متعین کرنے کی آخر حقیقی صورت کیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی صرف دو شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ کہنے والے یا لکھنے والے سے پوچھا جائے کہ آپ نے جس لفظ کو استعمال کیا ہے آپ کے نزدیک اس کا حقیقی مفہوم کیا ہے اور دوسرا یہ کہ اگر وہ کہنے والی شخصیت کوئی پیغمبر یا استاد ہے تو اس کے شاگردوں یا اس کے قریبی ایمان لانے والوں سے پوچھا جائے کہ آپ نے اس لفظ یا آیت کا کونسا مفہوم اپنے استاد یا مربی سے سمجھا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی تیسری ایسی صورت نہیں جو ان دونوں کے مقابلے میں زیادہ صحیح کہی جا سکتی ہو۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو بارہا پڑھ کر سنایا اور خود بھی بے شمار مواقع پر اپنے آپ کو خاتم النبیین

کہا۔ تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کیا مفہوم مراد لیا یا بیان فرمایا۔
اب اگر احادیث کو دیکھیں تو آپ کو بیسیوں جگہ یہ الفاظ ملیں گے کہ

"انا خاتم النبیین لانبی بعدی"

کہ میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

اور ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مثال سے واضح فرمایا۔ کہ ایک خوبصورت محل جسے لوگ آکر دیکھتے اور اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے لیکن جب ان کی نظر ایک گوشے پر پڑتی جس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی تھی تو اسے دیکھ کر حیران رہ جاتے کہ اس خوبصورت محل میں آخر ایک اینٹ کی جگہ کیوں خالی رکھ دی گئی۔ فرمایا وہ محل نبوت و رسالت کا محل ہے اور وہ آخری اینٹ میں ہوں۔ اب میرے آنے کے بعد وہ محل مکمل ہو گیا۔

جہاں تک آپ کے شاگردوں اور آپ کے صحابہ کرام کا تعلق ہے کون نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال پرملال کے بعد ایک سے زیادہ نبیوں نے نبوت کا دعوی کیا اور مسلیمہ کذاب نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری دنوں میں ہی دعوی کر دیا تھا اور حضور کو خط بھی لکھا تھا جس میں اپنے رسول ہونے کا دعوی کیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ وسلم کو لکھا تھا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ آپ کی نبوت میں شریک کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کو رسول مانتا تھا بلکہ اس کے یہاں جو اذاں کہی جاتی تھی اس میں "اشھدان محمد الرسول اللّٰہ" کا کلمہ شامل تھا۔ اس کے باوجود حضور نے اسے کذاب کا خطاب دیا اور صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلافت سنبھالنے کے بعد پہلی فرصت میں اس پر لشکر کشی کی۔ باوجود اس کے کہ اس نے اپنے پاس ایک لشکر عظیم تیار کر لیا تھا جس کی تعداد چالیس ہزار تک پہنچتی تھی اور مسلمان زیادہ سے زیادہ گیارہ ہزار کی تعداد جمع کر سکے تھے لیکن پھر بھی مسلمانوں اور ان کے امیر نے بہتر حالات کا انتظار نہیں کیا۔ اپنی افرادی قوت کی کمی کے باوجود اس کی عظیم قوت سے جا ٹکرائے اور

اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے جب تک کہ مسیلمہ کو قتل کر کے اس عظیم فتنہ کا سدباب نہیں کر دیا۔ اس طرح صحابہ نے جانیں دے کر اور اس جھوٹے نبی کو قتل کر کے آنے والی امت پر خاتم النبیین کا مفہوم واضح کر دیا۔

اصولی طور پر تو عقیدہ ختم نبوت کی وضاحت کے لیے یہ وضاحت کافی ہے جو اوپر کر دی گئی ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے۔

"لَاتَقُوْمُ السَّاعَةَ حَتّٰی یبعثَ دَجَّالُوْنَ کَذَّابُوْنَ قریبا" من ثَلَاثِیْنَ کُلُّهُمْ یَزْعَمُ انه رسول اللّٰہ"

قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہو گی جب تک 30 کے لگ بھگ دجال اور کذاب پیدا نہیں ہوں گے جن میں سے ہر کوئی یہ دعوی کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔

اس ارشاد کے مطابق جس نے بھی دنیا میں نبوت کا جھوٹا دعوی کیا وہ اپنے زمانے کا دجال ہو گا۔ یعنی پرلے درجے کا دھوکے باز۔ اور س نے اپنے دعوی کو ثابت کرنے کے لیے عجیب و غریب تاویلات' توجیہات، اور شعبدہ بازیوں سے کام لیا۔ اس معاملے میں سب سے آگے بڑھ جانے والے ہمارے ملک کے "مرزا غلام احمد قادیانی" ہیں۔ جنھوں نے ایک طویل عرصے تک اس امت ~~میں~~ نبوت کا کھڑاگ رچائے رکھا اور امت میں ایک بہت بڑے فتنے کا دروازہ کھول دیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ 1974ء میں پارلیمنٹ نے قادیانیوں کو بالاتفاق (غیر مسلم) اقلیت قرار دیا۔ لیکن اس کے باوجود آج تک ان کا یہ جعل سازی کا کاروبار ملک کے اندر اور ملک کے باہر کسی نہ کسی حد تک جاری و ساری ہے۔ اس سلسلہ میں وہ مسلمانوں نیں غلط فہمی پیدا کرنے اور دھوکے میں ڈالنے کے لیے جو طریقے اختیار کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کے ابتدائی دور کی عبارتیں پیش کرتے ہیں۔

جن میں انہوں نے علی الاطلاق دعوائے نبوت کو کفر قرار دیا ہے لیکن خود مرزا صاحب نے واضح کر دیا ہے کہ وہ مجدد' محدث' مسیح موعود اور مہدی

مراتب سے "ترقی" کرتے ہوئے درجہ بدرجہ نبوت کے منصب تک پہنچے ۔ انہوں نے اپنے دعوؤں کی جو تاریخ بیان کی ہے اسے ہم پوری تفصیل ساتھ انہی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں تاکہ ان کی عبارت کو پورے سیاق دیکھ کر ان کا پورا مفہوم واضح ہو سکے۔ کسی نے مرزا صاحب سے سوال کیا لہ آپ کی عبارتوں میں یہ تناقض نظر آتا ہے کہ کہیں آپ اپنے آپ کو " بی" لکھتے ہیں اور کہیں اپنے آپ کو "مسیح سے تمام شان میں بڑھ کر" قرار تے ہیں۔ اس کا جواب دیتے ہوئے مرزا صاحب حقیقة الوحی میں لکھتے ۔

> "اس بات کو توجہ کر کے سمجھ لو کہ یہ اسی قسم کا تناقض ہے کہ جیسے براہین احمدیہ میں میں نے یہ لکھا تھا کہ مسیح ابن مریم آسمان سے نازل ہو گا مگر بعد میں یہ لکھا کہ آنے والا مسیح میں ہوں۔ اس تناقض کا بھی یہی سبب تھا کہ اگرچہ خدا تعالیٰ نے براہین احمدیہ میں میرا نام عیسیٰ رکھا اور یہ بھی مجھے فرمایا کہ تیرے آنے کی خبر خدا اور رسول ﷺ نے دی تھی مگر چونکہ ایک گروہ مسلمانوں کا اس اعتقاد پر جما ہوا تھا۔
>
> اور میرا بھی یہی اعتقاد تھا کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر سے نازل ہوں گے۔ اس لیے میں نے خدا کی وحی کو ظاہر پر حمل کرنا نہ چاہا بلکہ اس وحی کی تاویل کی اور اپنا اعتقاد وہی رکھا جو عام مسلمانوں کا تھا اور سی کو براہین احمدیہ میں شائع کیا۔
>
> لیکن بعد اس کے اس بارے میں بارش کی طرح وحی الٰہی نازل ہوئی کہ وہ مسیح موعود جو آنے والا تھا تو ہی ہے اور ساتھ اس کے صدہا نشان ظہور میں آئے اور زمین آسمان دونوں میری تصدیق کے لیے کھڑے ہو گئے اور خدا کے چمکتے ہوئے نشان میرے پر جبر کر کے مجھے اس طرف لے

> آئے کہ آخری زمانہ میں مسیح آنے والا میں ہی ہوں ورنہ میرا اعتقاد تو وہی تھا۔ جو میں نے براہین احمدیہ میں لکھ دیا تھا۔ اسی اوائل میں میرا یہی عقیدہ تھا کہ مجھ کو مسیح ابن مریم سے کیا نسبت ہے؟ وہ نبی ہے اور خدا کے بزرگ مقربین میں سے ہے اور اگر کوئی امر میری فضیلت کی نسبت ظاہر ہوتا تو میں اس کو جزئی فضیلت قرار دیتا تھا مگر بعد میں جو خدا تعالیٰ کی وحی بارش کی طرح میرے پر نازل ہوئی اس نے مجھے اس عقیدے پر قائم نہ رہنے دیا اور صریح طور پر نبی کا خطاب مجھے دیا گیا مگر اس طرح سے کہ ایک پہلو سے نبی اور ایک پہلو سے امتی۔ میں اس کی پاک وحی پر ایسا ہی ایمان لاتا ہوں جیسا کہ ان تمام خدا کی وحیون پر ایمان لاتا ہوں جو مجھ سے پہلے ہو چکی ہیں۔ میں تو خدا تعالیٰ کی وحی کی پیروی کرنے والا ہوں۔ جب تک مجھے اس سے علم نہ ہوا میں وہی کہتا رہا جو اوائل میں میں نے کہا اور جب مجھ کو اس کی طرف سے علم ہوا تو میں نے اس کے مخالف کہا۔

(حقیقۃالوحی ص 149-150 مطبوعہ قادیان 1934ء)

مرزا صاحب کی یہ عبارت اپنے مدعا پر اس قدر صریح ہے کہ کسی مزید تشریح کی حاجت نہیں۔ اس عبارت کے بعد اگر کوئی شخص ان کے اس زمانے کی عبارتیں پیش کرتا ہے جب وہ دعوائے نبوت کی نفی کرتے تھے اور جب (بزعم خویش) انہیں اپنے نبی ہونے کا علم نہیں ہوا تھا تو اس دجل و فریب کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

اب ہم مرزا صاحب کا اصل چہرہ روشناس کرانے کے لیے باحوالہ انہی کے دعوؤں کو پیش کرتے ہیں جس سے آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ مرزا صاحب کا اپنے بارے میں اصل دعوی کیا تھا اور کس طرح تاویلوں میں اسے الجھایا گیا۔

”سچا خدا وہی ہے جس نے قادیان میں اپنا رسول بھیجا“

(دافع البلاء طبع سوم قادیان 1946ء ص 11)

”میں رسول اور نبی ہوں، یعنی باعتبار ظلیت کاملہ کے، میں وہ آئینہ ہوں جس میں محمدی شکل اور محمدی نبوت کا کامل انعکاس ہے۔“

(نزول المسیح ص 3 (حاشیہ) طبع اول مطبع ضیاء الاسلام قادیان 1909ء)

”میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اس نے مجھے بھیجا ہے اور اسی نے میرا نام نبی رکھا ہے۔“

(تتمہ حقیقۃ الوحی ص 68 مطبوعہ قادیان 1934ء)

”میں جب کہ اس مدت تک ڈیڑھ سو پیشگوئی کے قریب خدا کی طرف سے پا کر بہ چشم خود دیکھ چکا ہوں کہ صاف طور پوری ہو گئیں تو میں اپنی نسبت نبی یا رسول کے نام سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں اور جب کہ خود خدا تعالیٰ نے یہ نام میرے رکھے ہیں تو میں کیونکر رد کر دوں یا اس کے سوا کسی دوسرے سے ڈروں۔“

(ایک غلطی کا ازالہ ص 8 مطبوعہ قادیان 1901ء)

”خدا تعالیٰ نے مجھے تمام انبیاء علیہم السلام کا مظہر ٹھہرایا ہے اور تمام نبیوں کے نام میری طرف منسوب کیے ہیں میں آدم ہوں، میں شیث ہوں میں نوح ہوں، میں ابراہیم ہوں، میں اسحٰق ہوں، میں اسمٰعیل ہوں، میں یعقوب ہوں، مین یوسف ہوں، میں عیسیٰ ہوں، میں موسیٰ ہوں، میں داؤد ہوں اور آنحضرت ﷺ کے نام کا میں مظہر اتم ہوں۔ یعنی ظلی طور پر محمد احمد ہوں۔“

(حاشیہ حقیقۃ الوحی ص 72 مطبوعہ قادیان 1934ء)

"چند روز ہوئے ایک صاحب پر ایک مخالف کی طرف سے یہ اعتراض پیش ہوا کہ جس سے تم نے بیعت کی ہے وہ نبی اور رسول ہونے کا دعوی کرتا ہے اس کا جواب محض انکار کے الفاظ سے دیا گیا۔ حالانکہ ایسا جواب صحیح نہیں ہے۔ حق یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی وہ پاک وحی جو میرے پر نازل ہوئی اس میں سے ایسے الفاظ رسول اور مرسل اور نبی کے موجود ہیں۔ نہ ایک دفعہ بلکہ صدہا بار پھر کیونکر یہ جواب صحیح ہو سکتا ہے۔

(ایک غلطی کا ازالہ صفحہ اول صفحہ 1902ء مطبوعہ قادیان 1934ء)

"ہمارا دعوی ہے کہ ہم رسول اور نبی ہیں۔"

(اخبار 5 مارچ 1908ء مندرجہ حقیقۃ النبوۃ مولفہ مرزا بشیر الدین محمود ج۔ 1 ص 272 ضمیمہ نمبر3)

"انبیاء گرچہ بودہ اند بسے ۔۔۔ من بہ عرفان نہ کمترم زکسے"

"نزول المسیح ص 97 طبع اول قادیان 1909ء)

"یعنی انبیاء اگرچہ بہت سے ہوئے ہیں مگر میں معرفت میں کسی سے کم نہیں ہوں۔"

مناسب ہو گا کہ ہم مرزا صاحب کے اس آخری عقیدہ کا ذکر کر دیں جس پر ان کا خاتمہ ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آخری خط میں جو ٹھیک ان کے انتقال کے دن اخبار عام میں شائع ہوا واضح الفاظ میں لکھا۔

"میں خدا کے حکم کے موافق نبی ہوں اور اگر میں اس سے انکار کروں تو میرا گناہ ہو گا اور جس حالت میں خدا میرا نام نبی رکھتا ہے' تو میں کیونکر انکار کر سکتا ہوں میں اس پر قائم ہوں اس وقت تک جو اس دنیا سے گزر جاؤں۔

(اخبار عام 26 مئی 1908ء منقول از حقیقۃ النبوۃ مرزا محمود ص 271 و مباحثہ راولپنڈی ص 136)

یہ خط 23 مئی 1908ء کو لکھا گیا اور 26 مئی کے اخبار میں شائع ہوا اور ٹھیک اسی دن مرزا صاحب کا انتقال ہوا۔

اس لیے علامہ اقبال نے یہ مطالبہ پیش کیا تھا کہ

> ”میری رائے میں حکومت کے لیے بہترین طریق کار یہ ہو گا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کر لے یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہو گا اور مسلمان اس سے ویسی رواداری سے کام لے گا جیسے وہ باقی مذاہب کے معاملے میں اختیار کرتا ہے۔“

(علامہ اقبال بہ حرف اقبال ص 118 مطبوعہ لاہور)

> ”ملت اسلامیہ کو اس مطالبے کا پورا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے اگر حکومت نے مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے حکومت نے 1919ء میں سکھوں کی طرف سے (ہندوؤں سے) علیحدگی کا انتظار نہ کیا اب وہ قادیانیوں سے ایسے مطالبہ کے لیے کیوں انتظار کر رہی ہے۔ (حرف اقبال)

مختصر یہ کہ انسانی مسائل بے شمار ہیں۔ عقلوں میں بے پناہ تفاوت ہے۔ نفسانی امراض بے شمار ہیں۔ ہوائے نفس کی حکمرانی ہے۔ حواس اور عقل محدود دائرہ کی حامل ہے۔ اس صورت حال میں اللہ نے رسالت کے اس سلسلے کو جاری فرما کر انسانوں کے لیے زندگی گزارنا آسان فرما دیا اور زندگی کے لاینحل مسائل کا حل دے کر ان کے مسائل کے کشود کی راہ کھول دی۔ اور پھر آنحضرت ﷺ کو ختم رسالت کا تاج پہنا کر انسانوں کے لیے ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کر دیا جس سے وہ رنگ و نسل اور چھوٹے بڑے انتسابات کی تنگ نائیوں سے نکل کر انسانیت کے لیے ایک روشن مستقبل کا انتظام کر سکتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کو علامہ اقبال نے اپنے کلام میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

پس خدا برما شریعت ختم کرد　　بر رسولِ ما رسالت ختم کر
رونق از ما محفلِ ایّام را　　او رسل را ختم وما اقوام ر
خدمتِ ساقی گری برما گزاشت　　دادمارا آخریں جامے کہ داشت
”لانبی بعدی“ زاحسانِ خدا است　　پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰ است
قومِ را سرمایۂ قوت ازو　　حفظِ سرِّ وحدتِ ملت از
حق تعالیٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست　　تاابد اسلام را شیرازہ بست
دل ز غیراللہ مسلماں برکند　　نعرۂ لاقوم بعدی می ز

# آخرت کا تعارف اور برزخ کی حقیقت

اساتذہ کرام اور طلباء عزیز!

اسلامی عقائد کی آخری کڑی آخرت پر ایمان لانا ہے۔ قرآن پاک
ں ایمان باللہ کے بعد اس کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ کیونکہ
جودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آئندہ
یا کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے۔ اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمال انسانی کے
ائج کا ریشہ ریشہ بیخ و بن سے اکھڑ جائے۔ قرآن کریم نے اسے الیوم الاخر یا
خرت کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ مراد اس سے آخرت کا گھر یا آخرت کی زندگی
ہے۔ عربی میں طریقہ یہ ہے کہ اوصاف کو موصوف کا قائم مقام کر کے اکثر
صوف کو حذف کر دیتے ہیں۔ اس طریقے کے مطابق قرآن کریم نے
خرت کا لفظ استعمال کیا ہے جو الحیاۃ یا الدار کی صفت ہے۔ مراد اس سے
خرت کا اگھر یا آخرت کی زندگی ہے۔ قرآن پاک میں تقریباً" 113 مقامات پر یہ
ظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ الاخر یا آخرت کا معنی ہے پچھلی زندگی یا
ملا گھر پچھلی دنیا۔ اس پچھلی دنیا سے مراد موت کے بعد کی دنیا ہے جسے قرآن
یم نے دو دوروں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دور سے مراد موت سے لے کر
ت تک کا دور ہے اور دوسرے دور سے مراد قیامت سے لے کر ابد تک کا
۔ جس میں پھر موت اور فنا نہیں۔ -پہلے دور کا نام برزخ ہے اور دوسرے
کا نام بعث بعد الموت یا حشر و نشر اور قیامت ہے اور ان سب کے معنی جی
نے' اکٹھے کئے جانے' اور کھڑے ہونے کے ہیں۔ ان سب سے مقصود ایک

حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمے کے بعد دوسری یا کی زندگی ہے۔ جسے قرآن کریم میں الدارالاخرہ اور عقبی الدار وغیرہ کے وں سے یاد کیا گیا ہے۔

قرآن و سنت میں آخرت کی جو تفصیلات آئی ہیں ان پر اگر ہم غور ریں تو چند چیزیں ہمارے سامنے واضح ہوتی ہیں۔

اس احساس کو دلوں میں مستحضر کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے کہ جو زندگی مان گزار رہا ہے یہ زندگی ہمیشہ قائم نہیں رہے گی۔ اگرچہ علم کی حد تک ہر دمی جانتا ہے کہ موت سے بہرحال ہمکنار ہونا ہے۔ کیونکہ ہر آدمی کے سامنے ازے اٹھتے ہیں موت و حیات کا سلسلہ جاری و ساری رہتا ہے۔ بایں ہمہ مان کو اپنی موت کا خیال اور یقین بہت کم پیدا ہوتا ہے۔ آدمی زندگی کی ہما ں میں اس طرح مستغرق رہتا ہے کہ اسے بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ ک دن زندگی کے ان ہنگاموں کا خاتمہ بھی ہونے والا ہے۔ اس لیے آخرت ے تصور سے اسلام اپنے ماننے والوں میں یہ تصور راسخ کرنا چاہتا ہے کہ تم ندگی اور موت کے فاصلے کو زیادہ نہ جانو۔ زندگی کی حیثیت ایک حباب کی سی ہے جو ہوا کے ایک جھونکے سے کسی وقت بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ اس لیے زندگی ے فائدہ ضرور اٹھاؤ مگر آنے والے وقت کو ہر وقت یاد رکھو۔ حضرت عبداللہ ن مسعود فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور ﷺ رفع حاجت کے لیے نکلے۔ میں نی کا برتن لے کر ہمراہ ہو گیا۔ حضور ﷺ آبادی سے نکل کر کھجوروں کے جھنڈ ں داخل ہوئے۔ رفع حاجت سے فارغ ہو کر باہر نکلتے ہی زمین پر بیٹھ کر آپ نے تیمم فرمایا پھر مجھ سے پانی طلب کیا اور پانی استعمال فرمایا۔ میں نے بصد ادب رض کی حضور میں آپ سے بہت قریب تھا اور پانی میرے پاس آپ کے ستعمال کے لیے حاضر تھا پھر آپ نے تیمم کیوں فرمایا؟ آپ نے ارشاد فرمایا بداللہ کیا مجھے اس بات کا یقین ہو سکتا تھا کہ میں پانی تک پہنچنے سے پہلے یا پانی ہ تک پہنچنے سے پہلے میں اللہ کو پیارا نہ ہو جاؤں گا۔ اس سے تصور یہ دنیا قصود تھا کہ موت کو ہر وقت اپنے قریب جانو۔ اس لیے آخرت کے تصور میں

پہلا تو یہ تصور ہے جو دلوں میں اتارنا مقصود ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی ک
موت اصلا" زندگی کی فنا کا نام نہیں بلکہ تمہیں جس ذمہ داریوں کی ادائیگی کے
لیے دنیا میں بھیجا گیا تھا اور تمہیں اس زندگی کی صورت میں ایک مہلت
دی گئی تھی موت اصلا" اس کے خاتمے کا نام ہے۔

یعنی یہ اس طرح کی فنا نہیں ہے جیسی فنا دوسری غیر مکلف مخلو
پر طاری ہوتی ہے۔ جس طرح ایک حباب ٹوٹتا ہے، پھول مرجھا کے ٹہنی
جاتا ہے، پتے خزاں میں جھڑنے لگتے ہیں۔ یا کوئی حیوان اپنی طبعی عمر کو
سفر حیات ختم کر دیتا ہے۔ کیونکہ ایک پھول کو چند روزہ بہار کے لیے پیدا
تھا سو وہ پوری ہو گئی۔ پتوں کو چند دنوں تک سایہ دینا تھا وہ دے چکے۔
حیوان کو اپنی جبلی ذمہ داریاں پورا کرنا تھیں وہ کر چکا۔ اب اس کے لیے
سوا اور کچھ نہیں۔ مگر انسانی موت فنا نہیں بلکہ اپنی ذمہ داریوں سے واپسی
عبارت ہے کہ اسے ایک خاص مقصدِ حیات اور ذمہ داریاں دے کر دنیا میں
گیا تھا۔ اب اسے اس سے واپس بلایا جا رہا ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے
واپسی کو اللہ کی طرف روح کی بازگشت قرار دیا ہے۔ سورہ جمعہ میں ارشاد
"قل ان الموت الذی تفرون منه فانه ملاقیکم ثم تردون الی
الغیب و الشّهادة فینبئکم بما کنتم تعلمون ○ کہہ دیجئے بے ش
موت جس سے تم بھاگتے ہو اس سے ملنا ہی ہے۔ پھر تم اس خدا کے
لوٹائے جاؤ گے جو حاضر و غائب کو جاننے والا ہے اور وہ تم کو تمہارے
بتائے گا ہم سورۃ بقرہ کی اس آیت کو اکثر اپنی زبانوں سے دھراتے رہتے
انا للہ و انا الیہ رجعوان۔ "ہم سب خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر
گے۔ اس میں بھی اسی حقیقت کا اعادہ کیا گیا ہے۔ سورہ مائدہ میں ارشاد
"الی اللہ مرجعکم جمیعا" تم سب کو خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا
اور پھر یہ اللہ کی طرف لوٹنا ہر صورت میں ہو گا چاہے آدمی اس کی خواہش
ہو یا اس سے نفرت کرتا ہو۔ یہ ایک اٹل سنت اللہ ہے جس سے کبھی
نہیں۔ سورہ القیامہ کی ایک آیت میں اس کے بارے میں خوب نقشہ

ہے۔ ارشاد فرمایا "کلا اذا بلغت التراقی و قیل من راق وظن انه الفراق و التفت الساق بالساق الی ربک یومئذن المساق" ہرگز نہیں جب روح ہنسلی تک آ پہنچے اور لوگ کہیں اب کون ہے جھاڑ پھونک کر بچانے والا اور سمجھو کہ اب جدائی کا وقت آگیا اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ گئی۔ اس دن تمہیں پروردگار کی طرف ہانکا جانا ہے۔

البتہ فرق یہ ہے کہ وہ بدنصیب جنھوں نے کفر اور شرک کی زندگی گزاری اور ان کو کبھی اس بات کا خیال نہیں آیا کہ اللہ کی طرف لوٹ کر بھی جانا ہے ان کی واپسی تو اسی طرح ہو گی جیسے کسی جانور کو ہانک کر لے جایا جاتا ہے۔ جس طرح سورہ انعام میں ارشاد فرمایا "وَلَو تَرٰی اِذا الظالِمُونَ فی غَمَراتِ المَوتِ والملائکَة باسطُوا اَیدیھم اَخرِجُوا انفُسَکم الیوم تجزَونَ عذابَ الھُون بمَاکُنتم تَقوَلُونَ علی اللّٰه غَیرَ الحَقّ وکُنتُم عَن آیاتِه تَستَکبرُون وَ لَقد جئتُموَنا فُرادٰی کَمَا خَلَقنا کُم اَوّلَ مَرَّة و ترکتُم مَّا خولناکم وَراءَ ظُھورکم

ترجمہ = "اور اگر تم دیکھو جس وقت گنہگار موت کی بے ہوشی میں ہونگے اور فرشتے ہاتھ کھولے کہہ رہے ہوں گے کہ نکالو اپنے جسموں کے اندر سے اپنی روحوں کو آج تم کو اس پر ذلت کی سزا ملے گی کہ تم خدا کی شان میں جھوٹی باتیں کہتے تھے اور اس کے حکموں کو ماننے سے غرور کرتے تھے اور تم ایک ایک کرکے تنہا جیسے ہم نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا ہمارے پاس آئے ہو اور جو سامان و اسباب تم کو دیا تھا جس نے تم کو مغرور بنایا تھا اس کو پیچھے چھوڑ آئے ہو۔" لیکن جو سعید اور نیکوکار روحیں اپنے آنے والے انجام کو یاد رکھتی ہیں بلکہ اللہ سے ملاقات کی متمنی رہتی ہیں انہیں آخری وقت یہ صدا سنائی دیتی ہے۔

"یٰاَیَّتُھَا النَّفسُ المُطمَئِنَّةُ اِرجِعِی اِلٰی رَبِّکَ رَاضِیَةً مَّرضِیَّة"
اے مطمئن روح تو اپنے مالک سے خوش اور تیرا مالک تجھ سے خوش تو اپنے مالک کے پاس واپس چلی جا۔"

اسی طرح مومن اور کافر دونوں اپنی مہلت عمل کے خاتمے پر اپنے اللہ کے حضور حاضر ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں ایک ایسی جگہ رکھا جاتا ہے جسے ہم برزخ کہتے یں۔ اور اسی کو احادیث مبارکہ میں اور تمام سامی قوموں کے محاورے میں قبر کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن اس قبر سے مقصود وہ خاک کا تودہ نہیں جس کے نیچے کسی مردہ کی ہڈیاں پڑی رہتی ہیں بلکہ وہ دنیا ہے جس میں مرنے والوں کی روحوں کو قیامت تک رکھا جائے گا۔ کوئی مرنے والا چاہے خاک میں دفن ہو یا قعرِ دریا میں ڈوب جائے یا کسی درند یا پرند کے پیٹ میں اس کے جسم کو جگہ ملے یہی اس کی قبر ہے اور یہی وہ دنیا ہے جسے برزخ کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور اسی برزخ یعنی قبر سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام مرنے والوں کو اٹھائے گا۔ ارشاد خداوندی ہے۔

"وَاَنَّ اللّٰہَ یَبۡعَثُ مَنۡ فِی الۡقُبُوۡر"

بے شک اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں اٹھائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ اٹھایا جانا صرف انہی مردوں کے لیے مخصوص نہیں جو تودۂ خاک کے اندر دفن ہیں بلکہ ہر میت کے لیے ہے خواہ وہ کیسی حالت اور کیسے عالم میں ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ اس برزخ کا مفہوم کیا ہے؟ برزخ کا لفظ قرآن کریم میں تین جگہ استعمال ہوا ہے۔ سورہ رحمٰن میں، سورہ فرقان میں، سورہ مومنون میں۔ ہر جگہ اس سے دو چیزوں کے درمیان پردہ حاجب اور حائل مراد ہے۔ مثلاً سورہ فرقان آیت نمبر5 میں فرمایا:

وَهُوَ الَّذِی مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَ جَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ہ "اور اسی نے دو دریاؤں کو ملا کر چلایا یہ میٹھا اور پیاس بجھاتا ہے اور وہ کھاری کڑوا ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ ہے اور روکی ہوئی اوٹ بھی بنائی ہے۔" تو اس برزخ سے مراد موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان جو حائل اور رکاوٹ ہے اسی کو برزخ کہا گیا ہے۔ یعنی جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اب دوبارہ وہ زندہ اس وقت ہو گا جب قیامت برپا ہو گی۔ ان دونوں زندگیوں کے

درمیان ایک مدت حائل ہے جو انسان پر ایک خاص قسم کی موت کا دور ہے۔ اس کا نام برزخ ہے۔ یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ قیامت کے آنے تک یہ برزخی دور باقی رہے گا۔ لیکن یہ زندگی کا دور نہیں بلکہ یہ موت کا زمانہ ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے دو مدتوں اور دو زندگیوں کا ہمیں تصور دیا ہے۔ سورہ بقرہ میں ارشاد فرمایا "کَیفَ تَکفُرُونَ باللّٰه و کُنتُمْ اَمواتاً فاَحیَاکُمْ ثُمَّ یُمیتُکُمْ ثم یُحیِیکم ثُمَّ اِلَیہ تُرجَعُونَ○ "کیسے تم اللہ کا انکار کرتے ہو؟ حالانکہ تم پہلے مردہ تھے تو پھر اس نے تم کو زندہ کیا یعنی انسان بنا کر پیدا کیا۔ پھر تم کو مار دے گا۔ پھر تم کو زندہ کرے گا۔ پھر اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔" پہلی موت تو ہر انسان کی پیدائش سے پہلے کا وقت ہے۔ جب وہ مادہ یا عنصر کی شکل میں تھا۔ پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں پیدا ہوا۔ یہ اس کی پہلی زندگی ہے۔ پھر موت آئی۔ روح نے مفارقت کی اور جسم اپنی اگلی مادی صورت میں منتقل ہو گیا۔ یہ اس کی دوسری موت ہے اور اسی کو برزخی زندگی کہا گیا ہے۔ پھر خود اس کی روح کو جسم سے ملا کر زندہ کرے گا۔ یہ اس کی دوسری زندگی ہے۔ جس کے بعد پھر کبھی اسے موت نہیں آئے گی۔ اب رہی یہ بات کہ یہ دور قیامت تک چلے گا۔ اس کا ثبوت بھی ہمیں قرآن کریم سے ملتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

"وَمِن وَّرَاءِہِم بَرزَخٌ اِلٰی یَومِ یُبعَثُونَ"

"اور ان کے پیچھے برزخ ہے اس دن تک جب وہ اٹھائے جائیں گے۔ یعنی قیامت تک۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کی تین منزلیں ہیں۔ دنیا، برزخ اور قیامت۔ ان تینوں میں جو فرق ہے اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ دنیا میں جسم یعنی مادہ نمایاں اور روح پوشیدہ ہے اور روح کو جو کچھ مسرت و تکلیف یہاں پہنچتی ہے وہ صرف اس مادی جسم کے وجود سے پہنچتی ہے۔ ورنہ درحقیقت اس کی براہ راست لذت و راحت کا اس مادی دنیا میں کوئی امکان نہیں۔ دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہا گیا ہے روح نمایاں ہو گی اور جسم چھپ جائے گا۔ وہاں جو راحت و تکلیف پہنچے گی وہ دراصل روح کو

پہنچے گی اور جسم اس کی تبعیت میں ضمنا” اس سے متاثر ہو گا۔ لیکن تیسرے عالم یعنی قیامت میں جہاں سے حقیقی اور غیرفانی زندگی شروع ہوتی ہے روح اور جسم دونوں نمایاں ہوں گے اور دونوں کی لذت و راحت کے مظاہر بالکل الگ ہوں گے۔

یہ بات تو واضح ہو گئی کہ برزخی دنیا زندگی کا دور نہیں بلکہ موت کا دور ہے لیکن ہمیں اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس میں مرنے والے کو سوال و جواب کے ایک مختصر مرحلے سے بھی گزرنا ہو گا اور اسے کسی نہ کسی حد تک عذاب و ثواب سے بھی واسطہ پڑے گا۔ (جس کی تفصیل ہم آگے ذکر کریں گے)۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ دور زندگی کا نہیں بلکہ موت کا دور ہے تو پھر اس میں سوال و جواب اور عذاب و ثواب کا تحقق کیسے ہو گا؟ اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ موت کی حقیقت کو سمجھ لیا جائے۔ اسی موت کے واسطے سے مرنے والا برزخ کی وادی میں داخل ہوتا ہے۔ اس لیے برزخی زندگی کی وہی حقیقت ہو گی جو اس موت کی حقیقت ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن پاک میں موت کو نیند سے تشبیہ دی گئی ہے۔ سورہ زمر میں ارشاد فرمایا گیا۔

”اَللّٰہ یَتَوَفَّی الاَنفُسَ حِینَ مَوتِھَا والَّتِی لَمْ تَمُتْ فِی مَنَامِھا
فَیُمسِکُ الَّتی قَضٰی عَلَیھَا المَوتَ وَ یُرسِلُ الاُخریٰ الی اَجَلٍ
مُّسَمًّی۔ اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَآیاتٍ لِقَومٍ یَتَفَکَّرُونَ ○“

”وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو ان کی موت کے وقت وفات دیتا ہے اور جو نہیں مری ہیں ان کو نیند میں ہی وفات دے دیتا ہے۔ تو جس پر موت کا حکم اس نے جاری کیا اس کو روک لیتا ہے اور دوسری روح کو جس پر موت کا حکم نہیں یعنی نیند والی کو ایک مدت معینہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ بے شک اس میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ اس آیت کریمہ میں موت کو نیند سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بلکہ دونوں کو ایک ہی سطح پر رکھ کر ذکر فرمایا گیا ہے۔ اسی

برزخی زندگی کو قرآن کریم نے نیند سے تعبیر فرمایا۔ یعنی قیامت میں جب
وسری زندگی پاکر قبروں سے اٹھیں گے تو گنہگاروں کی زبانوں پر یہ فقرہ
"یاویلنا من بعثنا من مرقدنا"
"اے ہماری خرابی کس نے ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے اٹھا دیا۔ مرقد
ر کے لیے بولتے ہیں حالانکہ اس کا معنی سونے کی جگہ ہے۔ اب اس کو
قبر کو بستر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس طرح قرآن کریم میں دوسری زندگی
یامت کے لیے اکثر بعث کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی جگانے اور
کرنے کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موت اپنی حقیقت میں نیند کے
واقع ہوئی ہے۔ اب ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ ایک سونے والے
نیت کیا ہوتی ہے؟ اور نیند سے اس میں کس طرح کی تبدیلیاں پیدا ہوتی
چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان جب سوتا ہے تو اس کے ادراک و احساس
لات اپنی مادی دنیا سے عارضی طور سے بے خبر ہو جاتے ہیں مگر اس کے
ک و احساس کی تخیلی، تمثالی یا ذہنی دنیا اس کے سامنے بالکل اسی مادی
ی طرح متشکل ہوتی ہے۔ اس میں وہ خود اپنے جسم سے الگ مگر ہو بہو
جسم دیکھتا ہے جو آتا جاتا ہے۔ اس کے سامنے کھانے پینے اور لطف انگیزی
سب سامان ہوتے ہیں نیز اس میں درد و رنج اور تکلیف کی تمام وہی
تیں ہوتی ہیں جو مادی دنیا میں ہیں۔ اس کے خیالی جسم کو اگر اس عالم میں
ف ہوتی ہے تو وہ چیخ اٹھتا ہے۔ اور اگر اس میں لذت ملتی ہے تو لطف اندوز
ہے اور ان دونوں کے اثرات اس کو اپنے مادی جسم میں جاگنے کے بعد بھی
آتے ہیں۔ غرض عالم خواب کی خیالی دنیا اور اس کی خوشی اور رنج اور
ت والم اور اس مادی دنیا کی جسمانی و مادی خوشی اور رنج اور لذت و الم میں
فرق نہیں ہوتا۔ اگر کچھ فرق ہے تو یہ ہے کہ عالم خواب کی لذت و
ف بیداری کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور مادی دنیا کی تکلیف و لذت احساس و
اک کے وجود تک قائم رہتی ہے۔ اور جس طرح مادی بیداری والی لذت و
ف خواب میں معدوم ہو جاتی ہے اس طرح خواب والی لذت و تکلیف

بیداری میں رخصت ہو جاتی ہے۔

برزخی زندگی کو بھی انہی احوال و کیفیات کے آئینہ میں دیکھنا چاہیے یہ ایک طویل اور گہری نیند ہے جو موت کی صورت میں انسان پر طاری کر جاتی ہے۔ اس میں جو کچھ واردات گزرتی ہے اس کا تعلق براہ راست ر سے ہوتا ہے۔ البتہ اس میں یہ لمبی نیند سونے والا ایک جسم کو بھی دیکھتا ہے اس کے اعمال کی رعایت سے مناسب صورت میں اسے ملتا ہے۔ اس میں اگ اسے سوال و جواب سے گزارا جاتا ہے تو وہ خواب کی طرح اس سوال و جوا کے ماحول سے گزرتا ہے۔ اور اگر اسے لذت و راحت سے واسطہ پڑتا ہے تو خواب ہی کی طرح اسے محسوس کرتا ہے اور محظوظ ہوتا ہے اور اگر ا تکلیف و عذاب سے گزرنا پڑتا ہے تو وہ خواب ہی کی طرح اس کی شدت محسوس کرتا ہے۔ اصل سوال یہ نہیں کہ ثواب و عذاب کو محسوس کر ذریعہ کیا ہے بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ کیا اسے ثواب و عذاب کا احساس ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں طرح کے احساسات وہ عالم بیداری میں رکھتا ہے اور نیند میں بھی۔ جس طرح اپنی مرغوب چیز پا کر عالم بیداری م مسرت و شادمانی محسوس کرتا ہے اور تکلیف دہ صورتحال سے دو چار ہو پریشانی اور کرب کا شکار ہوتا ہے بالکل یہی کیفیت اس کی نیند کی حالت میں ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ نیند کی حالت کے تغیرات نیند کھل جانے ختم ہو جاتے ہیں تو آدمی انہیں جلدی بھول جاتا ہے اور بیداری کے تغیرات دیرپا ہوتے ہیں اس لیے انہیں دیر تک یاد رکھتا ہے۔ یہ برزخی زندگی چونکہ قیامت تک طویل ہو گی اس لیے اس میں پیش آمدہ تغیرات چاہے وہ خوشی کی شکل میں ہوں یا تکلیف کی شکل میں اس لیے دیرپا ہوں گے اور گہرے تاثرا چھوڑیں گے۔ کیونکہ اب قیامت سے پہلے یہ صورتحال بدلنے والی نہیں اور نیند کھلنے والی نہیں۔

ہمیں قرآن و سنت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد ہر مر والا ایک مختصر امتحان سے گزرے گا یعنی اس سے کچھ سوال و جواب کئے جائیں

گے۔ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں اور وہ مردوں سے توحید و رسالت کی نسبت سوال و جواب کرتے ہیں۔ یعنی وہ اس سے اس کے رب کے بارے میں بھی پوچھتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کے بارے میں بھی۔ اگر اس نے زندگی ایمان و عمل کے ساتھ گزاری ہوگی تو اسے صحیح جواب دینے کی توفیق ملے گی ورنہ ہمیشہ کی نامرادی اس کا مقدر بن جائے گی اور قرآن کریم سے ہمیں ان باتوں کی تصدیق بھی ہوتی ہے اور کچھ مزید باتوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ تصدیق تو اس بات کی ہوتی ہے کہ ایمان و اعمال کی زندگی گزارنے والے مرنے کے بعد فرشتوں کی دعاؤں اور ان کے تہنیتی کلمات سے مستفید اور شاد کام ہوں گے۔ اور وہ آنے والے وقت کی بشارت بھی دیں گے۔ اور مزید جس بات کی قرآن پاک ہمیں خبر دیتا ہے ان میں سے ایک بات تو یہ ہے کہ مرنے والوں میں وہ بدنصیب جنہوں نے ایمان لانے کی بجائے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ فرشتے صرف ان کی جان ہی نہیں نکالیں گے بلکہ ساتھ ساتھ ماریں پیٹیں گے بھی اور جان نکالتے ہی انہیں عذاب سے دوچار کر دیا جائے گا۔ سورہ انفال میں ہے۔ ولو ترٰی اذ یتوفی الذین کفروا الملائکۃ یضربون وجوھھم وادبارھم وذوقوا عذاب الحریق "اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں' مارتے ہیں ان کے منہ اور پیٹھ پر اور کہتے ہیں کہ چکھ جلنے کا مزا۔ اس آیت سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ کافروں پر موت کے بعد ہی سے عذاب شروع ہو جاتا ہے وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مارا ان کے منہ اور پیٹھ پر پڑتی ہے۔ مگر یہ منہ اور پیٹھ وہ نہیں ہے جو بے جان لاشہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے بلکہ اس آیت میں کافر کی روح کو جانور سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح جانور کو تیز ہنکاتے وقت کبھی آگے منہ پر اور پیچھے پیٹھ پر مارتے ہیں۔ اسی طرح کافر روح کو زبردستی فرشتے مارتے ہوئے اور ہنکاتے ہوئے لے چلیں گے اور کہیں گے کہ چل عذاب کا مزا چکھ۔ اسی طرح سورہ اعراف میں ہے۔"

"حتّٰی اِذَا جَاءَتھُم رُسُلُنَا یَتَوَفَّوھُم قالوا اَین مَاکُنتُم تدعُون

مِن دُونِ اللّٰہ قَالوا ضَلّوا عَنّاَ وَ شَھدوا علیٰ انفُسِھم اَنّھم کَانوا کافِرین ○ قَال ادخلوا فی امم قد خلت من قبلکم من الجن والانس فی النار۔

یہاں تک کہ جب جھٹلانے والوں کے پاس ہمارے فرشتے ان کی روحوں کو قبض کرنے کے لیے آئیں گے اور کہیں گے کہ کہاں ہیں وہ جن کو تم خدا کے علاوہ پکارتے تھے۔ تو اس وقت وہ مشرک کہیں گے کہ ہمارے وہ دیوتا ہم سے کنارہ کش ہو گئے ہیں اور انہوں نے اپنے اوپر گواہی آپ دی کہ وہ کافر تھے۔ تب خدا فرمائے گا کہ تم بھی ان لوگوں میں جا ملو جو جن و انس میں سے تم سے پہلے آگ میں جا چکے ہیں" اور جو لوگ ناموافق حالات کا بہانہ بنا کر اللہ کے دین پر چلنے سے کتراتے ہیں ان کے بارے میں سورہ نساء میں فرمایا۔ بے شک فرشتوں نے جن کی روحوں کو اس حالت میں قبض کیا کہ وہ جانوں پر ظلم کر رہے تھے وہ اس سے کہتے ہیں کہ تم کس حالت میں تھے۔ وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم ملک میں بے یار و مددگار تھے۔ وہ فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اپنا وطن چھوڑ کر باہر چلے جاتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے۔

برزخ کے حوالے سے اب ایک سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ برزخ میں ارواح انسانی کا مسکن کہاں ہو گا؟ قرآن پاک میں اس کا جواب متعدد آیات میں ملتا ہے۔ کافروں کے بارے میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی روحوں کو کائنات کی وسعتوں میں اس طرح آوارہ پھرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا کہ جیسے بے خانماں اور محروم لوگ پھرا کرتے ہیں۔ لیکن وہ جہاں بھی ہوں گے وہاں سے ہر وقت دوزخ کے نظارے کریں گے اور ہر وقت اللہ کے عذاب کا نقشہ ان کی نگاہوں کے سامنے رہے گا اور ایک عجیب عذاب کی کیفیت ان پر طاری رہے گی۔ لیکن جہاں تک پاکباز مومنوں کا تعلق ہے قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاً" تو ان کی موت ہی اس طرح واقع ہو گی کہ ایک طرف جان ان کے جسم سے نکالی جا رہی ہو گی اور دوسری طرف رحمت الٰہی کا فرشتہ مژدۂ جانفزا ان کے کانوں میں انڈیل رہا ہو گا۔ پھر ان میں بھی ایسی پاکباز اور

سعید روحیں ہیں جنہیں شہداء کہا جاتا ہے۔ انہیں خدا کی طرف سے ایک تمثالی جسم غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و عشرت کی لازوال دولت عنایت کی جائے گی۔ وہ اللہ کے یہاں خاص قسم کا رزق بھی پائیں گے اور خوشی و مسرت ہر دم ان کے ساتھ ہو گی اور اس مضمون کی متعدد آیات قرآن کریم میں موجود ہیں۔

# قیامت، احوال قیامت اور اس کے وقوع کے دلائل

محترم اساتذہ کرام اور عزیز طلباء!

افراد اور جماعتوں کو تو ہم ہر روز اپنی آنکھوں کے سامنے آخری سفر پر روانہ ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں اور ہمیں کسی حد تک یقین ہو جاتا ہے کہ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے مفر کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن اس سے بھی بڑی ایک حقیقت اور بھی ہے جسے ہم قیامت کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم ہے تمام دنیا اور تمام کائنات کا چشم زدن میں ختم ہو جانا اور پھر ایک مدت معینہ کے بعد از سر نو زندہ ہونا اور پھر اللہ کے حضور حساب کتاب کے لیے پیش ہونا اور حسب اعمال جزا و سزا کے مراحل سے گزرنا۔ موت تو کبھی اچانک آتی ہے اور کبھی دھیرے دھیرے بیماری کی شکل میں اپنا احساس دلا کے آتی ہے۔ اس لیے مرنے والا بالعموم پہلے سے اس سے کسی حد تک آگاہ ہوتا ہے اور پسماندگان بھی ذہنی طور پر اس صدمے کے لیے تیار ہوتے ہیں لیکن جہاں تک قیامت کے وقوع کا تعلق ہے وہ تو اس طرح کا حادثہ ہو گا کہ جس کو قرآن کریم کہتا ہے:

"وَمَآ اَمۡرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمۡحِ الۡبَصَرِ اَوۡ هُوَ اَقۡرَبُ"

"کہ وہ قیامت کا معاملہ آنکھ جھپکنے کی طرح ہو گا یا اس سے بھی جلدی"۔ قیامت کا آغاز صور اسرافیل سے ہو گا۔ اور یہ اس قدر اچانک ہو گا کہ خود حضرت اسرافیل کو علم نہیں کہ کب مجھے اس کے پھونکنے کا حکم دیا جائے گا۔ وہ تعمیل حکم کے لیے ہر دم مستعد کھڑے ہیں ایک حدیث میں حضرت

ابوسعید خدری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں مزے کی زندگی کیسے گزاروں؟ حالانکہ صور والے فرشتے نے صور منہ میں لے رکھا ہے اور اللہ کے حکم کی طرف کان لگا رکھا ہے اور پیشانی جھکا رکھی ہے اور اس انتظار میں ہے کہ کب صور پھونکنے کا حکم ہو جائے اور میں فوراً صور پھونک دوں۔ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تہائی رات باقی رہ جاتی تھی تو آنحضرت ﷺ فرماتے اے لوگو اللہ کو یاد کرو' اللہ کو یاد کرو۔ پہلا صور پھونکا جانے والا ہے اور اس کے بعد دوسرا پھونکا جائے گا۔ موت اپنی سختیاں لے کر آ پہنچی ہے۔

قرآن کریم میں دو دفعہ صور پھونکے جانے کا ذکر ہے۔ سورہ زمر آیت نمبر68 تا 69 میں ارشاد خداوندی ہے:

”وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَمَن فِي الْاَرضِ اِلَّا مَن شَاءَ الله ثم نُفِخَ فِيهِ اُخْرٰى فَاِذَاهُم قِيَامٌ يَّنظُرُون وَاَشْرَقَتِ الارضُ بِنُورِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الكِتَابُ وَجَائِى بِالنَّبِيِّين وَالشُّهَدَاءِ وَقُضِيَ بينهم بِالْحَقِّ وَهُم لَا يُظْلَمُونَ۔

ترجمہ = صور دو دفعہ پھونکا جائے گا۔ پہلی بار ارض و سما کی تمام مخلوق بے ہوش ہو جائے گی سوائے ان کے جنہیں خدا خود بچائے۔ دوسری مرتبہ تمام لوگ اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں گے۔ اس وقت اللہ کے نور سے زمین جگمگا اٹھے گی۔ نامہ اعمال کھل جائے گا۔ انبیاء اور شہداء کو حاضر کیا جائے گا۔ انہیں ان کی خدمات کا پورا پورا اجر ملے گا اور کسی سے ظلم نہیں کیا جائے گا۔

ان آیات سے صور اسرافیل کی کیفیات اور اس کا دو دفعہ پھونکا جانا معلوم ہوتا ہے لیکن سید قطب شہید نے سورہ یٰسین کی آیت نمبر48 تا 53 سے تین دفعہ صور اسرافیل کی تفصیل بیان کی ہے۔ ان آیات کا ترجمہ یہ ہے۔ ”وہ فرماتے ہیں کہ دین حق کی تکذیب کرنے والے پوچھتے ہیں کہ ”متٰی ھذا الوعدُ اِن کنتم صادقین“

اگر تم سچے ہو تو یہ وعدے کا دن کب آئے گا؟ ان کا جواب آنکھ

جھپکنے میں تیزی سے گزر جانے والا یہ منظر ہے۔ یہ لو۔ یہ صور پھونکنے کی ایک آواز ہی تو ہے کہ دفعۃً وہ انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ نہ تو اپنے اہل و عیال کو وصیت ہی کر پاتے ہیں اور نہ ان میں واپس لوٹ کر آ سکتے ہیں۔ بلکہ ان کے سامنے ان کے ہاتھوں میں موت کا پیالہ پی لیتے ہیں۔ صور کی پہلی آواز کے بعد قیامت کا پہلا منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ پھر دوسری بار صور کی آواز گونجتی ہے۔ دفعۃً وہ اپنی قبروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ خوف و دہشت کے عالم میں تیزی سے قدم بڑھاتے ایک دوسرے سے پوچھتے چلے جا رہے ہیں کہ ہمیں ہماری قبروں سے کس نے نکال باہر کیا۔ پھر آنکھیں ملتے ہوئے فضائے بسیط میں گونجنے والی اس حقیقت کا اعتراف اور اس کی توثیق کرتے ہیں۔ "ھذا ما وعد الرحمن و صدق المرسلون" ہاں یہ وہ دن ہے جس کا وعدہ رحمٰن نے کیا تھا اور جس کی تصدیق اس کے رسولوں نے کی تھی۔ آج قبروں سے نکل کھڑے ہونے کا سبب یہی ہے۔ پھر تیسری بار صور کی آواز گونجتی ہے۔

"فاذا ھُم جَمیعٌ لدینا محضرون"

ابھی فوراً وہ سب ہمارے حضور میں حاضر ہونے والے ہیں۔ لو دیکھو آنکھ جھپکنے میں پیشی کا بندوبست ہو گیا۔ لوگوں کی قطاریں لگ گئیں۔ سب کے سب مہر بلب شہنشاہ عالم کا اعلانِ عام کان لگا کر سن رہے ہیں کہ آج کسی کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہو گی۔ دنیا میں جو اعمال کرتے رہے تھے آج اس کی جزا دی جائے گی۔ یہاں کسی ناانصافی کا کوئی سوال نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے صور اسرافیل سے تمام کائنات کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ ہر مخلوق موت کا شکار ہو جائے گی سوائے اس کے جس کو اللہ بچانا چاہے اور دوسری دفعہ صور اسرافیل کے بعد از سرنو زندگی وجود میں آئے گی۔ لوگ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھیں گے اور حیرانی و پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ دیکھیں گے۔ پھر جب تیسرا صور پھونکا جائے گا تو تمام بارگاہ ایزدی میں حاضری کے لیے چل پڑیں گے۔ اور اللہ کی عدالت قائم ہو جائے گی

اور زندگی کے اعمال کا حساب کتاب شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے تغیرات اور مختلف مراحل میں پیش آنے والی کیفیات کا قرآن کریم میں متعدد جگہ ذکر فرمایا گیا۔ سورۃ الحاقہ میں نفخ اولی کے بعد کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا "فاذا انفخ فی الصّور نفخةً واحدةٌ و حملت الارضَ والجبال فَدُکّتا ذکّۃ واحدۃ وانشقّت السّماء فھیَ یومئذ واھیۃ والملکَ علیٰ ارجاءِ ھاو یَحملَ عرشَ ربِّک فوقھم یومئذ ثمانیۃ یومئذ تَعرَضُون لاتخفیٰ منکم خافیۃ۔

ترجمہ = جس وقت صور پھونکا جائے گا اور اللہ زمین کو پہاڑوں سمیت اٹھا کر یوں پٹخے گا کہ سب کچھ ریزہ ریزہ ہو جائے گا یہ ہو گی قیامت کہ اس روز آسمان پھٹ کر ڈھیلا ہو جائے گا۔ فرشتے اطراف آسمان پر جمع ہو جائیں گے۔ اور اللہ کے تخت کو آٹھ فرشتے اٹھا کر لائیں گے اس وقت تم اللہ کے سامنے پیش کئے جاؤ گے اور تم سے کوئی راز مخفی نہیں رہے گا۔

سورۃ القارعہ میں اس کی نقشہ کشی یوں کی گئی ہے کہ وہ متنبہ کرنے والی چیز، وہ کیا ہے متنبہ کرنے والی چیز؟ اور تم کو کس نے بتایا کہ کیا چیز ہے متنبہ کرنے والی؟ یہ وہ چیز ہے جب لوگ پریشان پروانوں کی طرح اور پہاڑ روئی کی گالوں کی طرح ہوں گے۔

سورۃ زلزال میں فرمایا گیا جب زمین خوب ہلائی جائے گی اور وہ اپنا بوجھ نکال دے گی اور انسان کہے گا زمین کو کیا ہو گیا ہے۔ اس دن وہ اپنی حالت بیان کرے گی۔

سورہ انشقاق میں فرمایا، جب آسمان پھٹ جائیں گے اور وہ اپنے مالک کی فرمانبرداری کریں گے اور وہ فرمانبرداری کے ہی لائق ہے جب زمین پھیلائی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے اگل دے گی اور خالی ہو جائے گی۔

سورۃ انفطار میں فرمایا گیا جب آسمان پھٹ جائیں گے اور جب ستارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر چلائے جائیں گے اور جب قبر کے لوگ زندہ کئے جائیں گے اس وقت روح نے جو کچھ پہلے اور پیچھے بھیجا ہے اس و

جان لے گی۔

سورۃ تکویر میں فرمایا جب آفتاب بے نور ہو جائے گا جب ستارے تاریک ہو جائیں گے جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔

سورہ المعارج میں فرمایا جب آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح اور جب پہاڑ روئی کے گالوں کی مانند ہو جائیں گے۔

سورہ ابراہیم میں فرمایا جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی۔ اور لوگ نکلیں گے اللہ کی طرف جو ایک ہے قہار ہے۔

سورہ قیامہ میں فرمایا گیا۔ روز قیامت کی قسم اور گناہ پر ملامت کرنے والے نفس کی قسم (یوم الحساب آ کر رہے گا) کیا انسان کا خیال یہ ہے کہ ہم اس کی بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ ترتیب نہ دے سکیں گے؟ کیا وہ جانتا نہیں کہ اس کے پوروں کو ترتیب دینے والے ہم ہی ہیں۔ انسان کی تمنا یہ ہے کہ وہ کچھ کرے اور اپنا مستقبل تباہ کر دے۔ اس لیے (طنزا") پوچھتا ہے کہ قیامت کب آئے گی؟ اسے کہو اس دن جب آنکھیں پتھرا جائیں گی۔ چاند سیاہ ہو جائے گا اور شمس و قمر اکٹھے کر دیئے جائیں گے۔ اس وقت انسان پوچھے گا ہے کوئی راہ فرار؟ ہرگز نہیں آج کوئی جائے پناہ نہیں۔ سب اللہ کے سامنے پیش کئے جائیں گے اور انہیں اگلے پچھلے اعمال کی خبر دی جائے گی۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے آپ کو اندازہ ہوا ہو گا کہ نفخ اولی کے بعد کس طرح کائنات کی ہر چیز شکست و ریخت کا شکار ہو گی اور کس طرح ایک ہمہ گیر تباہی جملہ مخلوقات اور ہر نئی روح کو اپنی گرفت میں لے لے گی اور یہ سب کس قدر اچانک چشم زدن میں ہو گا۔ ہر دور کی طرح آج بھی عقل کے پرستار اس تمام صورتحال کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور وہ اسے ناقابل وقوع اور خلاف عقل گردانتے ہیں۔ حالانکہ یہ صرف ان کی عقل کا پھیر اور عدم علم کا نتیجہ ہے۔ ہم یہاں نفخ اولی کے بعد کی مکمل تباہی پر چند شواہد اور بعض پیش یا افتادہ دلائل ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم نے قیامت کے پہلے مرحلے کو ایک زمینی زلزلے سے تعبیر فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"یاایھاالناس اتقواربکم ان زلزلۃ الساعۃ شئی عظیم"

اے لوگو اللہ سے ڈرو کہ قیامت کا زلزلہ نہایت ہولناک ہو گا۔ وہ زلزلہ جسے خود پروردگار ہولناک فرما رہا ہے اسی کی تباہ ناکی اور ہمہ گیری کا انسان کیا اندازہ کر سکتا ہے؟ ہم یہاں چھوٹے موٹے زلزلوں کو وقوع پذیر ہوتے دیکھتے ہیں اور ان کی تباہ ناکیوں سے چیخ اٹھتے ہیں۔ 1924ء کے زلزلہ جاپان میں 16 لاکھ نفوس ہلاک ہو گئے تھے اور 1935ء کے زلزلہ کوئٹہ میں 51000 اور ہماری قریبی تاریخ میں ایسے ہی کئی ہولناک زلزلے آ چکے ہیں۔ ہر زلزلہ ایک قیامت ہوتی ہے۔ اس سے بلندیاں پست اور پستیاں بلند ہو جاتی ہیں۔ دریاؤں کے رخ مڑ جاتے ہیں۔ کئی جزیرے ڈوب جاتے ہیں اور کئی نئے نکل آتے ہیں۔ بعض زلزلوں سے پہاڑ پھٹ جاتے ہیں اور ان سے ابلتے ہوئے لاوے کا ایک دریا بہہ نکلتا ہے اور انسان ان حادثات کے مقابلے میں اس قدر بے بس ہے کہ وہ آج تک انہیں روکنے کی کوئی سبیل نہیں سوچ سکا اور اسے یقین ہے کہ زمین کا مالک زمین کو تباہ کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ علماء زمین شناس کا نظریہ یہ ہے کہ آج سے لاکھوں سال پہلے جب زمین سورج سے الگ ہوئی تھی تو اس کا درجۂ حرارت سورج کے برابر تھا۔ یہ حرارت آج بھی بطن زمین میں موجود ہے۔ اور لاوے کا درجہ حرارت وہی ہے جو آغاز میں زمین کا تھا۔ یعنی بارہ ہزار فارن ہائیٹ۔ اب اگر کسی زلزلے سے سارا لاوا باہر آ جائے تو سطح زمین ایک کھولتے ہوئے جہنم میں بدل جائے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ زمین کی تباہی کے لیے اس کو پیدا کرنے والے نے کس قدر امکانات پیدا کر رکھے ہیں اور جہاں تک فضا' خلاء اور آسمانوں کا تعلق ہے اس کی تباہی بھی کوئی ایسی بات نہیں جو سمجھ میں نہ آنے والی ہو۔ خلاء میں کروڑوں بلین ستارے حیرت انگیز رفتار سے محو پرواز ہیں۔ ان میں سے بعض زمین سے دس گناہ اور بعض ایک کروڑ گنا بڑے ہیں۔ ان کا نظام پرواز اتنا مکمل ہے کہ آج تک کوئی ستارہ دوسرے سے متصادم نہیں ہوا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ طاقت جس نے ان ستاروں کو بنایا اور پھر ان کی راہیں متعین کیں اس بات پر

قادر نہیں کہ انہیں باہم ٹکرا دے اور سب کچھ تباہ کر دے؟ سائنس دان کہتے ہیں کہ نظام عالم کی پوری گاڑی جس انجن سے چل رہی ہے وہ گرم آفتاب ہے جس کی یہ گرمی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ اب سائنس دانوں نے اندازہ لگانا شروع کر دیا ہے کہ اس بات کا امکان ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب یہ انجن بالکل ٹھنڈا ہو جائے گا اور ساری گاڑی ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ اور یہ بات بھی سائنسدان کہتے ہیں کہ یہ پورا نظام کائنات جذب و کشش کے ستون پر قائم ہے اور یہ جذب و کشش بھی روز بروز مدھم پڑتی جا رہی ہے۔ چنانچہ ایک دن وہ بھی آئے گا کہ اس وقت تمام کرے ایک دوسرے کے قریب ہو کر ٹکرا جائیں گے اور یہ تصادم ان کو چور چور کر دے گا۔

یہ تو وہ حقائق ہیں جن کی بنیاد بہرحال مستقبل کے اندازوں پر ہے لیکن یہ بات تو امر واقعہ ہے کہ خود انسان کیسے کیسے تباہ کن آلات پیدا کر چکا ہے کہ انسان کی تباہی خود انسان کے ہاتھوں کوئی دور نظر نہیں آتی۔ انہی ایجادات میں جوہری بم کی ایجاد بھی شامل ہے۔ لارڈ ٹرنیڈ رسل نے اسی کے اندر دنیا کی مکمل تباہی دیکھ لی تھی۔ انہوں نے 1848ء کے موسم سرما میں بی بی سی ریڈیو سے تقریر نشر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر جوہری بم زیادہ تعداد میں پھینکے گئے (اور زمین پر جنگوں کا سلسلہ جاری رہا تو ظاہر ہے کہ پھینکے جائیں گے) تو بعض ماہرین طبیعات کا خیال یہ ہے (اور ان کی رائے واجب احترام ہے) کہ یہ بم تابکار پیدا کریں گے۔ جو ہوا سے گھل مل کر اڑتے اور ادھر سے ادھر گزرتے ہوئے زندگی کی ہر صورت کو ختم کر دیں گے اور چند سال بعد ہماری زمین انسانوں، جانوروں اور پودوں سے بالکل خالی ہو جائے گی۔ انہی برٹرنیڈ رسل نے (مذہب اور سائنس) میں ایک قدم آگے بڑھایا اور لکھا کہ وہ قوانین جو ترقی کے باعث ہوتے ہیں تنزل کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ ایک دن سورج سرد پڑ جائے گا۔ زمین پر حیوانی اور نباتاتی زندگی کی پوری تاریخ کچھ بہت گرم اور بہت سرد زمانوں کے بیچ کا ایک واقعہ ہے۔ مسلسل ارتقاء کوئی کلیہ نہیں بلکہ تنزل اور ترقی کا پنڈولم ادھر ادھر حرکت کر رہا ہے جس میں بلاشبہ کائناتی قوتوں

کے انتشار کی وجہ سے نیچے کی طرف ایک خفیف سا رجحان پایا جاتا ہے۔

## نفخ ثانی کے بعد کی کیفیت اور اس کے دلائل

دوسری مرتبہ صور اسرافیل پھونکے جانے کے بعد زندگی وجود میں آئے گی۔ لوگ اپنی اپنی قبروں سے اٹھیں گے اور اللہ کے اذن اور حکم سے میدان حشر کی طرف چل پڑیں گے۔ وہاں ان کے ہاتھوں میں ان کا نامہ اعمال دیا جائے گا۔ عقل کے پرستاروں کو جس طرح کائنات پر ایک ہمہ گیر موت کے طاری ہونے پر اعتراض ہے اسی طرح اس کے دوبارہ زندہ ہونے پر اور پھر نامہ اعمال میزان اور حساب کتاب پر بھی اعتراض ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے ان اعتراضات کی وجہ یہ نہیں ہے کہ علمی طور پر ان کے غلط ہونے کی کوئی دلیل ان کے ہاتھ آگئی ہے۔ بلکہ اس انکار کی وجہ سراسر بے علمی اور جہالت ہے۔

قرآن کریم کہتا ہے:

"بل کَذّبوَا بمالَم یُحیطوَ بعلمه"

کہ انہوں نے صرف اس لیے اس حقیقت کو جھٹلایا کہ ان کا علم اس کا احاطہ نہ کر سکا۔ اگر کسی چیز کا علم نہ ہونا اس چیز کے وجود پر انکار کی دلیل ہو سکتا ہے تو پھر اس انکار کی بھی کوئی علمی توجیہ ممکن ہے لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو قرآن کریم کہتا ہے کہ اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب تمہاری آنکھوں سے حجابات اٹھا لیے جائیں گے اور ہر حقیقت تمہارے سامنے جلوہ گر ہو جائے گی۔ اور کوئی راز راز نہ رہے گا۔ سورہ الکھف آیت 20 تا 22 میں فرمایا: وَنفخ فی الصّور ذلکَ یومُ الوَعید۔ وجاءَ کُلّ نفسٍ مَعَها سائقٌ و شہید۔ لقد کنتَ فی غفلةٍ من ھذا فکشفنا عَنکَ غطاءَ ک فبصَرُک الیوم حدید۔

ترجمہ = وہ صور پھونک دیا گیا۔ وہ وعدے کا دن طلوع ہو گیا۔ ہر فرد محشر میں اس حال میں آئے گا کہ اس کے ہمراہ ہانکنے والا ہو گا اور ایک گواہ بھی۔ تم اس صورتحال سے بے خبر تھے۔ سو آج ہم نے تمام حجابات اٹھا دیئے اور اب

تمہاری نگاہ بہت تیز ہو گئی ہے" نگاہ کی اس تیزی کا انتظار کرنا چاہیے۔ تاہم اگر غیر جانبداری سے غور کیا جائے اور علمی حدود کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو آج بھی بے شمار شواہد ایسے ہیں جو قیامت کے ایک ایک مرحلہ کی دلیل ہیں۔ ہم نہایت اختصار سے چند دلائل ذکر کرتے ہیں۔

1- مثلاً جو لوگ اللہ کی ذات اور اس کی صفات کے قائل ہیں وہ اس بات کا انکار نہیں کر سکتے کہ اللہ کی ایک صفت ہر چیز پر قادر ہونا ہے۔ یعنی وہ قدرت کاملہ کا مالک ہے۔ اب جو آدمی اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا یقین رکھتا ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ اسی نے اس کائنات کو اور اس کی ایک ایک مخلوق کو پیدا فرمایا ہے تو اس کے لیے اس بات کو ماننے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے کہ جو اس کائنات کا خالق ہے آخر وہ اس کو ہلاک کرنے اور پھر زندہ کرنے پر قادر کیوں نہیں؟

سورہ نازعات آیت نمبر 27 تا 33 میں فرمایا' کیا تمہاری تخلیق مشکل ہے۔ یا آسمان کی اللہ نے آسمان کو پیدا کیا اور اس نے چھت کو بلند کرنے کے بعد اس کو استحکام بخشا۔ رات کو تاریک اور دن کو روشن بنایا۔ اس کے بعد زمین کو بچھایا۔ ان میں سے پانی نکالا۔ چارہ پیدا کیا۔ اور پہاڑوں کو اس پر کھڑا کر دیا۔ یہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لیے ہے یعنی جو خالق و مالک ان تمام باتوں پر قدرت رکھتا ہے آخر وہ تمہاری دوبارہ ہمہ گیر موت اور دوبارہ زندگی پر قدرت کیوں نہیں رکھتا؟

سورہ نبی اسرائیل میں فرمایا۔

"وقالو اذا کُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًاءَ اِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ خلقاً جدیداً"

اور وہ بولے کہ جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو پھر کیسے نئے اٹھا کر بنائے جائیں گے۔ کیا یہ نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا وہ ان جیسے لوگوں کو دوبارہ بھی بنا سکتا ہے۔

سورہ روم میں فرمایا کہ خدا وہی ہے جو خلق کو آغاز کرتا ہے پھر اس کو دوبارہ خلق کرے گا اور یہ دوبارہ خلق کرنا اس کے لیے آسان ہے۔

سورہ یٰسین میں فرمایا:

"قال من یحی العظام وھی رمیم قل یحییھا الذی انشاھا معا اول مرۃ"

وہ بولے کون ان کھوکھلی و سڑی ہڈیوں کو زندہ کرے گا۔ آپ کہہ دیجئے وہی جس نے پہلی دفعہ ان کو بنایا۔

سورہ قیامہ میں ارشاد فرمایا:

"اَیَحسَبُ الانسَانُ اَن لَن نَجمَعَ عِظَامہ بلیٰ قَادِرِینَ علیٰ ان نُسَوِّیَ بَنَانَہ" "کیا انسان کا خیال یہ ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو پھر جمع نہ کر سکیں گے۔ ہم تو اس بات پر بھی قادر ہیں کہ چھوٹی ہڈیوں‘ ریشوں اور رگوں سے اس کی انگلیوں کے پورے بنا ڈالیں۔ یعنی جس پروردگار نے چھوٹی ہڈیوں‘ ریشوں اور رگوں سے ایسے پوروں کو ترتیب دیا ہے کہ جو آج بھی دستاویزی ثبوت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اربوں کھربوں انسانوں کی تخلیق کے باوجود کسی ایک انسان کے انگوٹھے کا نشان دوسرے انسان سے نہیں ملتا۔ جو خالق کائنات اس بات پر قادر ہے کیا وہ تمہیں دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے؟

2- پروردگار کی صفات کو ماننے والے اس کی صفت عدل کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ عدل کا ایک معنی ہے تلافیِ مافات۔ یعنی نقصان کو پورا کرنا۔ اس عدل کے بے شمار مناظر ہمارے سامنے ہیں۔ جب ہم کسی درخت کی شاخوں کو کاٹ دیتے ہیں تو نئی شاخیں ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔ جب ہم کسی جنگل کا کوئی ٹکڑا درختوں سے صاف کر دیتے ہیں تو وہاں نئے پودے اور بوٹیاں اگ آتی ہیں۔ جب تلوار وغیرہ سے کسی حصہ جسم کا گوشت کٹ جاتا ہے تو قدرت نیا گوشت بھر دیتی ہے۔ ہم کنویں سے کتنا ہی پانی نکالیں زمین کی رگوں سے اتنا ہی پانی اس میں آ جاتا ہے۔ یہ حقیقتِ عدل جو حیات کی ہر سطح میں پائی جاتی ہے اور جس پر ارض و سما کا نظام قائم ہے۔ اس عدل کا تقاضا ہے کہ جب ہم سے یہ دنیا چھن جائے تو ہمیں ایک اور ایسی دنیا ملنی چاہیے جہاں اس زندگی کی تمام ناانصافیوں

کی تلافی ہو۔ اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں جو لوگ انسانیت کے سب سے بڑے محسن رہے ہیں ان میں انبیاء بھی ہیں اور مصلحین امت بھی۔ وہ سب سے زیادہ ستائے گئے۔ انہوں نے انسان کو راہ راست دکھانے اور پنجۂ استبداد سے چھڑانے کے لیے بے اندازہ مصائب اٹھائے۔ لیکن اس کے بدلے میں جن پر انہوں نے احسان کیا ان کی طرف سے انہیں کیا ملا؟ کوئی سپردِ دار ہوا اور کوئی سپردِ نار۔ کسی کو قتل کیا گیا تو کسی کو زندہ دیوار میں چن دیا گیا۔ انہیں اس زندگی میں سوائے مصیبتوں اور تکلیفوں کے کچھ نہیں ملا۔ بقول شاعر

زمانہ یونہی اپنے محسنوں کو تنگ کرتا ہے
وہ درسِ صلح دیتے ہیں یہ ان سے جنگ کرتا ہے

اور ان کے مقابلے میں وہ لوگ جنہوں نے انسانیت کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی وہ دنیا میں ظلم و استبداد کی علامت بن کر رہے اور جنہوں نے خالق کائنات کے مقابلے میں اپنی ربوبیت کا صور پھونکا۔ وہ ہمیشہ عیش و عشرت کی زندگی گزارتے اور زندگی کی نعمتوں سے فیضاب ہوتے رہے۔ آپ نے پڑھا ہو گا کہ جب چنگیز کے پوتے ہلاکو خان نے 1258ء میں بغداد پر حملہ کیا تھا تو وہاں سات دن میں 19 لاکھ شہری موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ ہلاکو اور اسی نوع کے دیگر قذاقوں اور قاتلوں کو ان جرائم کی سزا کیا ملی؟ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بیوہ کا اکلوتا بیٹا جو اس کے بڑھاپے کا سہارا تھا کسی قاتل کی گولی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ باقی زندگی پولیس کے چکر کاٹتی‘ دربدر ٹھوکریں کھاتی اور شب و روز آنسو بہاتی گزار دیتی ہے۔ اولا” تو اس کے قاتل پکڑے نہیں جاتے اور پکڑے بھی جائیں تو انہیں سزا نہیں ملتی۔ وہ رات دن یہ کہہ کہہ کر تخت الٰہی کو ہلاتی رہتی ہے۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مظلوم کے اوقات

اور پھر کتنے لوگ ایسے ہیں جو تخت اقتدار پر بیٹھ کر لاکھوں آدمیوں کی محرومیوں کا باعث بنتے ہیں یا ان کے قتل کا سبب ٹھہرتے ہیں۔ اور کتنے ایسے

تخریب کار ہیں جو گاڑی کی پٹڑی اکھاڑ کر یا بم پھینک کر سینکڑوں اور ہزاروں آدمیوں کو لقمہ اجل بنا دیتے ہیں۔ اولا” تو ان کو سزا نہیں ملتی اور اگر ملتی بھی ہے تو ان کی ایک جان سینکڑوں اور ہزاروں جانوں کا عوض تو نہیں بن سکتی۔ ایک جان تو ایک جان کا بدلہ ہو سکتی ہے۔ باقیوں کا بدلہ کون دے گا؟ اگر اللہ عادل ہے اور عدل اس کی صفت ہے تو اسی صفت عدل کا تقاضا ہے کہ ایسی دنیا ہونی چاہیے اور ایک ایسی عدالت قائم ہونی چاہیے جہاں انسانیت کے محسنوں اور قاتلوں کو اپنے اپنے کیئے کا بدلہ ملے۔ محسن لافانی مسرتوں سے ہمکنار ہوں اور مجرم قہرو عذاب کا شکار ہوں۔

3- امریکہ کے مشہور فلسفی ولیم جیمز آغاز میں آخرت کے منکر تھے لیکن بڑھاپے میں معتقد ہوگئے۔ دلیل یہ دی کہ انسان بڑھاپے میں علم و دانش کی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے اور ایک نیا شعور حاصل کرلیتا ہے اللہ ان باکمال لوگوں پر زندگی کا دروازہ بند نہیں کرے گا۔ ایسی اقالیم ہونی چاہیں جہاں یہ اپنی صلاحیتوں کو کام میں لا کر نئی بلندیوں کو سر کر سکیں۔ یہ بلندیاں اس خفیہ براعظم میں ہیں جو ہمارے حاشیۂ خیال سے پرے واقع ہے۔ انسان میں بقا کی آرزو فطری ہے۔ اس مقصد کے لیے کوئی کتابیں لکھتا ہے، کوئی عمارات اور تصاویر بناتا ہے کوئی عبادت کرتا ہے اور کوئی گیت تراشتا ہے۔ کائنات میں بے اندازہ معقولیت ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ موت کی ایک پھونک سے شمع حیات گل ہو جائے گی یا انسان چند جملے بول کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گا۔ بہت نامعقول سی بات ہے۔

4- ہم ہر روز اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں کہ موسم گرما یا موسم سرما میں اگر بارش برسنے میں دیر ہو جائے تو ایسے لگتا ہے کہ ہر چیز اپنی موت آپ مرگئی۔ زمین سبزے سے محروم ہو جاتی ہے۔ جوہڑوں میں پلنے والی مخلوق یعنی مینڈک وغیرہ ختم ہو جاتے ہیں۔ زمین پر اٹھتی ہوئی دھول اس وقت موت کی غماز بن جاتی ہے۔ پھر اچانک ہم دیکھتے ہیں کہ گھٹا اٹھتی ہے برستی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین سبز مخمل کی وردی پہن لیتی ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ زندگی

از سر نو وجود میں آئی ہے اور مردہ زمین زندہ ہو گئی ہے۔ تو جو پروردگار مردہ زمین کو بارش کی چند چھینٹوں سے نئی زندگی عطا فرما سکتا ہے وہ انسانوں اور حیوانوں کو دوبارہ زندہ کیوں نہیں کر سکتا؟ یہی بات سورہ فاطر آیت نمبر 9 میں فرمائی گئی:

”وَاللّٰهُ الَّذِی اَرسَلَ الرِّیَاحَ فَتُثِیرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحیَینَا بِهِ الاَرضَ بَعدَ مَوتِهَا کَذٰلِکَ النُّشُورُ“

اللہ وہ ہے جو ہواؤں کو بھیج کر پہلے بادل بناتا ہے اور پھر ہانک کر کسی مردہ بستی کی طرف لے جاتا ہے پھر ہم مردہ زمین کو اس سے زندہ کرتے ہیں اور قیامت کے دن مردے بھی اسی طرح زندہ ہوں گے۔

5- کائنات کی سب سے بڑی حقیقت تغیر اور اختلاف حالات ہے۔ کوئی چیز یہاں ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ مسلسل ارتقاء یا مسلسل تنزل یہاں کی حقیقت نہیں۔ عروج اور زوال دو ایسی حقیقتیں ہیں جن کی افراد اور قوموں میں ہمیشہ رونمائی ہوتی رہتی ہے۔ موسم بدلتے ہیں صبح و شام میں تبدیلی آتی ہے۔ یہ سب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہاں قرار کسی چیز کو نہیں۔ بلکہ ثبات اور قرار اگر کسی کو ہے تو بقول شاعر:

”ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں“

یہ تغیر اور عدم ثبات دراصل اس بات کی دلیل ہے کہ ثابت اور قائم رہنے والی ذات صرف ایک ہے جس کی صفت الحیؑ' اور القیوم ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اسی کی ذات کو دوام ہے اور ثبات ہے۔ باقی ہر چیز اس کی ذات اور اس کے قانون کی گرفت میں ہے اس کا قانون یہ ہے کہ وہ ہر دم چیزوں کو' افراد کو' اور قوموں کو تغیر کا شکار کرتا رہتا ہے۔

اگر یہ واقعی ایک حقیقت ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ کائنات کی یہ زندگی ہمیشہ کے لیے رہے اور پھر جب اس زندگی پر موت کا پردہ چھا جائے تو یہ

پردہ کبھی تار تار نہیں ہونا چاہیے یعنی یہاں نہ تو زندگی کو ثبات ہے اور نہ موت کو ثبات ہوگا۔ جس طرح یہاں ہر صبح شام میں ڈھل جاتی ہے اسی طرح ہر شام بھی دوام کا مقدر لے کر نہیں آئی بلکہ اللہ کے قانون کے مطابق ضرور صبح طلوع ہوتی ہے۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب اس صبحِ حیات پر موت کی رات طاری کر دی جائے گی تو پھر ایک ایسا وقت آئے گا جب پھر اس کی صبح طلوع ہوگی کیونکہ اس زندہ اور قائم رہنے والی ذات کی اصل صفت زندگی ہے اور چونکہ روح اس کا امر ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس روح کو ہمیشہ کی زندگی نصیب نہ ہو اور یہ زندگی چونکہ قیامت کے بعد ہوگی اس لئے اس کا لازمی تقاضا ہے کہ قیامت بھی ضرور برپا ہو۔ یہی بات اقبال مرحوم کہتے ہیں:

جوہرِ ہستی عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں
یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

6- بلکہ اگر مزید غور کیا جائے تو خود انسان کا جسم اس بات کی دلیل ہے کہ قیامت ایک حقیقت ہے کیونکہ قیامتِ صغریٰ یعنی موت و حیات کی کش مکش اور حشر و نشر خود انسان کے جسم کے اندر برپا رہتا ہے۔ میڈیکل سائنس کہتی ہے کہ انسانی جسم کے ترکیبی اجزاء کو خلیہ (سیل) کہتے ہیں۔ ایک اوسط درجے کا جسم اندازا" 26 ارب ملین خلیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ورزش‘ صحت اور مطالعہ سے یہ خلیے ٹوٹتے اور ان کی جگہ نئے خلیے بنتے رہتے ہیں۔ ماہرین ابدان کا اندازہ یہ ہے کہ ہر دس سال کے بعد جسم کی مکمل تجدید ہو جاتی ہے۔ پرانے خلیے مرجاتے ہیں اور ان کی جگہ اور نئے خلیے لے لیتے ہیں۔ جو شخص یہاں عمر کے ستر سال گذارتا ہے وہ گویا سات مرتبہ مرچکا ہوتا ہے۔ لیکن موت کے ان مسلسل حملوں کے باوجود وہ زندہ رہتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ موت کے آخری حملے کے بعد بھی وہ زندہ رہے۔

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے،
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

7- قرآن کریم نے بعض ایسی تاریخی شہادتیں بیان فرمائی ہیں جو بعث بعد الموت یعنی دوبارہ جی اٹھنے پر مضبوط دلائل فراہم کرتی ہیں اور پھر یہ واقعات ایسے ہیں کہ تمام آسمانی مذاہب اس کی تصدیق بھی کرتے ہیں۔ حضرت عزیز علیہ السلام جو بنی اسرائیل کے ایک جلیل القدر نبی گذرے ہیں بلکہ بنی اسرائیل کی تباہی اور تورات کے جلائے جانے کے بعد انہوں نے تجدید و احیائے دین کا زبردست کارنامہ انجام دیا۔ ان کے بارے میں قرآن سورہ بقرہ آیت نمبر258 میں بتاتا ہے کہ حضرت عزیز علیہ السلام کا گذر ایک ایسی بستی پر ہوا جو مکمل تباہ ہو چکی تھی انہوں نے اسے دیکھ کر (شائد دل میں کہا) یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے اسے اللہ تعالیٰ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا۔ اس پر اللہ نے ان کی روح قبض کرلی اور وہ سو برس تک مردہ پڑے رہے۔ پھر اللہ نے انہیں دوبارہ زندگی بخشی اور ان سے پوچھا کہ کتنی مدت یہاں پڑے رہے ہو۔ انہوں نے کہا کہ ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا۔ پروردگار نے فرمایا تم پر سو برس اسی حالت میں گذر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا اور دوسرا اپنے گدھے کو بھی دیکھو (جس پر وہ سوار ہو کر آئے تھے کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہوگیا ہے) اور یہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں۔ اس طرح جب حقیقت ان کے سامنے بالکل نمایاں ہوگئی تو انہوں نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ یعنی اس طرح حضرت عزیر علیہ السلام کو زندگی اور موت کے مرحلے سے گذار کے آنے والی دنیا کے لیے ایک نشانی بنا دیا گیا اور یہ واضح کر دیا گیا کہ میری قدرت کے سامنے یہ بات کوئی مشکل نہیں کہ ایک جیتے جاگتے انسان کو اچانک موت دے دوں اور پھر سو برس کے بعد اسے زندہ کر دوں اور اس سو سال کے عرصہ میں اس کے کھانے پانی کو باسی تک نہ ہونے دوں اور اس کے گدھے کی ہڈی ہڈی الگ کر دوں اور پھر دوبارہ اس پر گوشت

پوست چڑھا کر اس کو جیتا جاگتا اٹھا کھڑا کروں۔ یہ سب میری قدرت کے کرشمے ہیں۔ اس سے تم اندازہ کرسکتے ہو کہ تمہیں مارنے اور پھر دوبارہ زندہ کرنے پر پروردگار ہر طرح قادر ہے۔

8- البقرہ آیت نمبر 26 میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا کہ پروردگار مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے تو اس پر پروردگار نے حکم دیا کہ تم چار پرندے لے لو اور ان کو اپنے سے مانوس کرلو۔ پھر ان کے اجزاء کاٹ کر ان کا ایک ایک جزو ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو۔ پھر ان کو پکارو وہ تمہارے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ اور جب ایسا ہو جائے تو خوب جان لو کہ اللہ نہایت غالب اور حکمت والا ہے۔ یعنی اس دنیا میں رہتے ہوئے ہمارے لیے ممکن تو نہیں ہے کہ زندگی اور موت کا راز پالیں لیکن ان واقعات سے صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ اللہ ہر چیز پر غالب ہے اور وہ اپنی حکمت و دانش کے مطابق زندگی اور موت کے فیصلے کرتا ہے۔

9- اس طرح قرآن کریم میں سورہ الکھف میں چند نوجوانوں کا ذکر کیا گیا ہے جو تاریخ میں اصحابِ کہف کے نام سے مشہور ہیں جو کہ تقریباً” تین صدیوں تک غار میں سوئے رہے پھر انہیں نیند سے جگایا گیا لوگوں سے ملے پورے شہر کے لوگ اکٹھے ہو کر انہیں دیکھنے آئے۔ شہر کے حکمران نے ان سے ملاقات کی پھر وہ اپنے غار میں جا کر سوگئے اور بعد والوں نے یادگار کے طور پر غار کے دھانے پر ایک مسجد تعمیر کردی اور مورخین کی شہادت کے مطابق آج بھی ان کے آثار زندہ ہیں۔ نئی تحقیق کے مطابق اردن میں عمان شہر کے قریب ایک پہاڑ پر یہ غار دریافت ہوگیا ہے یہ غار عمان شہر سے سات کلو میٹر جنوب میں واقع ہے اور اردن کی مرکزی شاہراہ جو عقبہ سے عمان تک گئی ہے اس سے اس کا فاصلہ تین کلومیٹر ہے۔

یہ حیرت انگیز واقعہ بجائے خود اس بات کی کتنی بڑی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اسباب کی اس دنیا میں اگر چاہے تو بغیر کسی سبب کے چند نوجوانوں کو صدیوں تک سلائے رکھ سکتا ہے اور پھر انہیں زندہ اٹھا کر لوگوں پر حجت تمام کر

سکتا ہے اور یہ پورا واقعہ اسی شہر میں پیش آیا تھا جس شہر کے رہنے والے دوبارہ اٹھنے یا نہ اٹھنے یعنی قیامت کے حق و باطل ہونے میں بری طرح جھگڑ رہے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اس طریقے سے قیامت کے برحق ہونے پر ان پر ایک حجت تمام کر دی اور قرآن کریم نے اسے بیان فرما کر قیامت تک آنے والوں کے لیے قیامت کے سمجھنے کو آسان کر دیا۔ قرآن کریم کہتا ہے کَذالک اعثَرنَا عَلَیھم لِیَعلَمُوا اَنَّ وَعدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَۃَ لاریب فیھا اس واقعۂ اصحاب کہف سے ہم نے انہیں صرف اس لیے آگاہ کیا تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔

10- قیامت کے وقوع پر اگر ہم ایک اور حوالے سے غور کریں تو پھر قیامت کے وجود کو تسلیم کرنا نہ صرف مذہبی فریضہ ٹھہرتا ہے بلکہ عقل اور اخلاق کا تقاضا بھی بن جاتا ہے۔ کیونکہ انسان کی اجتماعی زندگی میں حسنِ عمل کا سرمایہ یا اخلاقی زندگی کا بیش بہا خزانہ صرف اس وقت تک موجود ہے اور رہے گا جب تک انسان میں ایک بات کا تصور زندہ رہے گا وہ یہ کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں یا جو کچھ کروں گا میرا ہر عمل اپنی مکافات بھی رکھتا ہے۔ جس طرح میں اس کائنات کا ایک حصہ ہوں اسی طرح میرے اعمال بھی اس کائنات کے باقی حقائق کی طرح ان کا ایک حصہ ہیں۔ جس طرح اللہ کا قانون یہاں ہم کارفرما دیکھتے ہیں کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے اور ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ ہے۔ ممکن نہیں جہاں کوئی شے اپنا وجود رکھتی ہے وہ اثرات و نتائج کے سلسلہ سے باہر ہو۔ پس جس طرح خدا نے اجسام و مواد میں خواص و نتائج رکھے ہیں یعنی آگ جلاتی ہے، پانی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے، سنکھیا کھانے سے موت اور دودھ پینے سے طاقت آتی ہے۔ کونین سے بخار رک جاتا ہے۔ اسی طرح اعمال میں بھی خواص و نتائج ہیں۔ اور جس طرح جسم انسانی کے قدرتی انفعالات ہیں اسی طرح روح انسانی کے لیے بھی قدرتی انفعالات ہیں۔ جسمانی موثرات جسم پر مرتب ہوتے ہیں اور معنوی موثرات میں روح متاثر ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ ہم اجسام و مواد کے خواص و نتائج کو دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں تو ہمیں ان کے خواص و نتائج پر

بھی شبہ نہیں ہوتا مثلاً" ہم گیہوں بوتے ہیں تو ہمارے دل میں یہ خدشہ کبھی نہیں گذرتا کہ گیہوں پیدا نہ ہوگا اور اگر ہم سے کوئی کہے کہ ممکن ہے گیہوں کی جگہ جوار پیدا ہو جائے تو ہم اسے پاگل سمجھیں گے۔ اس لئے کہ فطرت کے قانونِ مکافات کا یقین ہماری طبیعت میں راسخ ہو چکا ہے اور ہمیں یہ کبھی وہم و گمان بھی نہیں گذرتا کہ فطرت گیہوں لے کر اس کے بدلے جوار دے دے گی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہم یہ بھی ماننے کو تیار نہیں ہوتے کہ اچھی قسم کا گیہوں لے کر فطرت بری قسم کا گیہوں دے سکتی ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ بدلہ دینے میں قطعی اور شک و شبہ سے بالاتر ہے لیکن اعمال کے قدرتی خواص و نتائج جنہیں سزا و جزا سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی اچھے اعمال کا نتیجہ اچھائی ہے۔ جس پر ثواب ملے گا اور برے اعمال کا نتیجہ برائی ہے جس پر عذاب ملے گا اور پھر اچھے اعمال کے نتیجے میں اچھے اعمال برگ و بار لائیں گے تو انسانی معاشرت میں صحت مند توانائی بروئے کار آئے گی۔ اور انسانی زندگی خوشحالی اور اعتدال سے ہم آہنگ ہوگی اور اگر برائی کریں گے تو اس کے نتیجہ برائی ہوگا اور اس کے رد عمل کے طور پر برائی پھیلے گی اور معاشرہ غیر صحت مند صورت حال کا شکار ہو کر تباہی اور بربادی کا راستہ اختیار کرے گا۔ یہ چیزیں چونکہ ہمیں آنکھ سے دکھائی نہیں دیتیں اور اس کے لیئے گہرے غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے ہمیں ان باتوں کا یقین نہیں آتا۔ پروردگار ہمیں یہ بتاتا ہے کہ قیامت اصلاً" یوم الدین ہے اور دین کا معنی ہے جزا اور سزا' بدلہ اور مکافات اور یوم الدین کا معنی ہوگا جزا اور سزا اور بدلہ اور مکافات کا دن۔ یعنی یہ دن ہم نے اس لئے رکھا ہے تاکہ تمہیں اس بات کا اندازہ ہو کہ تم دنیا میں اچھی زندگی گذارنے اچھائیوں کو سپورٹ کرنے' اچھائیوں کو فروغ دینے' اچھائیوں کو سر بلند کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو اور یہ تمہارے اعمال دنیا میں بھی اپنے اثرات و نتائج رکھتے ہیں۔ جس سے ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آتا ہے اور آخرت میں انہی اعمال کے حوالے سے ہم تمہیں جزا و سزا دیں گے۔

نزول قرآن سے پہلے پیروانِ مذہب کا عالم گیر اعتقاد یہ تھا کہ جزا و سزا

محض خوشنودی اور اس کے قہر و عذاب کا نتیجہ ہے اعمال کے نتائج کا اس میں دخل نہیں۔ الوہیت اور شہنشاہیت کے تشابہ سے تمام مذاہب دیگر تصورات کی طرح اس معاملہ میں بھی گمراہی فکر کے مرتکب ہوئے تھے۔ لوگ دیکھتے تھے کہ ایک مطلق العنان بادشاہ کبھی خوش ہو کر انعام و اکرام دینے لگتا ہے کبھی بگڑ کر سزائیں دینے لگتا ہے اس لئے خیال کرتے تھے کہ خدا کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ وہ کبھی ہم سے خوش ہو جاتا ہے کبھی غصہ و غضب میں آجاتا ہے طرح طرح کی قربانیوں اور چڑھائیوں کی رسم اسی اعتقاد سے پڑی تھی۔ لوگ دیوتاؤں کا جوش غضب ٹھنڈا کرنے کے لیے قربانیاں کرتے اور ان کی نظرِ التفات حاصل کرنے کے لیے نذریں چڑھاتے۔ لیکن قرآن کریم نے جزاء و سزا کا اعتقاد ایک دوسری ہی شکل و نوعیت کا پیش کیا ہے۔ وہ اسے خدا کا کوئی ایسا فعل قرار نہیں دیتا جو کائنات ہستی کے عام قانونی نظام سے الگ ہو۔ بلکہ اسی کا ایک قدرتی گوشہ قرار دیتا ہے۔ اب آپ اندازہ فرمایئے کہ اس حقیقت کو جو اوپر بیان کی گئی ہے اگر نظرانداز کر دیا جائے اور جس کا نتیجہ بہ ہر صورت قیامت کا وجود ہے تو کیا دنیا میں نیکی اور بدی کا تصورِ امتیاز باقی رہ سکتا ہے۔ پھر تو اچھائی اور برائی یکساں ہو جائیں گی اور نیک اور بد برابر ٹھہریں گے۔ اس کو قرآن کریم کہتا ہے:

> "اَمْ حَسِبَ الَّذِینَ اجْتَرَحُوا السَّیِّآتِ اَن نَّجعَلَھُم کَالَّذِینَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَواءً مَّحیاھم وَ مَمَاتَھُم سَاءَ مَا یَحْکُمُوْن وَخَلَقَ اللّٰہُ السَّماوات والارض بِالحقِ لِتُجزیٰ کل نفس بما کست وھم لا یظلمون
>
> "جو لوگ برائیاں کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں ہم انہیں ایسے لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان رکھتے ہیں اور جن کے اعمال اچھے ہیں۔ دونوں برابر ہو جائیں گے۔ زندگی میں اور موت میں بھی؟ اگر ان لوگوں کی فہم و دانش کا یہی فیصلہ ہے

> تو افسوس ان کے اس فیصلے پر اور اللہ نے زمین اور آسمان کو بے کار اور عبث نہیں بنایا بلکہ حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہے اور اس لئے بنایا ہے کہ ہر جان کو اس کی کمائی کے مطابق بدلہ ملے اور یہ بدلہ ٹھیک ملے گا۔ کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

یہ صحیح ہے کہ اسلامی زندگی کے برپا ہونے سے کسی حد تک دنیا میں بھی ایسا ہوگا لیکن حقیقی جزا و سزا کی مکمل صورت صرف قیامت کی شکل میں وجود میں آئے گی۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

> "ان الساعة آتیة اکاد اخفیھا لتجزی کل نفس بما تسعی"

> "قیامت یقیناً آنے والی ہے میں نے اسے مخفی رکھا ہے تاکہ ہر نفس کو اس کی سعی و کاوش کا بدلہ دیا جائے۔

مختصر یہ کہ جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور جب وہ یہاں پر وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ غرور اور خاکساری، بخل اور فیاضی، انتقام اور عفو، شجاعت اور بزدلی، تقویٰ اور فسق، ایمان اور کفر ہر ایک کا ایک نہ ایک اثر و نتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص و لوازم ہیں جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح سنکھیا سے سمیت، شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی اور ان معنوی روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی، مادی اور طبعیاتی اشیاء میں ہے اب کوئی وجہ نہیں کہ ہم جسمانی مادی اور طبعیاتی اشیاء کے علت و معلول کے رشتے کو جانیں اور اس پر یقین بھی کریں لیکن قیامت جو اس کا منطقی نتیجہ اور عقلی تقاضا ہے اس کو سمجھنے سے انکار کر دیں اور اس پر اشتباہات وارد کریں۔

# نفخِ ثانی کے بعد کی تفصیلات

معزز اساتذہ کرام اور عزیز طلباء و طالبات

گذشتہ گفتگو میں آپ نے قیامت کے احوال کی تفصیل اور اس کے واقع ہونے کے دلائل سماعت فرمائے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ قیامت کے دوسرے مرحلے کے وقوع پذیر ہونے کے بعد جب از سر نو زندگی کی ہماہمی شروع ہو گی اس وقت کی کیفیات اور اس کی تفصیلات کا ذکر کروں۔ آپ نے یہ سنا ہوگا کہ انسان اپنی قبروں سے جسموں سمیت اٹھائے جائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ان کے یہ جسم جن کے ساتھ وہ میدان حشر میں پہنچیں گے کیا وہی ہوں گے جو انہیں دنیا میں دیئے گئے تھے۔ یا یہ اجسام اور ہوں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ اجسام وہ نہیں ہوں گے جو دنیا میں انہیں دیئے گئے تھے بلکہ یہ اجسام ان کے اعمال کے ظل اور عکس ہوں گے یعنی جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی ان کو جسم عنایت ہوں گے چنانچہ اس دنیا کے جسمانی رنگ کے لحاظ سے خواہ کوئی کالا ہو یا گورا مگر اس دنیا میں اس کا یہ کالا پن اور گورا پن اعمال کی سیاہی اور سفیدی کی صورت میں بدل جائے گا۔ قرآن کریم سورہ عبس میں کہتا ہے:

"وُجُوہ یَوَمئذ مّسفرۃٌ ضاحِکَۃ مّستبشرۃ و وُجُوہ
یومئذ عَلَیھا غَبَرۃ تّرھَقُھا قَترۃ"

کتنے چہرے اس دن روشن، ہنستے اور شاد ہوں گے اور کتنے

چہروں پر کدورت ہوگی اور ان پر سیاہی چھائی ہوگی۔

سورہ آل عمران آیت 11 میں فرمایا گیا:

> "یَومَ تَبیَضُّ وُجوہٌ وَّ تَسوَدُّ وُجوہٌ فَاَمَّا الذین اسوَدَّت وجوھم اَکفرتُم بعدَ ایمانکم فذُوقوا العذابَ بماکُنتُم تَکفُرُون واَمَّا الذین ابیَضَّت وُجوھُم ففی رَحمۃِ اللہِ ھُم فیھا خالدُون○
>
> اس دن کتنے چہرے سفید ہوں گے اور کتنے کالے۔ لیکن جن کے چہرے کالے ہوئے (ان سے پوچھا جائے گا کیا تم وہ ہو جو ایمان کے بعد کافر ہو گئے تھے تو اپنے کفر کے بدلے عذاب کا مزا چکھو۔) جن کے چہرے سفید ہوئے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

صحیح احادیث میں ہے کہ جنت میں سب لوگ جوان بن کر داخل ہوں گے اور ان کے جسم پر کبھی بڑھاپا نہیں آئے گا ان کا قد حضرت آدم علیہ السلام کے اولین بہشتی قد کے مطابق ہوگا۔ دوزخیوں میں سے کسی کا سر پہاڑ کے برابر ہوگا اور کسی کا ایک پہلو مفلوج ہوگا۔ کسی کے ہونٹ لٹکے ہوں گے دل کے اندھے، آنکھوں کے اندھے بن کر اٹھیں گے۔ سزاؤں کے بعد جب ان کے جسم چوز چور ہو جائیں گے تو پھر صحیح اور سالم نئے جسم نمودار ہوں گے اور پھر ان کی وہی کیفیت ہوگی یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ جو اپنے آپ کو بڑے سمجھتے ہیں وہ چیونٹی بن کر قیامت میں اٹھیں گے۔

ان تمام شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دنیا کے جسمانی قالب ہمارے اس دنیاوی جسم کے مطابق نہیں بلکہ ہمارے دنیاوی اعمال کے مطابق ہوں گے۔ اب انسانوں کو اس میدان میں لے جایا جائے گا جہاں اللہ کی عدالت ہوگی اور ان کے سامنے وہ مرحلہ درپیش ہوگا جس کے لیے قیامت برپا کی گئی یعنی ان کا حساب کتاب شروع ہوگا۔ نیک لوگ اپنے اچھے اعمال کی جزا پائیں گے اور برے لوگوں کو اپنے برے اعمال کی سزا ملے گی۔ اس حساب و کتاب کے سلسلہ

میں جو باتیں قرآن و سنت سے واضح ہوتی ہیں ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ ہر آدمی کو اس کا نامۂ عمل دیا جائے گا اور وہ نامۂ عمل ایسا ہوگا جس میں کوئی چھوٹی بڑی بات چھوٹنے نہیں پائے گی بلکہ وہ اس کی زندگی کا روزنامچہ ہوگا جس میں ایک ایک لمحے کی تفصیل موجود ہوگی۔

قرآن کریم سورہ کہف آیت 6 میں کہتا ہے:

"وَوَضِعَ الکِتَابُ فَتَرَی المُجرِمِینَ مُشفِقِینَ مِمَا
فیہ وَیَقُولُونَ یُوَیلَتِیٖ مالھذا الکِتاب لَا یُغَادِرُ
صغیرۃً ولا کبیرۃً الَّاَاَحصَا ھَا و وجدُوامَا عمِلوا
حَاضِرا ولاَ یظلِمُ رَبُّکَ احدًا

اور نامہ اعمال رکھ دیا جائے گا پس تو گنہگاروں کو دیکھے گا کہ اس میں جو کچھ لکھا ہوگا اس سے وہ ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے کہ ہائے افسوس اس نامہ اعمال کو کیا ہے کہ چھوٹی بڑی بات تک نہیں چھوڑتا۔ بلکہ اس کو شمار کرتا ہے اور جو کچھ انہوں نے زندگی میں کیا اس کو وہ سامنے پائیں گے۔ اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔"

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نامہ عمل کیا ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ زندگی میں گزارا ہوا ایک ایک لمحہ اپنی تفصیل سمیت زندہ رہے اور قیامت کے دن ہر آدمی کے حق میں یا اس کے خلاف پیش کیا جائے۔ اس کے بارے میں چند باتیں بالکل واضح ہیں۔

1- ہمیں قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ انسان کی زبان سے جب کوئی لفظ نکلتا ہے یا جب وہ کوئی عمل کرتا ہے خواہ یہ قول یا عمل کتنا ہی تنہائی میں وقوع پذیر کیوں نہ ہوا ہو اللہ کے مقرر کردہ فرشتے ہر وقت موجود ہوتے ہیں جو اسے سن کر یا دیکھ کر محفوظ کر لیتے ہیں۔

سورہ کہف میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

"اِذ یَتلقَّی المُتلقِیَانِ عَنِ الیَمِینِ وعَنِ الشِّمالِ

قعیدہ مَا یَلفظُ من قَولٍ اِلَّا لَدَیہِ رَقِیبٌ عتید

کہ اس وقت کو یاد کرو کہ جب دو لینے والے دائیں اور بائیں بیٹھے محفوظ کر رہے ہوتے ہیں۔ اور بولنے والا کوئی بات نہیں بولتا مگر نگران اس کے پاس حاضر رہتا ہے۔ یعنی اس طرح دو عینی گواہ جو ہر وقت ہمارے ساتھ موجود رہتے ہیں وہ قیامت کے دن اپنا نوشتہ اللہ کے سامنے اور اللہ کے حکم سے ہر ایک کو پیش کریں گے۔ یہ بھی قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ جن کو نامہ عمل دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ ان کی سعادت کی علامت ہوگا۔ اس لئے وہ اسے پاکر خوش و خرم ہوں گے۔ لیکن جن لوگوں کو یہ نامۂ عمل بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ ان کی بدبختی اور شقاوت کی علامت ہوگا۔ وہ اسے لے کر سر پیٹ لیں گے۔

سورہ بنی اسرائیل میں کہا گیا:

> "کُلَّ اِنسَانٍ اَلزَمْنَاہُ طَائِرَہٗ فِی عُنُقِہٖ وَ نُخرِجُ لَہٗ یَومَ
> القِیَامَۃِ کِتَاباً یَّلقَاہُ مَنشُورًا اِقرَاۡ کِتَابَکَ کَفٰی
> بِنَفسِکَ الیَومَ عَلَیکَ حَسِیبًا○

ہم نے ہر انسان کا نتیجہ یعنی (اس کا نامہ عمل) اس کی گردن میں چپکا دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کا رجسٹر نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا۔ (اسے یہ کہا جائے گا) کہ اپنا یہ نامہ عمل پڑھ لے آج تو خود ہی اپنا حساب کرنے کے لیے کافی ہے۔) قرآن کریم کے اس بیان سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ ہمیں محفوظ حالت میں اللہ کی قدرت سے ایک نوشتہ اور نامہ عمل دیا جائے گا اور ہم اسے خود پڑھ سکیں گے۔ لیکن ہم اگر آج کی جدید دنیا میں نئی ایجادات کے حوالے سے دیکھیں جن میں سب سے نمایاں ٹیلیویژن کی ایجاد ہے تو کیا ہم اس میں گذرے ہوئے لوگوں کو اپنی آنکھوں سے چلتا پھرتا' بولتا چالتا نہیں دیکھتے؟ جو لوگ عرصہ دراز سے دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور ان کی فلمیں محفوظ ہیں ہم جب چاہیں ٹیلیویژن کی مدد سے ان کی آواز سن سکتے ہیں انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ اگر انسانی ایجاد یہ کارنامہ انجام دے سکتی ہے تو

قدرت کے لیے اس میں کیا مشکل ہے کہ وہ پوری فضا کو پردہ سکرین میں تبدیل کر دے اور ہماری کہی ہوئی باتیں اور کیے ہوئے اعمال کی اس محفوظ فلم کو جو اس کے پاس محفوظ ہے اسے پردہ سکرین پر جاری کر دے اور وہاں ہر دیکھنے والا اس پردہ سکرین پر اپنے اعمال کو دیکھے اور اپنے اقوال کو سنے۔ بلکہ اگر ہم مزید غور کریں تو سائنس ہمیں یہ بتاتی ہے کہ یہ فضا اس قدر حساس واقع ہوئی ہے کہ اس میں ہر کہا ہوا بول محفوظ ہے اور ہر کیا ہوا کام دیکھا جا سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ کوئی موجد اپنی نئی ایجاد سے یہ کارنامہ انجام دے دے ممکن ہے یہ بات انسان کی بساط سے باہر ہو اور دنیا میں کبھی ایسا نہ ہو سکے لیکن میں محض تسہیل و توضیح مدعا کے لیے ایک مثال عرض کرتا ہوں۔

کہ اگر ایک پرسکون جھیل میں آپ ایک کنکر پھینکیں تو آپ دیکھیں گے کہ سطح آب پر ایک دائرہ سا بن جائے گا جو جھیل کے کناروں تک پھیلتا چلا جائے گا۔ یہ کائنات اس جھیل سے بھی زیادہ حساس ہے جہاں ہمارے ہر عمل سے ہر جنبش سے بلکہ خیال تک سے لہریں اٹھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ چونکہ کائنات کا کوئی ساحل نہیں اس لئے یہ لہریں سدا باقی رہیں گی اگر ہم کوئی ایسا ٹیلیویژن ایجاد کرلیں جو ان لہروں کو صوت و حرکت میں بدل سکے تو ہر شخص کا پورا اعمال نامہ ایک فلم کی طرح ہمارے سامنے آجائے گا۔ اس آیت کریمہ میں غالبا" اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

اَلیَومَ نَختِمُ علیٰ اَفواھِھِم و تُکَلِّمُنَا اَیدِیھِم و تَشھَدُ
اَرجلُھُم بِمَا کَانُوا یَکسِبُون

قیامت کے دن ہم ان کے منہ بند کر دیں گے اور ان کے اعمال کی داستان ان کے ہاتھ اور پاؤں سنائیں گے۔ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعضاء بھی ہمارے حق میں یا ہمارے خلاف گواہی دیں گے بلکہ ہماری کھال تک ہمارے اعمال بد پر گواہی دے گی۔ قرآن کریم میں سورہ حم السجدہ میں کہا گیا:

ویَومَ یُحشَرُ اعداءُ اللّٰہِ اِلی النَّارِ فھُم یُوزَعُون حتّٰی اذا
ماجاءُوھا شَہِد عَلَیھم سمعُھم و البصار ھم و

جلودھم بما کانوا یعملون وقالو لجلودھم الم شھد
تم علینا قالو انطقنا اللّٰہ الذی انطق کل شئی

جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے اور وہ درجہ بدرجہ تقسیم کر دیئے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو ان کے کان، آنکھیں اور ان کی کھالیں ان پر ان کی کرتوتوں کی گواہی دیں گی۔ تو وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہم پر گواہی کیوں دی؟ تو وہ بولیں گی کہ جس اللّٰہ نے ہر چیز کو قوت گویائی بخشی ہے آج اسی نے ہمیں بھی بولنے کا حکم دیا ہے مزید ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ہر عمل مخصوص شکل میں لایا جائے گا۔ جس کا ایک وزن ہوگا اب اس کی کمی بیشی کے لیے یا بوجھل اور ہلکے پن کو جاننے کے لیے میزان رکھا جائے گا۔ تو پھر جن کے وزن ہلکے ہوں گے وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے اور جس کا وزن بھاری ہوگا وہ جنت کی نعمتوں سے سرفراز ہوگا۔

قرآن کریم سورہ اعراف میں کہتا ہے کہ:

”والوزن یومئذن الحق فمن ثقلت موازینہ فاولئک
ھم المفلحون ومن خفت موازینہ فاؤلئک الذین
خسروا انفسھم

اور اس دن وزن کرنا حق ہے پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں تو یہ وہ لوگ ہیں جو فلاح کو پہنچیں گے اور جن کی تولیں ہلکی ہوئیں یہ وہ ہیں جو اپنی جانوں کا نقصان کر بیٹھے ہیں۔

سورہ القارعہ میں فرمایا:

”فاما من ثقلت موازینہ فھو عیشۃ راضیہ واما من
خفت موازینہ فامہ ھاویہ

آج جس کا تول بھاری ہوا تو وہ عیش کی زندگی میں ہوگا۔
اور جس کا تول ہلکا ہوا اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔

تو حساب کتاب کے اس مرحلے سے گذرنے کے بعد لوگ اپنے اپنے

اعمال کے مطابق جنت یا جہنم میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ البتہ ان لوگوں میں سے جنہوں نے کفر اور شرک کا رویہ اختیار کیا ہوگا ان کو تفصیلی حساب کتاب کی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ اس جرم کے بعد باقی کوئی نیکی اپنا وجود نہیں رکھتی اس لئے ان کو سیدھا جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہیں گے اور کبھی ان کو معافی نہیں ملے گی۔ قرآن کریم کہتا ہے:

> اِنّ اللّٰہ لا یَغفِرُ اَن یّشرَکَ بِہ وَیَغفِرُ مَادُونَ ذٰلِک لِمَن یّشَاء
>
> کہ بے شک اللہ تعالیٰ اس آدمی کو کبھی نہیں بخشے گا جس نے اس کے ساتھ شرک کیا۔ اس کے علاوہ جسے چاہے گا بخش دے گا۔

لیکن یہ حساب کتاب جس میں نیکی کی جزا اور بدی کی سزا ہے اس طرح کا غیر معقول، غیر منطقی اور اللہ کی رحمت کے بالکل برعکس نہیں ہے جس طرح کا تصور بعض دیگر مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ یہودیت اور عیسائیت نے بھی اس میں بہت کچھ ٹھوکریں کھائی ہیں اور قدم قدم پر غلطیاں کی ہیں لیکن ہندو مت نے تو اس کو نامعقولیت اور غیر منطقی انجام کی انتہا تک پہنچا دیا۔ اس کی ہم تفصیل سید سلیمان ندویؒ کی سیرۃ النبی سے نقل کرتے ہیں۔

"درحقیقت مذاہب کا حقیقی تعلق اس عقیدہ سے ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور اچھا یا برا جیسا کام اس سے صادر ہوتا ہے، اس کے مطابق اچھا یا برا معاوضہ اس کو دوسری دنیا میں ضرور ملے گا۔ اس عقیدہ کا نشان مصر و بابل جیسی دنیا کی قدیم قوموں میں بھی ملتا ہے۔ ہندوستان کے مذاہب میں اس دوسری دنیا کو دوسرے جنم سے تعبیر کیا گیا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ انسان جب مرتا ہے تو اس کے اچھے یا برے کاموں کے مطابق اس کی روح کسی جانور، گھاس پھوس یا درخت کے قالب میں جاکر اپنے عمل کا نتیجہ بھگتتی ہے اور پھر انسانوں کے قالب میں لائی جاتی ہے اور کام کرتی ہے اس کے بعد جس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں ان کو یم لوک میں جانا پڑتا ہے۔ جہاں نرک (دوزخ)

میں وہاں وہ ہر قسم کی سزا بھگتتی ہے، بعد ازاں اپنے بعض اچھے کاموں کی بدولت چندر لوگ (چاند کی دنیا) میں جاتی ہے، جس روح کے کچھ کام اب بھی باقی ہیں وہ اس دنیا میں ہوا، بادل اور بارش کے ذریعہ سے دوبارہ آتی ہے اور اپنے کام کے مطابق حیوانات یا نباتات کے روپ میں سزا پاتی ہے اور پھر چھوٹ کر انسان بنتی ہے، یہاں تک کہ اس کے کام اتنے اچھے ہو جائیں کہ وہ سزا کے قابل نہ رہ جائے۔ اس وقت وہ مادی قالبوں کی قید سے نجات پاکر سورج لوک اور چندر لوک وغیرہ اجرام سماوی کی دنیاؤں میں جاکر آرام کرتی ہے اور پھر اپنے علم و عمل کی کسی کمی کے سبب سے بادل، ہوا، اناج یا کسی دوسری مخلوقات کے قالب میں ہو کر اس کو اس دنیا میں پھر آنا پڑتا ہے اور پھر وہی عمل شروع ہوتا ہے۔ یعنی وہ نئے نئے جنموں میں سزا بھگتتی ہے اور اس وقت تک آمد و رفت اور آواگون کے چکروں میں پھنسی رہتی ہے، جب تک اس سے اچھے یا برے کاموں کا صدور ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے کامل اور دائمی نجات کی صورت صرف یہ ہے کہ انسان سے اچھا یا برا کوئی کام صادر نہ ہو، یہی ترکِ عمل روح کو مادہ کی قید سے آزاد کر کے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا (موکش) دلاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ موجودہ مادی دنیا پرلے (قیامت) کے بعد پھر جب نئے سرے سے بنے گی تو پھر وہی عمل اور سزا یعنی آواگون کا چکر شروع ہوگا۔ اور پھر اس طرح چھٹکارا پائے گی اور پھر دوسری پرلے کے بعد نیا دور اسی طرح شروع ہوگا۔ یہ چکر اسی طرح ہمیشہ رہے گا۔

یہ وہ چکر ہے جس سے انسان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ الا یہ کہ ہمالہ کی چوٹی یا غار میں بیٹھ کر ترکِ عمل کے ذریعہ سے خود اپنے وجود سے ہاتھ دھو لیا جائے لیکن اگر اس اصول نجات پر دنیا عمل کرے تو یہ بہارستان دم کے دم میں خارستان بن جائے۔ ہر قسم کا کاروبار بند ہو کر دنیا آپ سے آپ فنا کے قریب آجائے۔ بدی کے ساتھ نیکی کا وجود بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جائے اور بالآخر دائمی و ابدی نجات میسر نہ ہو کیونکہ ہر پرلے کے بعد وہی جنم اور کرم اور آواگون پھر شروع ہوتا ہے۔"

لیکن اسلام نے اس جزا و سزا کے دن کا جو تصور دیا وہ عقل اور منطق کے انتہائی قریب اور اللہ کی رحمت کا عکاس ہے۔ اسلام نے اس بنیادی تصور کے ساتھ کہ ہر نیک عمل کی جزا اور ہر برائی کی ایک سزا ہے' رحمت کے ایسے مواقع سے بھی بہرہ ور فرمایا ہے کہ اگر آدمی واقعی ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لے اور اللہ کا خوف اس کو دامن گیر رہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کی جنت کا مستحق نہ ٹھہرے۔ مثلاً" سب سے پہلے پروردگار نے یہ کرم فرمایا کہ ایک اصول طے کر دیا کہ تم جو برائی کرو گے تو ہم ہر برائی کے بدلے میں ایک ہی برائی کی سزا دیں گے البتہ اگر تم نیکی کرو گے تو ہم نے یہ اصول بنا دیا ہے کہ

من جاء بالحسنة فله عشر امثالها

کہ جو آدمی نیکی کرے گا تو ہم اس کو دس گناہ بدلہ دیں گے۔

اب جہاں ایک اور دس کا تناسب ہو تو کیا وہ آدمی جو صراط مستقیم پر چلنا چاہتا ہو اور شریعت کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتا ہو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس تناسب سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔

2- دوسرا کرم یہ فرمایا کہ اگر تم نیکی کا ارادہ کرو لیکن اسے کسی وجہ سے کر نہ پاؤ تو ہم تمہیں ایک نیکی کا صلہ ضرور دیں گے لیکن اگر تم برائی کا ارادہ کرو اور اسے پھر کر نہ پاؤ تو ہم تم سے کوئی مواخذہ نہیں کریں گے۔

3- پھر ہمارے لیے بعض ایسے مواقع رکھے کہ اگر ہم ان مواقع پر اور ان زمانوں میں اللہ کی بندگی بجا لائیں اور اس سے استغفار کریں تو بخشش خود آگے بڑھ کر قدم چومتی ہے۔ مثلاً" رمضان کا مہینہ لیلتہ القدر' عیدین کی دونوں راتیں' یوم العرفہ 15 شعبان کی رات' رات کا پچھلا پہر' ان میں کوئی گنہگار سے گنہگار بھی استغفار کے لیے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلائے تو کبھی اسے خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹایا جاتا۔

4- یہ صحیح ہے کہ آدمی بعض دفعہ بڑے سے بڑا گناہ بھی کر گذرتا ہے جس کی بخشش کے لیے دوسرے مذاہب نے کوئی امکان نہیں چھوڑا۔ لیکن

اللہ کا بے حد کرم ہے کہ اس نے ہمارے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے بلکہ قرآن کریم میں باربار تسلیاں دی گئیں کہ اے ہمارے وہ بندو جو اپنے نفسوں پر زیادتی کر چکے ہو۔

لا تقنطوا من رحمة اللہ

اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہوں وہ سب گناہوں کو بخش دے گا صرف ایک دفعہ توبہ کرکے دیکھو۔

حضور ﷺ نے اس توبہ پر اس حد تک زور دیا کہ آپ کے اسمائے مبارکہ میں سے ایک اسم مبارک "رسول التوبہ" بھی ہے۔ یہ ایک ایسا امکان ہے کہ جس کے بعد سو سال کا مجرم بھی توبہ کے ذریعہ اپنی زندگی کو پاکیزہ بناسکتا ہے۔ اور اللہ کی رحمت کا استحقاق پیدا کرسکتا ہے۔ اس قدر بخشش اور استغفار کے مواقع ملنے کے بعد بھی کوئی آدمی اللہ کی رحمت کا استحقاق پیدا نہ کرسکے تو اسے بدنصیب کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے لیکن قربان جائیں اللہ کی رحمتوں کے کہ اس نے مرنے کے بعد بھی اور قیامت کے دن بھی اپنے بندوں کو اپنی رحمتوں سے محروم نہیں کیا۔

5- مرنے کے بعد بھی اس نے ہمیں یہ حق دیا کہ اگر تم اپنے پیچھے کوئی صدقہ جاریہ چھوڑ جاؤ یا اپنی نیک اولاد چھوڑ جاؤ جو تمہارے لیے دعا کرتی رہے تو مرنے کے بعد بھی اس سے تمہاری برائیوں میں کمی ہوگی اور تم بخشش کے قریب ہوتے جاؤ گے۔

6- اور اگر معاملہ اس سے بھی نہ بن سکے تو پھر اللہ کی رحمتوں نے ہمارے لیے ایک اور امکان بھی پیدا فرمایا وہ یہ کہ ہمیں بتایا گیا کہ آنحضرت ﷺ ہمارے لیے شفاعت فرمائیں گے حضور کی ایک شفاعت تو شفاعت عامہ ہوگی جس کی نتیجے میں تمام امتوں کے لوگ جو حساب کتاب کے انتظار میں نہایت کرب اور اضطراب سے وقت گذار رہے ہوں گے ان کا حساب کتاب شروع ہو جائے گا۔ پھر آنحضرت ﷺ اپنی امت کے لیے بطور خاص سفارش فرمائیں گے حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے

قیامت کی حالت بیان کرتے ہوئے بتایا کہ پھر میں سجدہ میں گر پڑوں گا پڑا رہوں گا، آخر آواز آئے گی اے محمد (ﷺ) سر اٹھا، مانگ دیا جائے گا۔ تب میں سر اٹھاؤں گا اور اس حمد سے جو اس وقت خدا مجھے سکھائے گا اس کی حمد کروں گا اور سفارش کروں گا تو خدا ایک حد مقرر فرمائے گا تو میں ان کو دوزخ سے نکالوں گا اور جنت میں داخل کروں گا۔ پھر لوٹ آؤں گا اور سجدہ میں گر پڑوں گا پھر وہ کچھ لوگوں کو بخش دے گا اسی طرح تیسری بار پھر چوتھی بار کروں گا یہاں تک کہ دوزخ میں پھر وہی رہ جائے گا جس کو قرآن نے روک رکھا ہے۔

حضرت عمران ابن حصین سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میری شفاعت سے کچھ ایسے لوگ بھی دوزخ سے نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے جن کا نام جہنم والے ہو گا۔ البتہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ آنحضرت کی سفارش ہر ایک کے لیے نہیں ہوگی بلکہ اس سفارش سے وہ خوش نصیب بہرہ ور ہوں گے جو اخلاصِ قلب سے توحید پر ایمان رکھتے ہوں گے۔ اور جن کے سر صرف اور صرف اللہ کے سامنے جھکتے ہوں گے۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ ان کے سوال پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میری سفارش سے سرفراز ہونے کی خوش قسمتی اس کو حاصل ہوگی جس نے خلوص قلب سے اللہ کی توحید کا اقرار کیا ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہ ہی سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فیصلے سے فراغت پائے گا اور چاہے گا کہ ان کو جنہوں نے اس کی توحید کی گواہی دی تھی دوزخ سے نکالے تو فرشتوں کو ان کو نکالنے کا حکم دے گا۔ فرشتے ان توحید والوں کو اس علامت سے نکالیں گے کہ ان کی پیشانیوں میں سجدے کے نشان ہوں گے۔ خدا نے آدم علیہ السلام کے بیٹے کی پیشانی کے نشان کو دوزخ کی آگ پر حرام کر دیا ہے وہ ان کو جلا کر خاکستر نہیں کر سکے گی۔ فرشتے جب ان کو نکالیں گے تو وہ جلے اور جھلسے ہوئے ہوں گے۔ پھر ان پر آبِ حیات چھڑکا جائے گا تو وہ اس طرح اگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے۔

ایسی متعدد روایات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جس کا خاتمہ ایمان پر ہوا اور جس نے توحید پر جان دی اور جس نے کبھی بھی کوئی نیک عمل کیا ہوگا جہنم کی سزا بھگتنے کے بعد بالآخر اللہ تعالیٰ آنحضرت ﷺ کی شفاعت سے اس کو جہنم سے آزادی دے دیں گے اور جنت میں اسے داخل کر دیا جائے گا۔ البتہ وہ بدنصیب کبھی جہنم سے چھٹکارا نہیں پاسکے گا جس نے شرک کا ارتکاب کیا ہوگا۔

## جنت اور جہنم کیا ہے؟

جنت کیا ہے اور وہاں کیا ہوگا؟ ان سوالات کا جواب قرآن مجید سے سنئے۔

> ”اُولٰئِکَ لَہُمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہِمُ الۡاَنۡہٰرُ یُحَلَّوۡنَ فِیۡہَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَہَبٍ وَّ یَلۡبَسُوۡنَ ثِیَابًا خُضۡرًا مِّنۡ سُنۡدُسٍ وَّ اِسۡتَبۡرَقٍ مُّتَّکِـِٕیۡنَ فِیۡہَا عَلَی الۡاَرَآئِکِ“ (کہف آیت 31)
>
> (نیک اہل ایمان کو دائمی باغات ملیں گے جن میں نہریں رواں ہوں گی انہیں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے سبز رنگ کے مہین و دبیز ریشمی کپڑے ملیں گے اور وہ تخت پر تکئے لگا کر بیٹھیں گے۔)
>
> ”اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ رِزۡقٌ مَّعۡلُوۡمٌ فَوَاکِہُ وَ ہُمۡ مُّکۡرَمُوۡنَ فِیۡ جَنّٰتِ النَّعِیۡمِ عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیۡنَ یُطَافُ عَلَیۡہِمۡ بِکَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِیۡنٍ بَیۡضَآءَ لَذَّۃٍ لِّلشّٰرِبِیۡنَ لَا فِیۡہَا غَوۡلٌ وَّ لَا ہُمۡ عَنۡہَا یُنۡزَفُوۡنَ وَ عِنۡدَہُمۡ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ عِیۡنٌ

کانھن بیض مکنون"

(اللہ کے نیک بندوں کو نعمتوں بھرے باغوں میں پھل اور کھانے کی دیگر اشیاء ملیں گی وہ عزت پائیں گے وہ تخت پوشوں پر آمنے سامنے بیٹھیں گے انہیں پینے کو سفید رنگ کی شراب ملے گی جس میں بڑی لذت ہوگی جس کے پینے سے نہ سر چکرائے گا نہ مستی ہوگی ان کو ایسی حیادار اور موٹی آنکھوں والی حوریں ملیں گی جو ڈھانپے ہوئے انڈوں کی طرح سفید ہوں گی۔"

ویطوف علیھم غلمان لھم کانھم لولؤ مکنون

(ان کی خدمت کے لیے ایسے بچے مقرر ہوں گے جو ڈبیہ میں رکھے ہوئے موتیوں کی طرح خوبصورت ہوں گے۔)

### جہنم کیا ہے؟

"وَالَّذِینَ كَفَرُوا لَھُمۡ نَارَجَھَنَّمَ لَا یُقضٰی علیھم فَیَمُوتُوا وَلَا یُخَفَّفُ عنھم من عذابھا کَذالک نَجزی کُلَّ کَفُورٍ وَ ھُمۡ یَصطَرِخُوۡنَ فِیھَا رَبَّنَا اَخرِجۡنَا نَعۡمَلۡ صَالِحًا غَیۡرَ الَّذی کُنَّا نَعۡمَلُ اَوَلَمۡ نُعَمِّرۡکُمۡ مَّا یَتَذَکَّرُ فِیه مَنۡ تَذَکَّرَ وَجَاءَکُمُ النَّذِیر فَذُوۡقُوۡا فما للظٰلمین من نذیر

(اللہ کے نافرمان جہنم کی آگ میں جلیں گے وہاں نہ انہیں موت آئے گی کہ عذاب سے چھوٹیں اور نہ سزا میں تخفیف ہوگی ہم نافرمانوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔ یہ لوگ چیخ چیخ کر کہیں گے کہ اے رب ہمیں جہنم سے نکال کر دنیا میں واپس بھیج تاکہ ہم نیک عمل کریں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے تم کو دنیا میں اتنی عمر نہیں دی تھی جس میں ہر سوچنے والا اپنا نیک و بد سوچ سکتا تھا اور کیا تمہاری

طرف ہمارا ڈرانے والا (نبی) نہیں آیا تھا؟ اب اپنے کرتوتوں کا مزہ چکھو یہاں ظالموں کا مددگار کوئی نہیں۔)

”الذین کَذّبُوا بالکتٰب وبما ارسلنا بہ فسوف یَعلمُون اِذِ الاغلٰل فی اَعناقھم والسلاسل یُسحبون فی الحمیم ثم فی النار یُسجَرون

(جن لوگوں نے ہماری کتاب اور ہمارے رسولوں کو جھٹلایا۔ انہیں جلد اپنا انجام معلوم ہو جائے گا۔ ان کی گردن میں طوق اور زنجیر ڈال کر انہیں ابلتے ہوئے پانی میں گھسیٹا جائے گا اور پھر آگ میں جھونکا جائے گا۔)

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ طَعَامُ الاَثِیمِ کالمُھلِ یَغلی فی البُطونِ کَغلی الحَمیم خُذُوہ فَاعتلُوہ الٰی سَواءِ الجَحیم ثُمَّ صُبُّوا فوق راسہ مِن عذابِ الحمیم ذُق اَنَّکَ اَنتَ العزیزُ الکریم

(بے شک زقوم کا درخت بڑے مجرم (یعنی کافر) کا کھانا ہوگا۔ جو (کریہہ صورت ہونے میں) تیل کی تلچھٹ جیسا ہوگا (اور) وہ پیٹ میں ایسا کھولے گا جیسا تیز گرم پانی کھولتا ہے (اور فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) اس کو پکڑو پھر گھسیٹتے ہوئے دوزخ کے بیچوں بیچ تک لے جاؤ پھر اس کے سر کے اوپر تکلیف دینے والا گرم پانی چھوڑ دو۔ چکھ کہ تو بڑا معزز مکرم ہے۔)

فَالّذِین کَفَروا قُطِّعَت لَھم ثیابٌ من نار یُصَبُّ من فوق رؤسھم الحَمیم یُصھَر بہ مافی بُطونھم والجُلود ولَھم مَقامِعُ من حدید کُلّما ارادوا ان یخرجوا منھا من غَمٍّ اعیدوا فیھا و ذُوقوا عذاب الحریق

(اللہ کے نافرمانوں کو آگ کے کپڑے پہنائے جائیں گے۔ ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا۔ ان کی انتڑیاں اور کھالیں گل جائیں گی انہیں لوہے کی ہتھوڑوں سے پیٹا جائے گا اور جب کبھی وہ جہنم سے بھاگنے کی کوشش کریں گے تو انہیں پکڑ کر دوبارہ اس میں دھکیل دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ آگ کا عذاب چکھو۔)

هَلِ اَتٰاکَ حَدیثُ الغَاشیَة وُجُوہٌ یَوْمئذٍ خَاشعَۃٌ
عَاملَۃٌ نَاصبَۃٌ تَصلٰی نَاراً حَامیَۃً تُسقٰی مِن عَینٍ اٰنیَۃٍ
لَیسَ لَہُمْ طَعَامٌ اِلاَّ مِن ضَریع

(کیا تم تک ڈھانپ لینے والی مصیبت کی خبر پہنچی ہے اس روز کتنے ہی چہرے ذلیل مصیبت زدہ اور خستہ نظر آئیں گے یہ سب آگ میں جلیں گے انہیں پینے کو ابلتا ہوا پانی اور کھانے کو صرف کانٹے ملیں گے۔

قرآن حکیم میں شاید ہی کوئی ایسا رکوع ہو جس میں جنت جہنم اور حشر و نشر کا ذکر نہ آیا ہو ایسی آیات کی تعداد ایک ہزار سے کم نہیں ہے لیکن ہم انہیں چند آیات پر اکتفا کرتے ہیں۔

## آخرت کے چند مناظر حدیث میں

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب آدمی تین قسموں اور تین گروہوں میں اٹھائے جائیں گے۔ ایک قسم پیدل چلنے والے، ایک قسم سوار اور ایک قسم منہ کے بل چلنے والے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ یہ (تیسرے گروہ والے) منہ کے بل کس طرح چل سکیں گے؟ آپ نے فرمایا جس نے انہیں پاؤں کے بل چلایا ہے وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ انہیں منہ کے بل چلائے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لوگ اپنے منہ

کے ذریعے ہی زمین کے ہر ٹیلے اور ہر کانٹے سے بچیں گے۔ (ترمذی)

### سب سے ہلکا عذاب

نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہتے ہیں رسول ﷺ نے بیان فرمایا کہ دوزخیوں میں سب سے ہلکے عذاب والا وہ شخص ہو گا جس کی چپلیں اور ان چپلوں کے تسمے آگ کے ہوں گے، ان کی گرمی سے اس کا دماغ اس طرح کھولے گا اور جوش مارے گا کہ جس طرح چولہے پر دیگچی کھولتی ہے اور اس میں جوش آتا ہے۔ وہ نہیں خیال کرے گا کہ کوئی شخص اس سے زیادہ سخت عذاب میں بھی ہے حالانکہ وہ دوزخیوں میں سب سے ہلکے عذاب والا ہو گا۔ (بخاری و مسلم)

### جہنمیوں کی غذا

حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے بیان فرمایا کہ غساق یعنی وہ سڑی ہوئی پیپ جو جہنمیوں کے زخموں سے نکلے گی اور جس کے متعلق قرآن مجید میں بتلایا گیا ہے کہ وہی انتہائی بھوک میں ان کی غذا ہو گی وہ اس قدر بدبودار ہو گی کہ اگر اس کا ایک ڈول اس دنیا میں بہا دیا جائے تو ساری دنیا (اس کی سڑاند سے) بدبودار ہو جائے (ترمذی)

### اور جنت

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ چیزیں تیار کی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ کسی بشر کے دل میں کبھی ان کا خطرہ یا خیال ہی گذرا ہے۔ (بخاری و مسلم)

# فکرِ آخرت

میرے بھائیو اور عزیزو!

مسلمان ہونے کے لیے توحید اور رسالت کے ساتھ ساتھ آخرت پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ مگر جس طرح توحید اور رسالت پر زبانی ایمان انسانی زندگی میں کسی تبدیلی کی ضمانت نہیں بنتا اسی طرح آخرت کو محض زبان سے مان لینا حقیقی تبدیلی کا باعث نہیں بن سکتا۔ جبکہ آخرت کا عقیدہ (اگرچہ توحید کے عقیدے کا نتیجہ ہے) مگر انسانی زندگی میں انقلاب لانے کے حوالے سے سب سے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اور سب سے زیادہ انسانی افکار اور اس سے پیدا ہونے والے اعمال پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب آخرت صرف زبان کا اقرار نہ رہے بلکہ دل و دماغ کی فکر بن جائے۔ آدمی ہر عمل کرنے سے پہلے آخرت کے تصور کو دل و دماغ میں زندہ کرے مگر بد نصیبی یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے بیشتر لوگ صرف آخرت کے قائل تو ہیں لیکن اس کی حقیقت پر غور کرنے اور دل و دماغ میں اسے مستحضر کرنے کی بہت کم لوگوں کو توفیق ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ فکر میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور نہ اعمال میں کوئی صحت مند تغیر واقع ہوتا ہے بلکہ امر واقعہ تو یہ ہے کہ جن قوموں کے افراد عقیدۂ آخرت کا کوئی تصور نہیں رکھتے ان کے اعمال میں اور مسلمانوں کے اعمال میں بالعموم کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی وجہ اس کے

سوا اور کچھ نہیں کہ تمام قوموں کے افراد نے اپنی قومی روایات، تعلیمی اثرات، قانونی گرفت اور سماجی تصورات کے تحت زندگی گذارنے کی ایک عادت بنالی ہے۔ اب مسلمان من حیث القوم چونکہ اسلامی نظامِ زندگی سے محروم ہو چکے ہیں اس لیے ان کی سوچ اور اس کے نتائج عموماً وہی ہیں جو باقی ساری قوموں کے ہیں۔ بجز اس کے کہ کہیں کسی اللہ کے بندے کی کاوشوں کی وجہ سے یا دینی ارادوں کے اثرات کی وجہ سے، یا منبر و محراب کی مساعی کے باعث یا چند خوش نصیب والدین کے حسن تربیت کے نتیجے میں کہیں آخرت پر مبنی اعمال کا ظہور دکھائی دیتا ہے تو وہ ایک الگ بات ہے ورنہ ہماری قومی زندگی اس کے اثرات سے روز بروز محروم ہوتی جارہی ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ہم نے انسانی زندگی پر اثر انداز ہونے والے اس بنیادی عقیدے کو اقرار و علم کا درجہ تو دیا ہے لیکن اس کو زندگی کی سوچ اور دل و دماغ کی فکر نہیں بنایا۔ حالانکہ اگر انسانی زندگی کو صحت مند روایات دینی ہیں اور انسانی معاشرے کو اخلاقی بنیادوں پر استوار کرنا ہے اور انسانی دل و دماغ کو خیر کا سرچشمہ بنانا ہے اور اخوت، مروت احسان، عفو و درگذر اور محبت سے انسانی سرمایۂ حیات کو نئی زندگی عطا کرنی ہے بلکہ میں ایک قدم آگے بڑھ کر یہ عرض کروں گا کہ انسان نے آج تک ایجادات، اختراعات اور وضعی علوم کی شکل میں انسانی دانش کا جو عظیم سرمایہ انسانیت کے لیے مہیا کیا ہے اگر واقعی اسے باقی رکھنا ہے اور اس کو باقی رکھنے سے انسانیت کے مستقبل کو محفوظ کرنا ہے تو پھر صرف یہ مسئلہ مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کا ہے کہ فکر آخرت کو دلوں میں اتارنے کی کوشش کی جائے۔ اور انسان کو اس بات کا خوگر بنایا جائے کہ وہ اپنا ہر کام کرنے سے پہلے یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ جس طرح دنیا میں ہر عمل کا ایک ردعمل ہوتا ہے اور ہر کام کا ایک نتیجہ ہوتا ہے اور ہر چیز کے خواص مقرر ہیں اسی طرح ہمارے ہر ہر عمل کا بھی کوئی نہ کوئی ردعمل ہے اور اس کی کوئی نہ کوئی جزا و سزا ہے۔ بعض دفعہ تو اس جزا و سزا سے ہم دنیا ہی میں سامنا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کتنی دفعہ ہم دیکھتے ہیں کہ قتل کا بدلہ ہمیشہ قتل کی صورت میں نکلتا ہے۔ گالی کا

جواب ہمیشہ گالی سے ملتا ہے اور اگر یہ گالی حد سے بڑھ جائے تو اس کے نتیجے میں گولی بھی چلتی ہے جس طرح مسکراہٹ سے دیکھنے والے کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے اسی طرح خشمگیں نگاہوں کے نتیجے میں غصے پر مبنی عمل وجود میں آتا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ جانبین کے لیے خیر کا سبب نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ بعض دفعہ محبت کا جواب محبت سے نہیں ملتا۔ مروت بعض دفعہ اپنے حقیقی نتائج سے محروم رہتی ہے۔ نیکی کا صلہ بعض دفعہ بدی کی صورت میں نکلتا ہے۔ لیکن اگر ہم نتیجہ خیزی کے عمل کو وسیع دائرے میں اور اجتماعی حوالے سے دیکھنے کی کوشش کریں تو بالآخر اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ محبت' مروت اخوت یا اسی طرح کے اور اعمالِ خیر کہیں نہ کہیں جاکر اپنے صحیح نتیجے سے ضرور ہمکنار ہوتے ہیں۔ یہ بات ہمیں اس بات کا سراغ دیتی ہے کہ انسانوں کو اعمال کے بدلے کے تصور سے آگاہ کرنا ازبس ضروری ہے تاکہ وہ ہر کام کرنے سے پہلے اس کے مثبت اور منفی ردعمل کو ذہنوں میں رکھیں تو یقیناً ظلم شقاوت استحصال چوری ڈاکہ اور اس طرح کے دوسرے اعمالِ قبیحہ و ذمیمہ میں کمی آسکتی ہے اور انسانیت بہتری کی طرف رواں دواں ہوسکتی ہے۔

اور اگر اس جزاء و سزا کے تصور کے ساتھ یہ تصور بھی اہل دنیا میں عام ہو جائے کہ اس دنیا کے بعد بھی ایک دنیا ہے جس میں ہر آدمی اپنے اعمال کے محاسبے اور اس کے نتیجے میں جزا یا سزا سے بھی گذرے گا۔ یہاں کا کیا ہوا ہر عمل وہاں جزا یا سزا پائے گا۔ اس لیے یہاں کوئی اچھا یا برا کام کرنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے کہ وہاں کسی جزا یا سزا سے ہم کیسے بچ سکیں گے۔ آخرت کا وہ تصور جو اسلام نے دیا ہے وہ تو ظاہر ہے سراسر مسلمانوں کا سرمایہ ہے۔ لیکن اگر اتنی سی بات بھی جس کا اوپر ذکر کیا گیا اہلِ دنیا میں عام کر دی جائے تو انسانی اعمال کی بہتری کی بہت حد تک توقع کی جاسکتی ہے۔ اور انسانیت کا مستقبل بہت حد تک محفوظ کیا جاسکتا ہے لیکن اگر اس طرف توجہ نہ دی گئی جیسا کہ نہیں دی جارہی تو پھر ہمیں نہایت سنجیدگی سے اس بات پر سوچنا چاہیے کہ پوری دنیا تباہی کے جس انجام کی طرف بڑھ رہی ہے اس سے بچنے کی کیا صورت ہوگی؟ آج ہم

دیکھ رہے ہیں کہ مشرق و مغرب میں کوئی ملک ایسا نہیں جو اخلاقی تباہی کا شکار نہ ہو۔ مشرق کے ملک پسماندہ ہونے کی وجہ سے بعض دفعہ یہ سوچتے ہیں کہ مغربی ملکوں میں یقیناً” دنیا نہایت پرسکون زندگی گزارتی ہوگی۔ وہاں کا ہر فرد کسی طرح کے صدمے سے دوچار نہیں ہوتا ہوگا۔ وہاں کا کاروبار محفوظ ہوگا۔ مال و دولت کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ ہر ایک کی جان مال عزت اور آبرو ہر طرح کے خطرے سے حالتِ امن میں ہوگی۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ عام مغربی ممالک کو تو جانے دیجئے دنیا کے نہایت ترقی یافتہ ممالک کا حال بھی مشرقی ملکوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ آج اپنے آپ کو سپرپاور کہتا ہے لیکن اس کے فیڈرل بیورو آف انوسٹی گیشن کی رپورٹیں جو سال بہ سال چھپتی ہیں انہیں پڑھ کر آدمی حیرت میں ڈوب جاتا ہے چند سال قبل کی رپورٹ کے مطابق امریکہ میں ہر 30 منٹ کے بعد ایک قتل ہوتا ہے۔ ہر 39 سیکنڈ کے بعد کوئی نہ کوئی جرم سرزد ہوتا ہے۔ ہر 13 منٹ کے بعد کسی امریکی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کیا جاتا ہے۔ ہر 81 سیکنڈ میں کوئی زبردست ڈاکہ پڑتا ہے اور ہر 82 سیکنڈ کے بعد کسی امریکی شہری پر جسمانی حملہ ہوتا ہے اور پھر ان جرائم کی رفتار روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ لوگ سکون اور اطمینان کو اس حد تک ترس گئے ہیں کہ وہاں خودکشی کی وارداتوں میں آئے دن اضافہ ہوتا جارہا ہے بلکہ بعض دفعہ لاکھوں تک اس کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ یہی حال باقی مغربی ممالک کا بھی ہے۔ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اسلام نے تو آخرت کو اپنے عقائد میں شامل کیا ہے۔ مسلمان تو اپنے دین و مذہب کے لحاظ سے بھی اس کو اختیار کرنے کے پابند ہیں لیکن یہ باقی دنیا کی بھی اس لحاظ سے ضرورت ہے کہ اگر دنیا کو امن کی تلاش ہے اور وہ واقعتہً انسان کو انسان دیکھنا چاہتی ہے اور وہ نہیں چاہتی کہ انسان حیوان یا درندہ بن جائے اور اگر اسے اپنی سائنس اور دانش کے سرمایہ کی بقا منظور ہے تو پھر ضروری ہے کہ وہ بھی آخرت کو کم از کم جزا و سزا کے تصور کی حد تک ہی قبول کرلے تو شاید انسان کو انسانیت کے جامے میں دوبارہ لانے میں کامیاب ہوسکے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسانوں میں بڑھتے ہوئے جرائم اور انسان کا روز بروز انسانیت سے دور ہوتے چلے جانا یہ دنیا کے تمام سنجیدہ فکر لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے اور ہر قوم کا متین اور ذہین طبقہ اس پر غور و فکر بھی کرتا ہے اور اس کے لیے پریشان بھی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اہلِ دنیا نے آج تک انسان کے بگاڑ کے جو اسباب تلاش کئے ہیں اور پھر اپنے تئیں ان اسباب کو دور کرنے کی کوشش بھی کی ہے اس میں کامیابی تو دور کی بات ہے کامیابی کا تصور بھی محال دیکھائی دیتا ہے۔ ہم نے جہاں تک اہلِ مغرب کی تحقیق و جستجو کو جاننے کی کوشش کی ہے تو ہم اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ ان کے نزدیک انسان کے بگاڑ کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں۔

1- وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کے بگاڑ کا سب سے بڑا سبب جہالت ہے اس لیے اگر انسان کو کسی حد تک علم سے آشنا کر دیا جائے اور اس پر زندگی کا صحیح تصور واضح کیا جائے تو وہ یقیناً اپنے نفع و نقصان کو پہچانے گا اور جہاں اسے اپنے حقوق سے آگہی ہوگی وہاں وہ دوسروں کے حقوق سے بھی واقف ہوگا وہ اپنے فرض کو بھی سمجھے گا اور اپنی ذات اور اختیارات کی حدود کو بھی۔ نتیجتاً" وہ معاشرے کے لیے ایک کار آمد فرد بن جائے گا۔

2- انسان کے بگاڑ کا ایک سبب انسانی احتیاج ہے۔ آدمی ہمیشہ اپنی احتیاج کے ہاتھوں بہت سی کمزوریوں کا شکار ہوتا ہے۔ جب اس کی بنیادی ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو وہ چوری کرنے ڈاکہ ڈالنے' سمگلنگ کرنے اور کرپشن کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شروع میں یہ کام اس سے احتیاج کرواتی ہے پھر جب اس کی جھجک اتر جاتی ہے تو پھر وہ بعض دفعہ اسے اپنا پیشہ بھی بنالیتا ہے ایک انسان جب اپنے لیے مکان کی چھت نہیں پاتا اور کرائے پر مکان لینے کی اس میں سکت نہیں ہوتی تو پھر وہ اپنے اور اپنے بچوں کو موسمی شدائد سے محفوظ کرنے کے لیے وہ سب کچھ کر گذرنے پر تیار ہو جاتا ہے جس سے اسے مکان

میسر آسکے۔ اس کے لیے جو بھی اس کو غلط راستہ اختیار کرنا پڑے وہ کرے گا چاہے اسے اپنا مکان دوسروں کے کھنڈرات پر اٹھانا پڑے یا دوسروں کے بنک لوٹ کر پیسہ حاصل کرنا پڑے اسے اس سے بھی دریغ نہیں ہوگا اس لیے اگر اسے ان جرائم سے روکنا ہے تو ضروری ہے کہ اس کی ضرورتوں اور اس کی احتیاج کا علاج کیا جائے۔

3- انسان بعض دفعہ قانون شکنی کا ارتکاب اس وقت کرتا ہے جب وہ قانون کے شعور سے بہرہ ور نہیں ہوتا یا جب اسے قانون کی بالادستی کا احساس نہیں ہوتا جب وہ دیکھتا ہے کہ قانون یہاں مکڑی کا جالا ہے جو کمزور کو پھانس لیتا ہے اور طاقت ور سے ٹوٹ جاتا ہے یا وہ دیکھتا ہے کہ قانون کا حصار بہت کمزور ہے اور اس کی بالادستی محض کتابوں کی حد تک ہے۔ عدالتوں میں انصاف بکتا ہے اور غریب کی محرومیوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں اسے قانون توڑتے ہوئے نہ صرف یہ کہ کوئی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ بعض دفعہ وہ اپنی محرومیوں کے ازالے کے لیے قانون توڑنا ضروری سمجھتا ہے۔ اب اگر اس آدمی کو قانون کا پابند بنا کر ایک مفید شہری بنانا ہے تو یقیناً اسے قانون کا شعور دینا اور اس کی محرومیوں کے ازالے کے لیے قانون کا بالادست ہونا ضروری ہے۔

4- جب ایک آدمی کے ذہن میں جرم پرورش پاتا ہے تو وہ یکلخت اس کے ارتکاب پر آمادہ نہیں ہوتا بلکہ اسے روکنے والی کئی چیزیں ہوتی ہیں جن میں سب سے بڑی چیز احتسابی اداروں کی گرفت ہے۔ لیکن اگر احتسابی ادارے کمزور ہو جائیں یا وہ خود جرائم کا ساتھ دینے لگیں تو پھر جرائم پیشہ لوگوں کے لیے راستے کی کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔ ایک مجرم جرم کرتے ہوئے اس وقت ڈرتا ہے جب اسے اس بات کا یقین ہو کہ ادھر میرا ہاتھ کسی جرم کی طرف بڑھے گا اور ادھر احتسابی اداروں کی گرفت میری گردن تک پہنچ جائے گی۔ یہ احتساب

اور پکڑ ہی وہ چیز ہے جو ایک برے آدمی کو برائی سے روکتی ہے۔ اگر چوکیدار جاگتا ہو تو چور گھر میں گھسنے کی جرات نہیں کرتا۔ کسی ادارے کا سربراہ اگر بیدار، فعال اور دیانتدار ہو تو وہ ادارہ ہر طرح کی آلودگی سے محفوظ رہتا ہے۔ اس لیے معاشرے کو جرائم سے پاک رکھنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ احتسابی ادارے دیانتدار، بے دار مغز، اور پوری طرح چوکس ہوں۔ تاکہ جرائم پیشہ لوگوں کو کھل کھیلنے کی جرات نہ ہو سکے اور اگر ایسا نہیں ہوگا تو پھر ظاہر ہے کہ جرم کرنے والے کے سامنے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی۔

5- احتسابی اداروں کو مضبوط کرنے کے لیے، قانون کی بالادستی قائم کرنے کے لیے، تعلیمی اداروں کو صحیح طریقے سے اپنا کام کرنے کے لیے اور کاروبار کو ترقی دینے کے لیے ایک محفوظ اور پرسکون فضا کی ضرورت ہوتی ہے جس میں وہ اپنا اپنا فرض انجام دے سکیں اور یہ پرسکون فضا کسی ملک کا سیاسی استحکام مہیا کرتا ہے۔ اگر کسی ملک میں آئے دن حکومتیں بدلیں یا حکومتوں کو بدلنے کے لیے سیاسی مظاہرے روز کا معمول بن جائیں حکومت کو ناکام کرنے کے لیے آئے دن ہڑتالیں ہوں اور تعلیمی ادارے بند رہیں تو ظاہر ہے کہ اس کے نتیجے میں ملک میں بدامنی، انتشار اور انارکی کے سوا کوئی چیز پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اگر ہم چاہتے ہیں کہ فی الواقع پہلے بیان کردہ چاروں اسباب دور کیئے جائیں تو اس کے لیے ملک میں سیاسی استحکام پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ کوئی ادارہ بھی اپنی جگہ کام نہیں کر سکتا اور اس کے نتیجے میں جرائم پیشہ لوگوں کو جرم کرنے کا موقع ملتا رہے گا۔

بلاشبہ مندرجہ بالا اسباب انسانی سیرت و کردار کے بگاڑ میں اہم حیثیت کے حامل ہیں۔ جب کبھی بھی انسانی کردار کی اصلاح کی بات شروع ہوگی تو فورا" سوچنے والوں کی سوچ انہی نکات کی طرف متوجہ ہوگی اور بادی النظر میں یہی اسباب بگاڑ کے سامنے آئیں گے اور انہی کو دور کرنے سے اصلاح کی

امیدیں توانا ہوں گی۔ مگر یہاں ایک بہت اہم سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اب دنیا میں ایسے ممالک موجود ہیں جن ملکوں میں جہالت، فقر و افلاس اور بد نظمی کے بیج مار ڈالنے کے دعوے کئے جاتے ہیں۔ جن ملکوں نے تہذیب و تمدن کے بارے میں دنیا بھر کی امامت کا بیڑا اٹھایا ہوا ہے۔ جہاں گھر گھر میں تعلیم کی روشنی پھیل چکی ہے اور دنیا کا ہر خطہ حصولِ علم کے لیے انہیں ملکوں کا رخ کر رہا ہے۔ جہاں انسان نے چاند ستاروں پر کمندیں ڈال رکھی ہیں اور سائنس انسانی کامیابی کی خیالی سرحدیں بھی پار کر چکی ہے۔ مگر جب ہم وہاں بسنے والے انسانوں کے افعال و اعمال اور سیرت و کردار کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر آدمی حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ وہاں جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار مشرقی ممالک کی رفتار سے کہیں زیادہ ہے اور وہاں کے انسان انفرادی اور اجتماعی سطح پر ایسے ایسے مظالم اور مکروہ اعمال انجام دیتے ہیں جنہیں دیکھ کر شائد درندے بھی شرما جائیں۔ اب یہ بات کوئی راز نہیں رہی کہ مغربی ممالک میں خاندانی نظام تقریباً تباہی کا شکار ہو چکا ہے۔ ماں، باپ اور اولاد کا رشتہ محض ضابطے کا رشتہ ہو کر رہ گیا ہے۔ رشتوں کا احترام قدامت کی علامت سمجھا جانے لگا ہے۔ شرم و حیاء اور عفت و غیرت جہالت کی علامتیں بن گئیں ہیں۔ ہر طرح کی بے حیائی کو تہذیب کا ذریعہ سمجھ لیا گیا ہے۔ ماں بہن اور بیٹی کا رشتہ اپنا تقدس کھو چکا ہے۔ مغربی قوموں کی قیادت اپنے ملکوں میں اجتماعی اداروں کی حفاظت کے لیے اجتماعی اصولوں کی پاسداری کے لیے چاہے کیسی بھی دیانتدار کیوں نہ ہو دوسرے ملکوں اور دوسری قوموں سے معاملات کرتے ہوئے ان کو صرف ایک اصول یاد رہتا ہے وہ ہے اپنے ملک اور اپنی قوم کے مفادات کی حفاظت۔ طاقت کے جو پیمانے ان کے اپنے لئے روا ہیں وہ دوسروں کے لیے ناروا ہیں۔ انہیں اپنی قوموں کی شیرازہ بندی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ لیکن دوسری قوموں میں افتراق اور انتشاد پیدا کرنا وہ اپنی ریاست کا حق سمجھتے ہیں۔ حتی کہ دوسری قوموں کو ناکام کرنے کے لیے اگر وہاں خون کی ہولی بھی کھیلنی پڑے تو انہیں اس سے بھی دریغ نہیں ہوتا۔ ویت نام میں ان کے اصول کچھ اور ہوتے ہیں

اور چیچینا اور کشمیر میں ان کے اصول کچھ اور ہیں۔ یہی حال کمیونسٹ ممالک کا بھی ہے ان کے لینے کے باٹ اور ہیں اور دینے کے اور۔

مختصر یہ کہ اگر انسانوں کے تشکیل کردار میں اور اخلاق کی تعمیر میں یہی پانچوں اسباب مانع ہیں اور جرائم کے انسداد میں انہیں پانچوں اسباب کا خاتمہ کافی و شافی ہے تو پھر آخر ان ممالک کا ایسا حال کیوں ہے جب کہ ان پانچوں اسباب میں سے کوئی سبب بھی ان میں نہیں پایا جاتا۔ لیکن بداخلاقی اور جرائم میں سے کوئی ایسی بات نہیں جس کا صدور ان ملکوں میں نہیں ہوتا۔ اس سے ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہاں کے سوچنے والوں نے گہرائی میں جاکر اور تہہ میں اتر کر حقیقی سبب تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ بلکہ اوپر اوپر سے جو چیزیں ایک ظاہر بیں نگاہ دیکھ سکتی ہے انہی پر اکتفا کرلیا گیا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ جیسے ایک ایسا آدمی جس کے جسم پر پھوڑے پھنسیاں نکل آئیں تو وہ اس کا علاج یہ سمجھے کہ ایک ایک پھوڑے پر پھاہا رکھتا جائے اور ایک ایک پھنسی پر دوا لگاتا رہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے اسے مکمل صحت نصیب نہیں ہوگی۔ تاوقتیکہ ان پھوڑے پھنسیوں کا حقیقی سبب تلاش نہ کرے اور اس کے ازالے کے لیے مساعی بروئے کار نہ لائے۔ یہی حال جسد انسانیت کا بھی ہے۔ جو اسباب اوپر ذکر کئے گئے ہیں یقیناً جسدِ انسانیت کو بیمار کرنے میں ان کا بھی ہاتھ ہے لیکن حقیقی سبب کچھ اور ہے اس سے پہلے کہ اس کا ذکر کروں اور اس حقیقی علاج کو آپ کو سامنے لاؤں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس علاج پر مبنی ایک تجربہ جو کہ چودہ سو سال پہلے کیا گیا تھا اس کا آپ سے ذکر کروں۔ اس سے آپ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ جب ہمارے سامنے ایک کامیاب تجربہ موجود ہے۔ اب جبکہ ہم بار بار کے تجربات سے ناکامی کے زخم اٹھا چکے ہیں تو ہمیں اسے اختیار کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔ اس تجربہ کے حوالہ سے یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ جن لوگوں میں اس کا تجربہ کیا گیا ایسا نہیں تھا کہ ان کا بگاڑ معمولی نوعیت کا تھا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ جزیرۂ عرب جس کو سب سے پہلے اس تجربہ کے لیے چنا گیا اور پھر اسے بیس بنا کر باقی پوری نوع انسانی کو

وہ نسخۂ کیمیا مہیا کیا گیا۔ وہ نفرتوں عداوتوں اور جرائم کا جہنم بنا ہوا تھا۔ قدم قدم پر قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ لوٹ مار کو بہادری اور دلاوری سمجھا جاتا تھا۔ گھر کے باہر انسان کی جان اور گھر کے اندر اس کی عزت و عصمت ہر لمحہ خطرے میں تھی۔ خود اپنے جگر کے ٹکڑوں کو زندہ درگور کرتے ہوئے انہیں کبھی رحم نہیں آتا تھا۔ ماں، باپ اور بہن کے رشتے پامال ہو چکے تھے۔ راہ چلتے قافلے بھی لٹنے سے محفوظ نہیں تھے۔ انسان اپنی شقاوت اور بدبختی کی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ لیکن تجربہ کرنے والے نے انسانی اصلاح کا جب آغاز کیا تو اس نے نہایت اعتماد کے ساتھ یہ کہا کہ لوگو آج جبکہ تم اپنے جزیرے کو جہنم بنا چکے ہو ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ ایک عورت تن تنہا مکہ سے حیرہ تک اکیلی سفر کرے گی اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہو گا اور پھر دنیا نے دیکھا کہ جیسے جیسے یہ تجربہ آگے بڑھتا گیا وہی جزیرۂ عرب جہاں کبھی نفرتوں اور عداوتوں کے کانٹے اگتے تھے اور جہاں کسی کی جان و مال اور آبرو کو کوئی پناہ نہیں تھی اسی جزیرے میں محبت و الفت اور امن و آشتی کے پھول کھلنے لگے۔ حتیٰ کہ صرف 23 سال کے عرصہ میں 12 لاکھ مربع میل کے علاقے میں ایک ایسا کوثر و تسنیم میں دھلا ہوا معاشرہ پروان چڑھا جس کی نظیر چشمِ فلک نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ تجربہ اور اس کے نتیجے میں پیش آمدہ انقلاب وہ تھا جسے آج سے چودہ سو سال پہلے سرکار دو عالم رسول اللہ ﷺ نے برپا فرمایا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس انقلاب میں علم کی طاقت بھی تھی اور انسانی احتیاج کے دور کرنے کو بھی مناسب جگہ دی گئی تھی۔ اس میں قانون کو بالادست بھی بنایا گیا تھا۔ اس میں کسی حد تک احتسابی ادارے بھی اپنا کام کر رہے تھے۔ لیکن اس میں سب سے زیادہ جس بات پر زور دیا گیا تھا وہ اس حقیقی مرض کو دور کرنا تھا جس کی وجہ سے ہمیشہ انسان بگڑتا ہے اور پھر اس بگاڑ سے نہ اسے تعلیم روکتی ہے اور نہ دولت مندی اس کا ہاتھ روکتی ہے۔ وہ ہندوستان کا آخری وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن بھی ہو جو شاہی خاندان کا فرد اور اپنے ملک میں وزیرِ دفاع بھی رہا تھا اور پھر لارڈ ہونے کی وجہ سے مالی استحکام بھی رکھتا تھا۔ بایں ہمہ یہ چیزیں

اس کو جرم کرنے سے نہ روک سکیں اور وہ اپنے ڈیری فارم میں دودھ میں پانی ملاتے ہوئے پکڑا گیا اور عدالت نے اسے جرمانہ کی سزا بھی دی۔ اس کے پاس دولت تھی علم تھا وہ سب کچھ تھا جو انسان کو بظاہر انسان بننے کے لیے کافی ہے۔ لیکن چونکہ اس کے حقیقی مرض کا علاج نہیں کیا گیا تھا تو وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ایک صالح انسان نہ بن سکا۔ اقبال مرحوم نے ٹھیک کہا تھا:

؎ زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ

اسلام نے یہی سوز دماغ دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جرائم کا اصل سبب نہ فقر و افلاس ہے نہ ناخواندگی نہ احتسابی محکموں کی قلت اور نہ قانون سے بے شعوری۔ بلکہ ان جرائم کا اصلی سبب وہ بیمار ذہنیت ہے جس نے افق سے افق تک پھیلی ہوئی اس دنیا کو اپنا سب کچھ سمجھ رکھا ہے۔ جو اس مادی دنیا کے اس طرف جھانکنے کی صلاحیت سے محروم ہے اور جس کے نزدیک صرف اس چند روزہ زندگی کے مادی منافع اور نفسانی لذتیں ہی انسان کی معراج ہیں۔

انسان کے ذہن میں جرم کا بیج دراصل اس وقت پڑتا ہے جب وہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ میرے نفع و ضرر کی ساری کائنات صرف اسی دنیاوی زندگی میں سمٹی ہوئی ہے اور میری لذت و راحت اور رنج و تکلیف کی انتہا قبر کے کنارے ہونے والی ہے۔ لہٰذا اگر میں نے یہاں زیادہ سے زیادہ دولت' زیادہ سے زیادہ شہرت اور زیادہ سے زیادہ لذت و آسائش' حاصل نہ کی تو گویا اپنی ساری عمر برباد کر دی۔ اور ہمیشہ کے لیے محروم رہ گیا۔ محرومی کا یہ خوف ہی دراصل سارے جرائم کی بنیاد ہے اور یہ خوف اس آخرت ناآشنا ذہنیت سے پیدا ہوتا ہے جو مرنے کے بعد کسی ابدی زندگی کی قائل نہیں۔ جو یہ سمجھتی ہے کہ جب موت میری آنکھیں بند کر دے گی تو پھر وہ کبھی نہیں دیکھ سکیں گی۔ جسے آخرت کی پیش گوئیاں معاذ اللہ محض افسانہ معلوم ہوتی ہیں یہی خیالات ہیں جو انسان کی ہوس کو بھڑکا بھڑکا کر ایک نہ مٹنے والی بھوک اور نہ بجھنے والی پیاس

میں تبدیل کر دیتے ہیں پھر انسان کو لذت و راحت کی کسی منزل پر قرار نہیں آتا۔ وہ عیش و آرام کے کسی درجے پر قانع نہیں ہوتا۔ دنیاوی محرومی کا خوف ایک بھوت کی طرح اس کے اعصاب پر مسلط ہو جاتا ہے اور اسے دنیا طلبی کے جنون میں مبتلا کر کے اس مقام پر لے آتا ہے جہاں اپنی اور صرف اپنی ہوس کے تسکین کے سوا زندگی کا کوئی مقصد باقی نہیں رہتا اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے اسے بدتر سے بدتر راستہ اختیار کرتے ہوئے بھی کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی۔ لہٰذا جب تک یہ بیمار ذہنیت ختم نہ ہو اس وقت تک انسانوں کی کوئی تہذیب جرائم کو ختم نہیں کر سکتی۔ قانون اور اس کی تنفیذ کے ادارے خواہ کتنے ترقی یافتہ ہو جائیں لیکن اگر انسان میں یہ آخرت فراموش ذہنیت باقی ہے تو وہ ان کی ہر چال کا جواب اور ہر تدبیر کا توڑ ایجاد کرتی رہے گی موجودہ دنیا کا تجربہ شاہد ہے کہ جو انسانی ذہانت جرائم کی تحقیق و تفتیش کے ترقی یافتہ طریقے دریافت کر سکتی ہے وہ ارتکاب جرائم کے نئے نئے ڈھنگ نکالنے پر بھی قادر ہے اور جب آگے بڑھنے کی رفتار دونوں طرف برابر ہو تو مجرم اور اس کا تعاقب کرنے والے کے درمیان ہمیشہ ایک ہی فاصلہ برقرار رہے گا اور اس میں کبھی کوئی کمی نہیں آئے گی۔

مختصر یہ کہ انسانی سیرت و کردار کی اصلاح کے لیے اگر کوئی نسخہ کامیاب ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ انسان کے قلب و دماغ سے ان غلط خیالات کو جو پیوست ہو چکے ہیں نکالنے کی کوشش کی جائے اور انسان کو یہ بات سمجھائی جائے کہ یہاں کی دنیا اصل دنیا نہیں یہاں کی رنج و راحت ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں بلکہ موت ایک بہت بڑی حقیقت ہے اور وہ اس قدر ناگہانی طور پر آتی ہے کہ بلبلے کو بھی ٹوٹتے ہوئے اور برف کو پگھلتے ہوئے بھی کچھ وقت لگتا ہے، ہوا کا جھونکا بھی رک رک کر آتا ہے موت کا سفر تو اس سے بھی زیادہ تیز اور اچانک ہے۔ کوئی پتہ نہیں آدمی کو کب آ دبوچے۔ اس لیے آدمی کو زندگی گذارتے ہوئے ہمیشہ یہ احساس رہنا چاہیے کہ:

ہو رہی ہے عمر مثلِ برف کم
رفتہ رفتہ لحظہ لحظہ دم بدم
سانس ہے اک رہروِ ملکِ عدم
دفعتاً" اک روز یہ جائے گا تھم
ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے
کر لے جو کرنا ہے آخر موت ہے۔

امام رازی بازار سے گذر رہے تھے انہوں نے برف بیچنے والے کو یہ آواز لگاتے ہوئے سنا کہ لوگو رحم کرو اس آدمی پر جس کا سرمایہ گھلتا جارہا ہے۔ اگر تم یہ برف خرید لو گے تو میرے دام کھرے ہو جائیں گے ورنہ میرا یہ سرمایہ گھل گھل کر ختم ہو جائے گا۔ امام رازی یہ سن کر چیخ اٹھے۔ انہوں نے فرمایا تمہارا یہ سرمایہ تو گھلتے گھلتے یقیناً ایک متعین وقت لے گا لیکن میرا یہ سرمایہ عمر ہر آن گھل رہا ہے اس کے ختم ہو جانے کا تو کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ نامعلوم کب ختم ہو جائے۔ جب آدمی پر یہ کیفیت طاری رہے کہ میں ایک سفر پر رواں دواں ہوں کوئی پتہ نہیں اس کی منزل (موت) کب آن پہنچے۔ پھر مجھے ایک دوسری دنیا میں داخل ہونا ہے جہاں میرا مال و دولت، میرا عہدہ و منصب، میرا اثر و رسوخ کام نہیں آئے گا۔ بلکہ مجھے ایک بڑی عدالت میں پیش ہو کر زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب دینا ہے بلکہ جب میں اس عدالت میں کھڑا کیا جاؤں گا جس کا جج احکم الحاکمین ہو گا تو زمین میرے پاؤں پکڑ لے گی اور اس وقت تک نہیں چھوڑے گی جب تک میں پانچ باتوں کا جواب نہ دے دوں گا۔ مجھ سے زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب مانگا جائے گا۔ جوانی کی جولانیوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ مال و دولت کی کمائی کے ذرائع اور پھر اس کے مصارف کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ علم کے حصول اور اس کا حق ادا کرنے کے بارے میں مواخذہ کیا جائے گا۔ اور پھر اس کے بعد تفصیلی حساب کتاب ہو گا اور میرے ایک ایک عمل کی جانچ ہو گی میرے منہ پر مہر لگا دی جائے گی۔ میرے ہاتھ اور پاؤں میرے حق میں یا میرے خلاف گواہی دیں گے۔ میں جہاں جہاں زندگی کی سرگرمیوں میں گھومتا پھرتا رہا ہوں وہ ایک ایک جگہ میرے بارے میں

بولے گی۔ وہاں کوئی رشتہ دار کام نہیں آئے گا کوئی دوست مدد کو نہیں پہنچے گا صرف میرے اعمال میرے ساتھ ہوں گے۔ اگر اعمال کا پلڑا بھاری رہا تو حسن جزاء سے نوازا جاؤں گا اور اگر نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہوگیا تو سزا کے لیے ایک ایسے جہنم میں ڈال دیا جاؤں گا جس کی آگ کی تیزی تصور میں بھی نہیں سماسکتی۔ جہاں حسن عمل رکھنے والوں کو ایسی جنتوں سے نوازا جائے گا جس کی نعمتوں کی دل افروزیاں کسی آنکھ نے نہیں دیکھیں، کسی کان نے نہیں سنیں۔ کسی دل میں اس کا تصور تک نہیں گزرا پھر اسی پر بس نہیں وہ پروردگار جو یہ نعمتیں عطا فرمائے گا اپنے نیک بندوں کو بالآخر اپنی رضامندی اور خوشنودی سے گران بار کردے گا اور پھر یہ نعمتیں اور اس احکم الحاکمین کی خوشنودیاں کبھی واپس نہ لی جائیں گی۔

چنانچہ یہی وہ تصورات تھے جس کے ذریعے آنحضرت ﷺ نے وہ صالح انقلاب برپا کیا جس کے نتیجے میں وہ معاشرہ برپا ہوا جس میں جرم کا ارتکاب تو دور کی بات ہے تنہائیوں میں اس کا تصور بھی انسانوں کے لیے ایک گناہ بن گیا۔ دنیا طلبی کے جوش کو اس آخرت طلبی کے جوش نے سرد کر کے رکھ دیا۔ دنیا کی محبت پر آخرت کی محبت غالب آگئی۔ انسانوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے بے غرضی کا ایسا حسن پیدا ہوگیا کہ لوگ ہر معاملہ میں اللہ کی رضا کے طلب گار ہوگئے خود پیاسے رہ کر دوسروں کی جان بچانا ان کا معمول بن گیا۔ خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلانا، اپنی ضرورتوں کو روک کر دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کرنا اس معاشرے کی پہچان بن گیا اللہ کا خوف اور اس کے حاضر و ناضر ہونے کا یقین دلوں میں اس طرح رچ بس گیا کہ اگر کسی ماں نے اپنی بیٹی سے کہا کہ بیٹی اٹھو دودھ میں پانی ملا دو تو بیٹی نے ادب سے عرض کیا کہ اماں آپ نے سنا نہیں "امیرالمومنین" نے اس سے منع فرمایا ہے۔ ماں کہتی ہے کہ بیٹی رات کی اس تنہائی میں امیر المومنین کو کیا خبر کہ ہم کیا کر رہے ہیں تو بیٹی نہایت اطمینان سے جواب دیتی ہے کہ ماں امیر المومنین تو بے خبر ہو سکتے ہیں لیکن ہمارا وہ خالق و مالک تو بے خبر نہیں ہو سکتا۔ جو ہر وقت دلوں کی دھڑکنوں کو بھی سنتا ہے۔

اور اگر مدائن کی فتح کے بعد کسی بدو کو کسریٰ کا تاج مل جاتا ہے اور وہ رات کی تاریکی میں اپنے پلو میں چھپا کر امیر لشکر کے خیمے میں لے جاتا ہے اور بڑی خوشی سے ان کے سپرد کر کے جب لوٹنے لگتا ہے تو امیر لشکر نے روک کر کہا کہ بھائی ماشاء اللہ تم بہت دیانتدار اور خدا سے ڈرنے والے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ تمہارے اس عمل سے مجھے بے پناہ خوشی ہوئی ہے کہ دنیا کی سب سے قیمتی چیز تمہارے ہاتھ لگی لیکن وہ تمہاری دیانت و امانت میں ذرہ بھر تزلزل پیدا نہیں کر سکی کیا تم مجھے اپنا نام نہیں بتاؤ گے تاکہ میں امیر المومنین کو لکھوں کہ وہ تمہیں انعام و اکرام سے نوازیں۔ تو اس بدو نے غضبناک نگاہوں سے اپنے امیر کو دیکھا اور نہایت اطمینان سے کہا کہ عمر کو لکھ دیجئے کہ میں نے یہ کام تمہارے لیے نہیں کیا بلکہ جس کے لیے میں نے یہ کام کیا ہے وہ میرا نام جانتا ہے۔

چنانچہ انہی احساسات اور دل و دماغ کی تطہیر کا نتیجہ تھا کہ اول تو کسی جرم کی طرف قدم بڑھتے ہی نہیں تھے اور اگر کبھی اتفاق سے کوئی جرم سرزد ہو جاتا تو آخرت کا خیال اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا جب تک اس کی مکمل تلافی نہیں ہو جاتی تھی۔ چنانچہ جس معاشرے میں زنا اور بدکاری جوانی کا ایک معمولی سا کھیل تھا وہاں دیکھنے والوں نے دیکھا کہ زناکاری کی شرح گھٹتے گھٹتے صفر تک پہنچ گئی اور کبھی سالوں میں اتفاقی طور پر کوئی ایک آدھ واقعہ پیش آیا بھی تو معاذ اور غامدیہ کا جنہوں نے خود اقرار کر کے اپنے آپ کو سنگساری کی اذیت ناک موت کے حوالے کیا اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ یہ بے مثال واقعہ آج تک تاریخ اور احادیث کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ غامدیہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے جرمِ زنا کا اعتراف کرتی ہیں۔ آپ بار بار ان سے منہ پھیر کر انہیں مجرم تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ اگر مجھے مجرم تسلیم کر لیا گیا تو مجھے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے گا لیکن وہ ہر بار حضور ﷺ کے سامنے آ کر اصرار کرتی ہے کہ مجھ پر شریعت کی سزا جاری فرمائی جائے جب ان کے بار بار اقرار سے جرم ثابت ہو

جاتا ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ چونکہ تمہارے پیٹ میں ابھی ایک امانت ہے جب تک تم اسے ادا نہ کر دو گی اس وقت تک تمہیں سزا نہیں دی جاسکتی۔ چنانچہ وہ واپس چلی جاتی ہیں۔ بچہ پیدا ہوتا ہے پھر لوٹ کر آتی ہیں۔ حضور فرماتے ہیں کہ اس بچے کو تمہارے دودھ کی احتیاج ہے جب بچہ کھانے پینے کے قابل ہو جائے تب میرے پاس آنا۔ اس وقت تم پر سزا جاری کی جائے گی۔ غامدیہ چلی جاتی ہیں اور پھر اس وقت لوٹ کر آتی ہیں جب بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا ہوتا ہے اور وہ کھا رہا ہوتا ہے آپ سے عرض کرتی ہیں کہ اب بچے کو میرے ددھ کی ضرورت نہیں رہی اب مجھے سنگسار کر دیا جائے۔ ذرا اندازہ فرمایئے کہ غامدیہ کے پیچھے نگرانی کے لیے کوئی پولیس مقرر نہیں کی جاتی اور ان کے نام پتہ رجسٹرڈ نہیں کیا جاتا۔ کوئی ضمانت طلب نہیں کی جاتی۔ لیکن وہ خود بخود جاتی ہیں اور واپس آتی ہیں لیکن اس سے بھی بڑھ کر بات یہ ہے کہ ماں کی مامتا دنیا کا سب سے زور دار جذبہ ہے۔ ایک ماں اپنے لئے کم اور بچے کے لیے زیادہ جیتی ہے وہ زندگی کا ہر دکھ بچے کی خاطر سہنے کے لیے تیار رہتی ہے لیکن یہ غامدیہ بھی ایک ماں ہے جب اس کی گود میں بچہ ہمکتا ہوگا اپنی پیاری پیاری بانہیں اس کی گردن میں حمائل کرتا ہوگا۔ اس کی مسکراہٹیں کیا اسے جینے کی نوید نہیں سناتی ہوں گی؟ کیا اس کی چھوٹی موٹی شوخیاں اس کے دل میں یہ آرزو پیدا نہ کرتی ہوں گی کہ میں اپنے لیے نہیں تو اپنے بچے کے لیے زندہ رہوں لیکن ان سب جذبات پر وہ کون سی چیز ہے جو غالب آتی ہے وہ صرف ندامت کا ایک احساس ہے اور اللہ کا خوف ہے جو زندگی کی دلفریبیوں پر غالب آتا ہے اور بچے کی ساری دلکش اداؤں کے باوجود وہ موت کو اپنے سینے سے لگا لیتی ہے اور پتھروں کی بوچھاڑ میں محض اپنے مالک کو راضی کرنے کے لیے جان دے دیتی ہے اور وہ مرتبہ پاتی ہے جس کے بارے میں آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ عمر اس عورت نے ایسی توبہ کی ہے اگر اس کا دسواں حصہ اہل مدینہ پر تقسیم کر دیا جائے تو سب کی مغفرت ہو جائے۔ عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں ایسی سیکنڑوں مثالیں آپ کو ملیں گی اور یہ صرف کرشمہ تھا اس عقیدۂ آخرت

کا جو معاشرے کی رگ و پے میں پیوست کر دیا گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں ایک ایسا انسان تیار ہوا جس کا ہر قدم اللہ کے خوف سے گراں بار رہتا تھا۔ جس کی ہر سوچ خوف آخرت کی چھلنی سے ہو کر گذرتی تھی جس کا ہر عمل جوابدہی کے احساس نے سنجیدہ اور باوقار بنا دیا تھا۔ جس کا وجود زمین پر اللہ کی رحمت اور امانت و دیانت کی علامت بن تھا۔ آج بھی اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ مشرق و مغرب کے انسان کو دوبارہ انسانیت کے جامہ میں لے آئیں اور انسان جرائم پیشہ بننے کی بجائے مروت اور خیر خواہی کا پیامبر بن جائے اور یہ نفرتوں کی آگ میں جلنے والی دنیا اخوت و محبت کی جنت بن جائے تو اس کی یہی ایک صورت ہے کہ انسان کے قلب و دماغ کو انہی خیالات و احساسات کا پیکر بنا دیا جائے جس کا نام "فکرِ آخرت" ہے۔

# عبادت کا مفہوم اور اس کی حقیقت

محترم خواتین و حضرات!

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جن و انس کا مقصد تخلیقِ عبادت ٹھہرایا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

انسانوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور رسول مبعوث فرمائے اور قرآن کریم کی صراحت کے مطابق تمام انبیاء اور رسولوں کی دعوت کا عنوان صرف عبادت رہا۔ پروردگار کا ارشاد ہے:

"وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِی کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُولًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہ"

ہم نے ہر امت کی طرف رسول بھیجا (انہوں نے آکر انہیں اللہ کا پیغام پہنچایا) کہ لوگو اللہ کی عبادت کرو۔

رسول اللہ ﷺ سب پیغمبروں کے آخر میں خاتم النبین بن کر تشریف لائے اور آپ کے بعد نبوت اور رسالت کا دروازہ بند ہو گیا اور آپ کے واسطے سے اللہ تعالیٰ قیامت تک کے آنے والے انسانوں کو جو ہدایت دینا چاہتا تھا اسے تکمیلی انداز میں انتہائی جامعیت کے ساتھ عطا فرما دیا گیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں اس دعوت کا جہاں آغاز فرمایا گیا اس کا عنوان بھی یہی عبادت رکھا گیا۔ ارشاد ہوا:

"یا ایھا النّاس اعبُدوا ربّکم الّذی خَلَقَکُم والّذین من

قبلکم"

> اے لوگو عبادت کرو اپنے اس رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں عبادت کی کیا اہمیت ہے۔ کیونکہ یہی جن و انس کا مقصدِ تخلیق ہے، یہی تمام انبیاء کی دعوت تھی اور یہی دعوت رسول اللہ ﷺ نے انتہائی جامعیت کے ساتھ جن و انس تک پہنچائی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس عبادت کا مفہوم کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ جب مبعوث ہوئے تو آپ کی تشریف آوری سے پہلے دنیا میں عبادت کے حوالے سے چار تصورات پائے جاتے تھے:

1- مشرکینِ مکہ کی عبادت کا تصور: ان کے نزدیک خالقِ کائنات کی حیثیت ایسے تھی جیسے ایک سلطنت کا بادشاہ ان کا خیال یہ تھا کہ سلطنت کا قانون صرف بادشاہ کی زبان ہوتی ہے وہ جو کہہ دے اور جس بات کا حکم دے دے وہ قانون بن جاتا ہے اور اس سلطنت میں محفوظ زندگی کی ضمانت بادشاہ کی رضامندی ہے۔ وہ جب تک رعایا سے خوش ہے تو رعایا کو انعام و کرام سے نوازتا ہے اور جب وہ ان سے ناراض ہوتا ہے تو انہیں سزائیں دیتا ہے۔ اور اس کی رضامندی کا حصول بادشاہ کی تعریف و ستائش اور اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، اس کی چاکری کرنا اور ہر ممکن طریقے سے اس کو خوش رکھنے میں ہے۔ اب ظاہر ہے یہ سارے اعمال صرف بادشاہ کے سامنے کے ہیں۔ جب رعایا کا کوئی فرد بادشاہ کے سامنے ہوتا ہے تو یہ سارے اعمال بجالاتا ہے اور جب بادشاہ کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے تو اب وہ اپنی مرضی کا مالک ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بادشاہ اس کے حال سے واقف نہیں۔ اب اس کے سامنے بادشاہ کی رضامندی کی صرف ایک صورت ہے کہ مقامی طور پر جن لوگوں کو اس نے اپنے نمائندہ کے طور پر مقرر کر رکھا ہے انہیں خوش رکھا جائے اور

انہیں کوئی شکایت کا موقع نہ دیا جائے۔ چنانچہ انہی تصورات کے تحت وہ اللہ تعالیٰ کو بادشاہ سمجھ کر اس کے چند لگے بندھے رسم و رواج اور پوجا پاٹ کے طریقوں کو بجالاتے تھے۔ بیت اللہ کا طواف کرتے، سال بہ سال حج کر لیتے، اس کے غصے کو بڑھکنے سے روکنے کے لیے قربانیاں کرتے اور ان بتوں کی پوجا کرتے تھے جن کو یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کی مرضی میں انہیں بھی دخل ہے۔

-2 عبادت کا دوسرا تصور ہمارے قریبی ہمسائے ہندوؤں اور انہی سے نکلنے والے بدھ مت کا تھا۔ ان کے تصور کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو تو وہ ہے جو مشرکین مکہ کے یہاں پایا جاتا ہے اور ان کے نزدیک بھی اللہ تعالیٰ ایک بادشاہ ہے جسے لگی بندھی رسموں کو ادا کرنے سے اور بعض قربانیاں پیش کرنے سے خوش کیا جاسکتا ہے۔ زندگی کے معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور دوسری طرف وہ اللہ کی بندگی کو اس قدر بلند اور عظیم سمجھتے تھے کہ اس کا حق دنیا میں رہ کر، دنیا کے معاملات میں شریک ہو کر ادا ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے ترکِ دنیا یعنی دنیا کو چھوڑ دینا ضروری ہے۔ دنیا ان کے نزدیک ایک آلودگی اور گندگی کا نام ہے۔ جس میں آلودہ ہو کر اللہ کو پکارا نہیں جاسکتا۔ چنانچہ اس لیے ان کے یہاں عبادت کا عظیم تر تصور جوگی ازم کی شکل میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ ان کے مذہبی لوگ جب گیان حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے تو وہ تارک الدنیا ہو کر پہاڑوں یا جنگلوں میں جا بیٹھتے، اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ جسمانی راحتوں سے دور رکھتے، شادی بیاہ کا تصور ان کے یہاں ممنوع ٹھہرتا اور کم سے کم کھانے پر اکتفا کرکے وہ اپنے نفس کی پاکیزگی کا سامان کرتے۔ اور اس کو وہ عبادت سمجھتے تھے۔

-3 عبادت کا تیسرا تصور ہم عیسائیوں میں دیکھتے ہیں۔ عیسائیت پر بھی بعض محققین کے نزدیک ہندو ازم کا اثر ہے۔ اس لیے انہوں نے اسی

جوگیانہ تصور کو رہبانیت کے نام سے اختیار کیا اور ترک دنیا کو انتہائے بندگی کی علامت سمجھ کر اختیار کرلیا بلکہ ان کے نزدیک تو ہندو ازم سے زیادہ ترکِ دنیا کا رجحان پایا جاتا ہے۔ جس کو انہوں نے رہبانیت کا نام دیا۔ اس لیے ان کے یہاں جو خدا رسیدہ لوگ سمجھے جاتے تھے اس کا تارک الدنیا ہونا یعنی راہب ہونا ضروری تھا اور ایسے ہی لوگوں کی ان کے یہاں قدر و منزلت تھی اور دوسری بات ان کے یہاں ہندوؤں کی طرح ہی یہ بھی نظر آتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دوسرے مشرکین مکہ کی طرح انسانی دسترس سے بہت بلند سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ یہ ناممکن جانتے تھے کہ انسان کی بندگی اور اس کی دعائیں براہ راست بھی اللہ تعالیٰ تک پہنچ سکتی ہیں۔ اس لیے وہ خدا اور بندے کے درمیان واسطوں کے تصور کو ضروری خیال کرتے تھے۔ مشرکین مکہ کے یہاں کاہنوں کا تصور' ہندوؤں کے یہاں برہمنوں کا تصور' اور عیسائیوں اور یہودیوں کے یہاں مذہبی رہنماؤں کا تصور اسی تصور کا نتیجہ ہے؟ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ جب تک ان درمیان کے واسطوں کو خوش نہیں رکھا جائے گا اور انہی کے حوالے ے جب تک اللہ تعالیٰ سے رابطہ نہ کیا جائے گا اس وقت تک اللہ تعالیٰ نہ تو خوش ہو سکتا ہے اور نہ ہماری بندگی اس تک پہنچ سکتی ہے۔

چوتھا تصور یہود کا تصور ہے۔ وہ اگرچہ نسبتا" اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی صفات کے فہم میں ان تمام اہلِ مذاہب سے بہتر تھے۔ لیکن درمیانی رابطوں کا تصور ان کے یہاں بھی پایا جاتا ہے اور یہ بھی تابوتِ سکینہ اور اولادِ ہارون علیہ السلام کو واسطہ بنائے بغیر اللہ تعالیٰ کے تشریعی اور تعبدی تعلق کو ناممکن سمجھتے تھے۔ حتی کہ حلت و حرمت کا اختیار بھی انہوں نے اپنے مذہبی راہنماؤں کو دے رکھا تھا اس لیے قرآن کریم نے واضح طور پر یہ ارشاد فرمایا کہ انہوں نے

اپنے احبار اور رہبان کو رب بنا رکھا ہے۔

یہ تھے عبادت کے وہ تصورات جو حضور ﷺ کی بعثت کے وقت دنیا میں موجود تھے۔ جنہیں خلاصے کے طور پر یوں کہا جاسکتا ہے کہ عبادت ان کے یہاں مندرجہ ذیل نکات پر پر مشتمل تھی۔

1- اللہ تعالیٰ کو ایک بادشاہ تصور کرکے چند وقتی مراسم کو بجالانا۔

2- دنیوی معاملات میں اللہ تعالیٰ کو دخیل نہ سمجھنا۔

3- اللہ اور بندے کے تعلق کو دونوں کے درمیان ایک پرائیوٹ معاملہ سمجھنا۔

4- انسان براہ راست اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا نہیں کر سکتا اس لیے درمیانی واسطوں کو ضروری سمجھنا۔

5- خدا رسیدہ بننے کے لیے ترکِ دنیا یعنی رہبانیت اختیار کرنا کیونکہ دنیا ایک آلودگی ہے۔ اس آلودگی میں مبتلا شخص اللہ تعالیٰ سے قرب کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

اسلام نے آکر ان تمام تصورات کی اصلاح فرمائی۔ اس نے سب سے پہلے اس بات کو واضح کیا کہ عبادت صرف بندگی کے چند مراسم بجالانے کا نام نہیں۔ بلکہ اس نے عبادات کے نام سے بندگی کے جن طریقوں کو اپنے ماننے والوں کے لیے لازم ٹھہرایا ہے اس کے بارے میں واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ یہ اسلام کی بنیادیں ہیں یہ اسلام کی مکمل عمارت نہیں ہے۔ ان کی حیثیت یہ ہے کہ کوئی آدمی ان سے صرف نظر اور انکار کرکے مسلمان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ لیکن صرف انہی کو بجالانا مکمل عبادت نہیں ہے۔ کیونکہ صرف بنیادیں بھر دینے سے عمارت وجود میں نہیں آجاتی البتہ یہ ضرور ہے کہ جب بھی عمارت بنے گی انہی بنیادوں پر بنے گی۔ چنانچہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

بُنِیَ الاسلامُ علی خمسٍ

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔

نماز کو عبادت میں سب سے اہم حیثیت حاصل ہے۔ یہاں تک فرمایا

گیا کہ نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو نماز نہیں پڑھتا وہ مسلمان تو کہاں وہ تو مشرک ہے۔ اور یہ بھی فرمایا گیا کہ قیامت کے دن جس عمل کے بارے میں سب سے پہلا سوال ہو گا وہ نماز ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم قرآن کریم میں دیکھتے ہیں کہ صاف طور پر فرمایا گیا:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکرِی

کہ نماز میری یاد کے لیے قائم کرو اُس کا مطلب یہ ہے کہ نماز اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود اصل مقصود نہیں۔ بلکہ مقصد پوری زندگی میں اللہ کی یاد ہے کہ وہ کسی کام میں بھی دل سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ مزید ارشاد فرمایا:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنھٰی عَنِ الفَحشَاءِ وَالمُنکَر

کہ نماز تو بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں نماز مثبت حیثیت سے اللہ کی یاد کا ذریعہ ہے وہاں اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ وہ بے حیائی اور منکرات سے روکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی نماز آدمی کو بے حیائی اور بری باتوں سے نہیں روکتی تو وہ نماز مقصد نہیں ہے بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ نماز یعنی عبادت ایسی ہونی چاہیے جس کے نتیجے میں پوری زندگی کی فکری اور عملی تطہیر ہو جائے۔ اس لیے اسلام نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس نے عبادت کو اللہ اور بندے کے درمیان پرائیویٹ معاملہ کی بجائے اس کو پوری زندگی کا دستور اور وظیفہ ٹھہرایا اور دوسرا تصور اس نے یہ دیا کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام عظمتوں کے باوجود انسان کے اس قدر قریب ہے کہ شہ رگ بھی انسان کے اس قدر قریب نہیں۔ یعنی شہ رگِ حیات زندگی کی بقا کی ضامن ہے اس کے کٹ جانے سے زندگی کی شہ رگ کٹ جاتی ہے ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز انسان کے قریب نہیں ہو سکتی۔ مگر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں اور دوسرا اس نے اپنی کتاب میں بار بار فرمایا کہ میں سمیع ہوں، بصیر ہوں، علیم ہوں، تمہارا کوئی عمل حتی کہ تمہارا کوئی احساس اور خیال بھی میرے علم سے باہر نہیں۔ اور تمہاری کوئی حرکت میری نگاہوں

سے او جھل نہیں۔ تو جو ذات اس قدر قریب ہے اور اس قدر انسان سے آگاہ ہے اس کے اور بندے کے درمیان کسی اور واسطے کا کیا معنی۔ اس لیے اس نے بار بار ارشاد فرمایا کہ تم مجھ پر ایمان لائے ہو تو پھر مجھی کو پکارو، میں تمہاری ہر پکار کو سنتا ہوں۔ اور اسے قبول کرتا ہوں۔ اسی طرح اس نے درمیانی واسطے کا تصور ختم کر دیا۔ مزید اس نے یہ اصلاح فرمائی کہ عبادت کا تعلق چونکہ تمہاری پوری زندگی سے ہے اور تم اپنی زندگی دنیا اور اہل دنیا میں رہ کر گزارو گے اس لیے دنیا اور اہل دنیا سے تعلقات تمہاری عبادت سے کیسے خارج ہو سکتے ہیں اور تم دنیا سے لاتعلق ہو کر عبادت کے تقاضوں کو کیسے پورا کر سکتے ہوں۔ اس لیے عبادت یہ نہیں کہ تم دنیا سے ترک تعلق کر کے صرف اللہ کا نام پکارتے رہو بلکہ عبادت یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر دنیا کو برت کر اس طرح دکھاؤ نہ تمہارا دل کبھی اللہ کے تصور سے غافل ہو اور نہ تمہارا قدم کبھی اس کی عائد کردہ حدود سے باہر نکلے۔ نہ تمہارا ہاتھ کبھی اس کے حکم کو توڑے اور نہ تمہارے دل و دماغ کی قوتیں کبھی اس سے بغاوت کریں۔ جس طرح تم بھوکے رہ کر اس کی بندگی کرنے کے پابند ہو اسی طرح پیٹ بھر کر بھی، دولت مند ہو کر بھی، حتی کہ تخت و تاج کے مالک ہو کر بھی اسی کے بندے ہو، اور ان تمام حالتوں میں اس کی بندگی بجا لانا اس کی عبادت ہے۔ اس طرح ان کے غلط تصورات کا ابطال فرما کر اور غلط خیالات کو رد کر کے اسلام کا صحیح تصور عبادت پیش کیا۔ لیکن اسلام کا کامل تر تصور عبادت اس وقت تک سمجھ نہیں آئے گا جب تک کہ عبادت کے معنی اور اس کے مصداق کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے۔

**عبادت اور عبودیت** عبد۔ عبد سے مصدر ہے اور اس سے بننے والا ایک مشہور لفظ جو عربی اور اردو دونوں زبانوں میں اکثر مستعمل ہے وہ عبد ہے۔ عبد کا معنی ہے غلام اور اردو اور عربی میں یہ اسی معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور قرآن کریم نے بھی اس کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا:

الحر بالحر والعبد بالعبد

یہاں دیکھئے کہ حر کے بعد جس کا معنی آزاد ہے لفظ عبد غلام کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کرنے کا حکم دیا گیا تو فرمایا:

وانکحو الایامی منکم والصالحین من عبادکم وامائکم

اس آیت میں دیکھئے لونڈیوں کے مقابل میں عباد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو عبد کی جمع ہے۔ اسی طرح کائنات کی تمام مخلوق کے بارے میں جن میں نمایاں خود حضرتِ انسان ہے ارشاد فرمایا گیا:

اِن کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰت والارض الا آتِی الرَّحمٰنِ عَبْدًا

یہاں بھی دیکھئے عبد کا لفظ غلام کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے اسی طرح قرآن پاک میں اور بھی کئی مواقع پر آپ کو عبد یا عباد کا لفظ غلام کے معنی میں مستعمل نظر آئے گا۔ اسی طرح عبد کو باب تفعیل میں لے جاکر غلام بنانے کے معنی میں قرآن کریم میں ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے بیان کیا گیا کہ:

تِلکَ نِعمَۃٌ تَمُنُّھَا عَلَیَّ اَن عَبَّدتَّ بَنِی اِسرائیل

یہاں دیکھئے عبدت غلام بنانے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

مختصر یہ کہ عبد کا معنی ہے غلام اور عبادت، عبودیت، عبد سے مصدر ہے اس کا معنی ہے غلامی۔

اس غلامی کے حوالے سے قرآن و سنت اور اسلامی تاریخ میں ہمیں دو متضاد تصورات پہلو بہ پہلو سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ پہلا تصور یہ ہے کہ غلامی اسلام کی نگاہ میں انتہائی مکروہ اور ناقابل قبول ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسی برائی ہے جس کے تصور کو قبول کرنے سے اسلام انکار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پورے قرآن پاک میں ہمیں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا کہ اگر امت غلام بنالی جائے تو پھر اسے زندگی کس طرح گذارنی چاہیے بلکہ ہم پورے قرآن کریم میں ایک آزاد قوم کے تصور زندگی اور تصور معیشت کو جابجا پھیلا ہوا دیکھتے ہیں۔

بلکہ قرآن پاک میں بے شمار مرتبہ اس بات کو دہرایا گیا کہ تمہاری زندگی کے مقاصد میں نمایاں ترین مقصد یہ ہے کہ تم طاغوت سے اجتناب کرو۔ چنانچہ جس آیت شریفہ میں انبیاء کی دعوت کے حوالے سے عبادت کا ذکر کیا گیا ہے اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا: "واجتنبوا الطاغوت"

اور تاریخ اسلامی میں ایسے متعدد واقعات ہمیں ملتے ہیں جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جن اصولوں کی بنیاد پر حالات بدلنے کے لیے اٹھے تھے ان میں سب سے بڑی بات انسان کو غیر اللہ کی غلامی سے آزاد کرانا تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل عجم سے جو پہلی بڑی جنگ لڑی گئی ہے وہ جنگ قادسیہ ہے۔ اس میں حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ جب مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر رستم کے دربار میں گئے تو رستم نے پوچھا کہ تم کس مقصد کے لیے آئے ہو تو آپ نے فرمایا تھا کہ ہم اس لیے آئے ہیں تاکہ انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کرائیں۔ اس سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ غلامی کا تصور اسلام کی نگاہ میں کس قدر ناپسندیدہ اور کس قدر ناقابل قبول ہے۔ لیکن دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ تصور بھی قرآن پاک اور اس کی تعلیمات میں پوری طرح سرایت کئے ہوئے ہے اور جابجا ہمیں پھیلا ہوا ملتا ہے کہ قرآنی تعلیمات کا حقیقی مقصد انسان کو اللہ کا غلام بنانا ہے اور جو لوگ اللہ کے حکم کی اطاعت اور اس کے راستے میں سرفروشی کی وجہ سے اس کے قرب کا مقام پالیتے ہیں تو انہیں اس راستے میں جو بڑے سے بڑا اعزاز مل سکتا ہے وہ یہی لفظ عبد ہے جس کا معنی غلام ہے۔ فرشتے اللہ کے حکم سے اور اس کی اطاعت سے کبھی سرتابی نہیں کرتے۔ ان کی تعریف کرتے ہوئے پروردگار نے فرمایا "ہم عباد مکرمون۔

کہ وہ معزز غلام ہیں انبیاء کرام کا گروہ انسانیت کا گل سرسبد ہے۔ ان کی تعریف میں بھی جابجا یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا:

وَوَهَبْنَا لِداؤدَ سَلیمان نعم العبد

کہ ہم نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حضرت سلیمان علیہ السلام جیسا بیٹا

عطا فرمایا تھا وہ کتنا اچھا غلام تھا۔ رسول اللہ ﷺ جو مقصودِ کائنات اور سید المرسلین ہیں ان کا بھی سب سے بڑا اعزاز یہی لفظ عبد ہے۔ معراج شریف کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا: سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے عبد یعنی اپنے غلام کو ایک ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصاء تک۔ یہاں دیکھئے حضور ﷺ کو عبد سے یاد کیا گیا حالانکہ حسی معجزات میں سے معراج حضور کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اس معجزے کے حوالے سے جب حضور کا ذکر کیا جائے گا تو یقیناً اس اعزاز کے ساتھ کیا جائے گا جو اللہ کی نگاہ میں انتہائی قدر و منزلت کا حامل ہو گا۔ مگر ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ حضور کو عبد کے لفظ سے یاد کیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عبدیت اللہ کی نگاہ میں ایک انسان کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ شائد اسی وجہ سے کلمہ شہادت میں بھی "اشھدان محمدا عبدہ و رسولہ" فرمایا گیا یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کے بندے اس کے غلام اور اس کے رسول ہیں۔

اب دیکھئے یہ متضاد تصورات کہ ایک طرف غلامی سے نفرت اور دوسری طرف غلامی ہی منزلِ مقصود ہے اس تضاد کو سمجھنے کے لیے ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے وہ یہ کہ انسان کو جو خصوصیات دے کر پیدا کیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ غلامی اور عبدیت انسان کی فطرت ہے وہ اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ وہ ہزار یہ دعویٰ کرے کہ میں ایک آزاد زندگی اختیار کرنا چاہتا ہوں جس میں کوئی پابندی' کسی اطاعت اور کسی بندگی کا شائبہ تک نہ ہو مگر عملاً" اس کے لیے یہ ممکن نہیں کیونکہ وہ غذا کا محتاج ہے اس احتیاج سے بچ نہیں سکتا۔ وہ آرام کے حصول کا خوگر ہے اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ وہ نہ جانے کتنے ماؤف لمحوں میں کبھی خوف اور کبھی امید کی گرفت میں آجاتا ہے اس سے وہ آزاد نہیں ہو سکتا۔ محبت اور نفرت اس کے ایسے لاحقے میں جو اس سے الگ نہیں کئے جاسکتے۔ بڑا بن کر رہنا اور دوسروں پر برتری ظاہر کرنا یہ اس کی وہ اندرونی خواہشیں ہیں کہ جن کی زنجیروں کو وہ توڑ

نہیں سکتا۔ ممکن ہے کہ وہ بادشاہت کی غلامی سے بچ جائے۔ وہ کسی نظام کو ماننے سے انکار کر دے۔ وہ برادری کی برتری سے بغاوت کر دے۔ لیکن سٹیٹس اور پرسٹیج کی پوجا اور خواہشات کی پیروی سے وہ کبھی آزاد نہیں رہ سکتا۔ یہ غلامی کی وہ چند در چند صورتیں ہیں جس کی کسی نہ کسی صورت میں وہ ضرور قید رہتا ہے اور یہی وہ قیود ہیں جو اس کی صلاحیتوں کے لیے سم قاتل ثابت ہوتی ہیں وہ جتنا جتنا ان غلامیوں سے آزاد ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی شخصیت میں قوت کے سوتے پھوٹتے جاتے ہیں اور جتنا جتنا ان غلامیوں کا شکار ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی صلاحیتیں دھیمی پڑتی جاتی ہیں۔ بقول اقبال:

؎ بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

چنانچہ انسانیت کا مستقبل، انسان کی صلاحیتوں اور اس کے آزاد ارادوں کو بروئے کار لانے اور اس کے ولولوں ہمموں اور اس کی امنگوں کے پھلنے پھولنے میں مضمر ہے اس لیے پروردگار نے ہر قسم کی غلامی کو انسان کے لیے حرام قرار دے دیا۔ لیکن دوسری طرف چونکہ غلامی اس کی فطرت میں داخل ہے جس سے وہ کسی صورت بچ نہیں سکتا اس لیے ایک ایسی غلامی اس کی منزل مقصود بنا دی گئی کہ جس غلامی کو قبول کرنے کے بعد آدمی باقی ساری غلامیوں سے نجات پا سکتا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر مخلوق کی غلامیوں میں سے کسی غلامی کو مشروع قرار دیا جاتا تو پھر مخلوق کی باقی غلامیوں سے بچنا ممکن نہ ہوتا۔ اس لیے مخلوق کی ہر غلامی سے آزادی کا حکم دیا گیا اور صرف ایک غلامی کا جواز بخشا گیا بلکہ اس کا حکم دیا گیا وہ ہے ہمارے آقا اور خالق کی غلامی کیونکہ خالق کی پرستش، اور خالق کی اطاعت اس کی غلامی کے بغیر ممکن نہیں اور پھر یہ وہ غلامی ہے جو باقی تمام غلامیوں سے خلاصی اور نجات کا ذریعہ ہے۔ بقول اقبال:

؎ یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہی وہ غلامی ہے جس سے مخلوق کی ہر طرح کی غلامی کی جڑ کٹ جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں آدمی آزادی کے اس تصور کو پاسکتا ہے جس کے سائے میں اس کی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں خواہشیں صحیح حدود میں محدود رہتیں اور اس کے ولولے پوری طرح بروئے کار آتے ہیں۔ چنانچہ ہم آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب و عجم میں جس بری طرح سے انسان کو بگڑا ہوا دیکھتے ہیں اس کی اگر حقیقت کو سمجھا جائے تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس دور کا انسان پوری طرح اپنی خواہشوں کی گرفت میں تھا۔ وہ صرف اپنے مفادات کے لیے جیتا اور اپنے مفادات کے لیے مرتا تھا۔ خواہشات اور مفادات میں چونکہ اجتماعی تصادم ہے نتیجتہً اللہ کی یہ زمین فساد سے بھر گئی تھی اور انسانیت کا مستقبل تاریک ہو کر رہ گیا تھا۔ جیسے ہی اس پر اللہ کی غلامی کی سحر طلوع ہوئی اس نے رفتہ رفتہ انسان کو اس کی خود عائد کردہ زنجیروں سے آزاد کیا تو وہ انسان تیار ہوا جس کی نظیر نہ اس سے پہلے کبھی چشم فلک نے دیکھی تھی اور نہ آج پوری طرح دکھائی دیتی ہے۔ لیکن صدیوں سے وقت اس کی راہ تک رہا تھا۔ وہ بالاخر صحابہ کی شکل میں نظر آئی۔ بقول اقبال:

؎ طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ راز اس نے پایا انہی کے جگر میں

اور پھر دعا کرتا ہے کہ:

؎ دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اس غلامی کا صحیح مفہوم کیا

ہے۔ ہم نہایت اختصار سے عرض کریں گے کہ غلامی کے اس مفہوم میں چار تصورات داخل ہیں۔

1- غلام اسے کہتے ہیں جسے حق ملکیت حاصل نہ ہو۔ اس کے پاس جو کچھ ہے چاہے وہ جسم ہے یا جان' اس کی صلاحیتیں ہیں یا اس کی امنگیں' اس کا مال و دولت ہے یا اس کے تعلقات ان میں سے وہ کسی چیز کا مالک نہیں۔ ان تمام چیزوں کا مالک اس کا آقا ہے جس کا وہ غلام ہے۔

2- چونکہ وہ ان میں سے کسی چیز کا مالک نہیں اس لیے وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں اپنے زیرِ تصرف چیزوں میں اپنی مرضی کرنے کا حق رکھتا ہوں۔ یعنی مجھے آزادانہ تصرف کا حق حاصل ہے کہ جیسے چاہوں اور جہاں چاہوں استعمال کروں۔ اس لیے کہ آزادانہ تصرف کا حق اور من مرضی کا اختیار وہاں ہوتا ہے جہاں آدمی کو حقِ ملکیت حاصل ہو۔ کیونکہ اسی حق سے باقی حقوق پیدا ہوتے ہیں۔

3- غلام وہ ہوتا ہے جو اپنی زندگی کا نصب العین اور زندگی کا مقصد ازخود متعین نہیں کر سکتا۔ وہ خود یہ فیصلہ کرنے کا حق نہیں رکھتا کہ مجھے زندگی کس طرح گذارنا ہے۔ میں ایک عالم بن کر زندگی گذاروں یا ایک استاد بن کر۔ مجھے انجینئر بننا ہے یا ایک تاجر بننا ہے۔ میں زندگی اپنے لیے گذاروں یا لوگوں کی خدمت کے لیے صرف کروں۔ ان میں سے اسے کسی بات کا حق نہیں ہوتا۔ اس کی ان باتوں کا اختیار اس کے آقا کو ہے۔ وہ جو اس کا مقصد زندگی متعین کر دے گا اسے اسی مقصد کے مطابق زندگی گذارنا ہوگی۔

4- اس غلام کا آقا اسے جس حال میں رکھے اسے اس بات کا حق نہیں ہوتا کہ وہ حرفِ شکایت زبان پر لائے وہ ادب اور احترام سے اپنی ضرورتیں اپنے آقا کی خدمت میں پیش کر سکتا ہے بلکہ شائد آقا کو یہ بات اچھی لگے کہ اس کا غلام اس سے مانگے بلکہ مانگتا رہے۔ لیکن اگر

وہ اسے دینا پسند نہ کرے یا اس کی مرضی کے مطابق دینا پسند نہ کرے تو اسے یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس کے خلاف سوچے، زبان کھولے، یا دوسروں سے شکایت کرے۔ تاریخ میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مبارک ایک دن اپنے گھر میں بیٹھے تھے کھڑکیوں کے شیشوں سے انہوں نے گلی میں دیکھا کہ ایک نوجوان باربار کسی کام کے لیے اس یخ بستہ رات میں آجا رہا ہے۔ انہوں نے اسے غور سے دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس نے اکہرا لباس پہن رکھا ہے اور اوپر کوئی گرم چادر تک نہیں بہت حیران ہوئے۔ نہ رہ سکے۔ اس نوجوان کو اندر طلب کیا۔ پوچھا صاجزادے تمہیں سردی نہیں لگتی؟ اس نے عرض کیا، جی لگتی ہے۔ کہاں تم نے گرم کپڑے کیوں نہیں پہنے؟ عرض کیا کہ گرم کپڑے میرے پاس نہیں ہیں۔ فرمایا تم کون ہو؟ عرض کیا کہ فلاں صاحب کا غلام ہوں۔ پوچھا تم نے اپنے آقا سے گرم کپڑے نہ ہونے کی شکایت نہیں کی۔ اس نے حیران ہو کر حضرت عبداللہ ابن مبارک کی طرف دیکھا اور ادب سے عرض کیا کہ حضرت میں غلام ہوں۔ میرے آقا جانتے ہیں کہ میرے پاس گرم کپڑے نہیں ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ سردیوں کا موسم ہے۔ اور رات بہت ٹھنڈی ہے۔ اس کے باوجود وہ باہر مجھے کام کے لیے اس حالت میں بھیج رہے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مجھے اسی حال میں دیکھ کر خوش ہیں۔ اب میری غلامی کا یہ تقاضا ہے کہ جس حال میں میرا آقا خوش رہے میں اس کی خوشی میں خوش رہوں اور اس کے خلاف حرف شکایت زبان پر نہ لاؤں کیونکہ اگر میں نے ایسا کیا تو یہ میری غلامی کے آداب کے خلاف ہوگا۔ یہ جواب سن کر حضرت عبداللہ اس مبارک پھڑک اٹھے۔ فرمایا نوجوان تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اور آج مجھے معلوم ہوا کہ غلامی کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ حیرت ہوتی ہے کہ صحابہ کرام پڑھے لکھے لوگ نہیں تھے لیکن

آنحضرت ﷺ علیہ وسلم کی صحبت نے ان میں وہ چیزیں پیدا کر دی تھیں کہ برس ہا برس کے مطالعہ کے بعد بھی آدمی بصد مشکل سمجھ پاتا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک صاحب کو مغرب کی نماز پڑھ کر سلام پھیرتے ہی فورا” مسجد سے نکلتے دیکھا تو آپ کو حیرت ہوئی۔ دوسرے تیسرے چوتھے روز بھی آپ نے اسی طرح اسے نکلتے دیکھا تو آپ نے آواز دے کر اسے بلایا اور پوچھا کہ بھئی تم نماز کے فورا” بعد کیوں چلے جاتے ہو؟ تو اس نے عرض کیا کہ حضور کوئی اور پوچھتا تو میں کبھی نہ بتاتا لیکن آپ سے کیسے چھپاؤں؟ بات یہ ہے کہ جو میں اپنے اوپر چادر لے کر آیا ہوں یہی میرے گھر کا کل اثاثہ ہے۔ گھر میں میری بیوی منتظر ہے کہ میں گھر پہنچوں تاکہ وہ بھی اول وقت میں نماز ادا کرسکے۔ کیونکہ ان کے پاس کوئی اور چادر نہیں ہے۔ اس لیے میں جلدی چلا جاتا ہوں۔ حضور ﷺ یہ سن کر آبدیدہ ہوگئے اور آپ نے ان کے لیے فراخی رزق کی دعا فرمائی۔

وہ صاحب جب گھر میں پہنچے تو بیوی نے پوچھا کہ آج آپ کچھ تاخیر سے تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حضور ﷺ نے روک لیا تھا۔ بیوی نے پریشانی سے پوچھا کہ کہیں آپ نے بتا تو نہیں دیا۔ انہوں نے کہا کہ بتا آیا ہوں۔ بیوی نے انتہائی پریشانی کے عالم میں کہا کہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جس حال میں رکھا تھا ہم اس کے بندے ہیں ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس کے خلاف حرفِ شکایت زبان پر لائیں۔ آپ نے جو آنحضرت ﷺ سے ذکر کیا کہیں اس کا مطلب یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم اپنے اس حال پر صابر و شاکر نہیں ہیں۔ یہ ہے غلامی کا وہ حقیقی مفہوم کہ ہر مسلمان اپنے اللہ کا غلام ہے۔ نہ اس کا جسم اپنا ہے نہ جان نہ اس کی صلاحیتیں اور توانائیاں اپنی ہیں نہ جسمانی قوتیں' نہ اولاد پر اسے حق ملکیت حاصل ہے نہ مال و دولت پر' یہ سب کچھ اللہ کی دین ہے۔ وہی ان سب کا مالک ہے۔ مسلمانوں کے پاس یہ اس کی دی ہوئی امانت ہے۔ امانت میں ان حدود سے تجاوز کرنا جو امانت رکھنے والے نے عائد کر دی ہیں اور یا اپنی مرضی اس طرح استعمال کرنا جو امانت کو

ملکیت بنا دے تو یہ امانت داری نہیں بلکہ خیانت ہے۔ ہم اپنی ان چیزوں میں اپنی مرضی کرنے کے ہرگز مجاز نہیں۔ زندگی اس نے ہمیں گذارنے کے لیے دی ہے تو گزارنے کے طریقے بھی عطا فرمائے ہیں۔ اس میں اپنی مرضی سے لکیریں کھینچنا، اپنی مرضی سے نقشے بنانا، اپنی مرضی سے اس کے اصول و ضوابط اور آداب وضع کرنا یہ بندگی اور غلامی کے آداب کے خلاف ہے اور پھر اس زندگی کے لیے ازخود نصب العین اور مقصد زندگی متعین کرنا یہ سراسر حدود سے تجاوز ہے۔ اور پھر زندگی کے ہر شعبے کے لیے جو احکام دیئے گئے ہیں انہیں کامل بندگی کے تصور کے ساتھ بجا لانے کی بجائے ان کے خلاف دل و دماغ کی قوتیں صرف کرنا، اس کے خلاف اپنے اعضاء و جوارح کو حرکت میں لانا بلکہ کھلم کھلا اس کے احکام کے خلاف زندگی کا فیصلہ کرنا یہ سراسر اس کی بندگی اور غلامی سے بغاوت ہے اور پھر وہ تنگی و ترشی، عسر و یسر اور امن اور خوف، جس حال میں بھی رکھے اس کے خلاف حرف شکایت زبان پر لانا یا اس کے سوا کسی اور کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا اور کسی اور سے امیدیں باندھنا، محبت کسی اور سے کرنا، نفرت کا حوالہ کسی اور کو بنانا، دل کی دنیا کسی اور سے آباد کرنا، زندگی کے الجھے ہوئے مسائل میں اس کی دی ہوئی ہدایت کے برعکس کوئی اور ہدایت قبول کرنا یہ سب وہ باتیں ہیں جو اس بندگی اور غلامی کے خلاف ہیں۔

یہ غلامی کا وہ حقیقی مفہوم ہے جس میں کائنات کا ذرہ ذرہ جکڑا ہوا ہے۔ خالق حقیقی وہ غالب و قادر آقا ہے کہ اس کی کائنات کی ہر مخلوق اس کے سامنے سراپا تسلیم و انقیاد ہے جس مخلوق کو جس کام میں لگا دیا گیا ہے اس کی مجال نہیں کہ وہ اس سے سرتابی کر سکے۔ ایک چھوٹے سے چھوٹے ذرے سے لے کر بڑے سے بڑے کرے تک ہر مخلوق اپنی اپنی مفوضہ ذمہ داری ادا کرنے میں سرتاپا مصروف عمل ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

"وللّٰہ یسجدُ منْ فی السمٰوٰت والارض والشّمسُ
والقمرُ والنّجومُ والجبالُ والشّجرُ والدّوابُ و کثیرٌ

من الناس"

اللہ ہی کے لیے جھکے ہوئے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چارپائے اور بہت سے لوگ (سب اسی کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔

"وللہ یَسجُدُ مَا فِی السَّمٰوات وما فی الارضِ من دَابۃٍ والمٰلٰئکۃ وَھُم لا یَستَکبِرُون یخافون ربّھم من فوقھم ویفعَلون مایُؤمَرُون"

اور اللہ ہی کے لیے سجدہ کر رہے ہیں جو کوئی آسمانوں میں ہیں اور جو کوئی زمین میں ہیں چارپایوں میں سے اور فرشتوں میں سے اور وہ تکبر نہیں کرتے وہ اپنے اوپر اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور وہ کرتے رہتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔

"وان مِّنْ شَیْئٍ اِلَّا یُسبّحُ بِحَمدِہٖ ولکن لَّا تفقھُون تَسبِیحَھم"

ہر چیز اس کی تسبیح میں لگی ہوئی ہے مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔

"اِن کلّ مَن فی السمٰوات والاضِ الا آتی الرحمان عبدا"

آسمانوں اور زمین میں جو کوئی ہے وہ اللہ کے پاس غلام بن کے آنے والا ہے۔

سورج اس کی غلامی میں چمک رہا ہے۔ چاند اس کی بندگی میں دمک رہا ہے ہر سیارہ اس کی چاکری میں محو حرکت ہے۔ پہاڑ اس کے حکم کی تعمیل میں ایستادہ ہیں۔ زمین اس کی اطاعت میں بچھی ہوئی اپنا فرض انجام دے رہی ہے۔ فرشتے اس کے احکام کی بجا آوری میں ہمہ وقت اور ہمہ تن مصروف عمل

ہیں کائنات کی ہر مخلوق سراپا خدمت و اطاعت ہے اور ایک لمحے کے لیے بھی اپنی ڈیوٹی سے غفلت یا سرکشی کا شکار نہیں ہوتی۔

اب لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ یہ تمام مخلوقات جو اپنی تمام تر قوت و شوکت کے باوجود حضرت انسان کے لیے مسخر و مطیع اور تابع فرمان بنا دی گئی ہیں اور انسان کو نہ صرف ان سے خدمت لینے کا حق دیا گیا ہے بلکہ کائنات کی پاکیزہ ترین مخلوق یعنی فرشتوں کا اسے مسجود بنایا گیا ہے اور اشرف المخلوقات کا طغرہ اس کے سر پر سجایا گیا ہے۔ وہ مخلوقات تو اپنے خالق و مالک کی ہمہ وقت اور ہمہ نوع بندگی و غلامی میں مصروف ہیں اور یہ اشرف و اعلیٰ کہلانے والا بندگی و غلامی تو رہی ایک طرف بالعموم معصیت و نافرمانی بلکہ سرکشی و بغاوت پر تلا رہتا ہے۔ اس کی شرافت و فضیلت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ یہ بندگی و اطاعت میں باقی تمام مخلوقات سے بڑھ جاتا بلکہ پروردگار کی طرف سے بھی اس پر دوسری مخلوقات سے بڑھ کر بندگی و غلامی کی ذمہ داریوں کا بار ڈالا جاتا۔ جبکہ ہمارے یہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ نماز، روزہ، حج اور زکوۃ صرف یہی عبادات ہیں ان پر عمل کر لینے سے عبادت کا حق ادا ہو جاتا ہے یعنی زندگی کے شب و روز میں سے نماز کے چند اوقات بارہ مہینوں میں رمضان کا ایک مہینہ پوری زندگی میں حرمین کی بقصد حج ایک دفعہ کی حاضری اور دولت کی بہتات میں بھی سال بہ سال اڑھائی فیصد زکوۃ کی ادائیگی یہ وہ پروردگار کے حقوق ہیں جن کے ادا کرنے سے عبادت کی ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے۔ یہی وہ غلط فہمی ہے جس نے ہماری اجتماعی زندگی کو عبادت کے ہمہ نوعی اثرات سے محروم کر دیا ہے۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ہماری زندگی مہد سے لحد تک عبادت کی ذمہ داریاں رکھتی ہے۔ قبل از بلوغ ماں باپ کے واسطے سے یہ ذمہ داریاں ادا ہوتی ہیں اور بعد از بلوغ ہر مرد و عورت کی مکلف زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ جس میں جوانی کی جولانیاں بھی ہیں، صلاحیتوں اور توانائیوں کا امتحان بھی ہے۔ قلب و ذہن کی رعنائیوں کا نشیب و فراز بھی ہے۔ محبتوں کی ہماہمی بھی ہے، تنہائیوں کا سوز و گداز بھی ہے۔ ذمہ داریوں کے بار بھی ہیں۔ اور فارغ

البالیوں کی سرمستیاں بھی ہیں۔ ڈھلتی ہوئی عمر کا سوز و گداز بھی ہے اور دم توڑتی ہوئی صلاحیتوں کا خمار بھی ہے ان تمام حوالوں سے عبادت اپنا مفہوم رکھتی ہے اور ان تمام بدلتے ہوئے حالات میں پروردگار کے احکام کی اطاعت فی الحقیقت وہ عبادت ہے جس کے بارہ مین کل کو سوال ہو گا آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن جب ہم میں سے ہر فرد بارگہ حق میں حاضر ہو گا تو زمین ہمارے پاؤں جکڑ لے گی اور اس وقت تک نہیں چھوڑے گی تاوقتیکہ پانچ باتوں کا جواب نہیں دے دیا جائے گا۔ پوچھا جائے گا زندگی کیسے گذار کے آئے ہو جوانی کس طرح کے کاموں میں صرف کی۔ مال کس طرح کمایا اور کہاں خرچ کیا اور علم حاصل کیا یا نہیں اگر کیا تو اس کا کیا حق ادا کیا۔ یعنی زندگی کے ایک ایک لمحے، نعمتوں میں سے ایک ایک نعمت اور توانائیوں اور صلاحیتوں سے ایک ایک توانائی اور صلاحیت اور عہدہ و مناصب میں سے ایک ایک منصب کا حساب ہو گا۔

دست درازیوں کا بھی حساب ہو گا اور کوتاہ دستیوں کا بھی دل و دماغ کی کج اندیشیوں کے بارہ بھی پوچھا جائے گا اور نگاہوں کی خیانتوں کے بارہ بھی قدموں کے حدود سے تجاوز کا بھی حساب ہو گا اور تساہل و تغافل اور لغزشِ قدم کا بھی مال و دولت کے حوالے سے حرام ذرائع اختیار کرنے پر بھی باز پرس ہو گی اور بخل و اسراف پر گرفت بھی جھونپڑے والا اگر احتساب سے گذرے گا تو تخت و تاج کا مالک بھی اس سے بچ نہ سکے گا۔ رند و مست اگر پکڑا جائے گا تو عابد و زاہد بھی خشوع و خضوع کا حساب دے گا۔ غرضیکہ انسان کو ہمہ وقتی اور ہمہ نوعی عبادت کا مکلف بنایا گیا ہے جس میں زندگی کا ہر شعبہ اور ہر زمہ داری شامل ہے۔ اسلام نے اگرچہ نماز روزہ حج اور زکوۃ کو عبادت کا نام دیا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف یہی عبادات ہیں۔ ان کو عبادت کہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ یہ اس طرح کی عبادات ہیں کہ ان کو فہم و شعور سے ادا کرنے والا باقی زندگی کو بھی اسی ڈھپ پر لے آتا ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ ایسے افعال ہیں جو از اول تا آخر خالصتا" تسلیم و القیاد اور حضوریِ حق سے عبارت

ہیں۔ جبکہ باقی زندگی کا ہر کام اطاعت خداوندی سے عبادت بنتا ہے۔ یہی وہ غلط فہمی ہے جو بعض صحابہ کو بھی ہوئی انہوں نے صرف انہیں افعال و اعمال کو دینداری اور عبادت سمجھ کر اور باقی معاملات کو دنیاداری جان کر یہ فیصلہ کیا کہ ہم راتیں نماز میں گذاریں گے اور دن روزے میں۔ اور بیویوں سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ آنحضرت نے انہیں سرزنش کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے دیکھو میں رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں میں روزے بھی رکھتا ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں میں نکاح بھی کرتا ہوں اور بیویوں سے تعلق بھی رکھتا ہوں یہ میرا طریقہ یعنی میری سنت ہے جس نے میرے طریقے کی پیروی کی وہ مجھ سے ہے اور جس نے ایسا نہ کیا اس کا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں عجیب بات تو یہ ہے کہ کھانا پینا جو سراسر ایک دنیاداری ہے قرآن کریم نے اسے بھی دینداری اور عبادت قرار دیا۔ ارشاد خداوندی ہے:

> ”یا ایھا الذین آمنوا کُلُوا مِن طَیِّبَاتِ مَارَزَقنَاکُم واشکرُو اللّٰہ ان کنتُم ایاہ تعبدُون“
>
> اے مومنوں کھاؤ ان پاکیزہ نعمتوں میں سے جو اللہ نے تمہیں عطا فرمائی ہیں اور اللہ کا شکر بجا لاؤ اگر تم اسی کی عبادت کرنا چاہتے ہو تو غور فرمائیے اس آیت میں پاکیزہ نعمتوں کے کھانے اور ان پر شکر بجا لانے کو عبادت قرار دیا ہے۔

مندرجہ بالا گذارشات سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ہمیں جس عبادت کا حکم دیا گیا ہے اور جو ہماری تخلیق کا مقصد بھی ہے وہ ایک ہمہ وقتی عبادت ہے جو پوری زندگی پر حاوی ہے اور جس میں زندگی کا ہر شعبہ داخل ہے۔ اس پوری زندگی کی عبادت سے انسان باقی تمام مخلوقات بالخصوص ملائکہ کا ہم پلہ ہو جاتا ہے مگر انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا تقاضہ تو اس سے کچھ سوا کا تقاضہ کرتا ہے کیونکہ:

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

اس کی شرافت و فضیلت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کی عبادت میں کوئی ایسی حقیقت کار فرما ہونی چاہیے جو باقی مخلوقات پر اس کا افضل ہونا مبرہن کر دے۔

اس حوالے سے جب ہم غور کرتے ہیں تو دو حقائق ہمارے سامنے کھلتے ہیں جو انسان کے افضل و اعلیٰ ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ ان میں سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات جن و انس کے علاوہ ایسی ہیں جن کے بارہ یہ بات مسلم ہے کہ قدرت نے انہیں ارادہ و اختیار کی آزمائش میں مبتلا نہیں کیا۔ ان کی اطاعت و عبادت جیسی کچھ بھی ہے اس میں ان کے اختیار کا کوئی دخل نہیں۔ انہیں انکار کی صلاحیت سے بہرہ ور نہیں کیا گیا۔ بلکہ وہ اپنی فطرت اور جبلت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت اور تسلیم و انقیاذ پر مجبور ہیں۔ مگر اس کے برعکس انسان کا حال یہ ہے کہ اسے اس بات کی آزادی دی گئی ہے اور حق و باطل کے اختیار اور خیر و شر کے امتیاز میں اسے آزاد چھوڑا گیا ہے کہ دونوں میں جسے چاہو اختیار کرو۔ اسی طرح احکام کی اطاعت میں بھی کوئی اضطرار نہیں بلکہ یہ اختیار دیا گیا کہ چاہو تو اطاعت کا راستہ اختیار کرو چاہو تو معصیت کا۔ اس قوتِ تمیز اور اختیار کی آزادی کے صحیح استعمال پر اجر و ثواب کی امید دلائی گئی اور غلط استعمال پر سزا اور عذاب کی تہدید سنائی گئی۔ پھر اسی پر بس نہیں بلکہ اس اختیار اور آزادی کے مزید امتحان کے لیے انسان کے اندر مکروہات و منکرات اور فواحش کی خواہش اور ہوس کو بھی پیدا کیا گیا۔ اب جو آدمی خواہشات و مرغوبات اور امیدوں اور آرزوؤں کے کانٹوں سے دامن بچا کر ارادوہ و اختیار کے صحیح استعمال سے معصیت و نافرمانی اور سرکشی و بغاوت کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے عبادت و بندگی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کے افضل و اعلیٰ ہونے میں کیا شبہ ہے؟ فرشتہ کبھی گناہ نہیں کرتا۔ اس لیے کہ اس میں گناہ کے لیے رغبت ہی نہیں وہ کبھی انحراف اور سرکشی کا رویہ اختیار نہیں کرتا اس لیے کہ اس میں اس کی طاقت و صلاحیت ہی نہیں وہ شرم و حیا کا پیکر بن کر پاکدامنی کی علامت بن جاتا ہے اس

لیے کہ اس میں خواہشِ نفس کا وجود ہی نہیں۔ مگر جب یہی صفات انسان اختیار کرتا ہے تو بجا طور پر یہ اس کے لیے باعثِ شرف ہے کیونکہ وہ خواہشِ نفس کا شکار ہے وہ معصیت کی طرف رغبت رکھتا ہے وہ حبِّ دنیا اور ہوسِ زر کا اسیر ہے۔ وہ طاقت اور گھمنڈ کا رسیا ہے۔ وہ عہدہ و منصب کا نخچیر ہے۔

دوسری حقیقت جس نے انسان کو شرافت و فضیلت کے تخت پر فائز کیا ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر مخلوق نے صرف عبادت کی ہے یعنی احکام کی اطاعت کی ہے۔ زندگی بھر اس سے انحراف نہیں کیا۔ سجدہ و قیام اور رکوع و قعود میں رہ کر بندگی کا حق ادا کیا ہے اور یہ بھی بلاشبہ متاعِ بے بہا ہے مگر انسان نے صرف بندگی نہیں کی بلکہ کچھ اور بھی کیا ہے۔ اس نے صرف اطاعت و بندگی میں سر ہی نہیں جھکایا بلکہ برگشتہ سروں اور تنی ہوئی گردنوں کو اپنے مالک کے سامنے جھکنے پر مجبور بھی کیا ہے۔ اس کے لیے وطن چھوڑا ہے گھر سے بے گھر ہوا ہے اولاد کی قربانی دی ہے۔ دنیا بھر سے لڑائی لڑی ہے۔ دنیا کے ہر خطے کو اپنی سرفروشی و جانفشانی سے زندگی بخشی ہے۔ اور اس شمع کو لے کر ہر اس جگہ پہنچا ہے جہاں دھرتی پانی دیتی ہے اور جہاں انسان کی اولاد بستی ہے پھر کبھی اس راستے میں مال لٹایا ہے کبھی پسینہ بہایا ہے اور کبھی خون دیا ہے بقول اقبال:

؎ مقامِ بندگی دیگر مقامِ عاشقی دیگر
زنوری سجدہ مے خواہی زخاکی بیش ازاں خواہی
ازاں خود رانگہ داری کہ با ایں بے نیازی ہا
شہادت بروجودِ خود زخونِ دوستاں خواہی

یہ عبادت کی اعلیٰ اور برترین صورت ہے جو حضرت انسان کے لئے ودیعت کی گئی اور جس کا نام عاشقی اور شہادت رکھا گیا۔ اس میں ایک طرف انسان اپنے جسم و جان قوت و صلاحیت عقل و دانش، مال و دولت اور ارادہ و اختیار سے اپنے مالک حقیقی کے لیے دستبردار ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کے لیے فیصلوں کا حق انفرادی اور اجتماعی سطح پر اسی کو تفویض کرتا ہے اور بندگی و عبودیت کی تصویر بن کر راضی بہ رضا ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف اگر ضرورت

پڑتی ہے تو ہدیہ جان لے کر اس کی بارگاہ میں پیش کر دیتا ہے اور اگر یہ ہدیہ قبول کرلیا جاتا ہے تو پکار اٹھتا ہے "فزت و رب الکعبتہ" اور اس کامل تر بندگی و عبادت کو وہ حقیقی زندگی سمجھتا اور کامیابی و کامرانی کی ضمانت جانتا ہے۔ بقول اقبال:

ؔ برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

حاصل کلام یہ کہ عبادت اپنی بندگی و عبودیت کا نذرانہ حضور حق میں صرف اسی کی رضا و خوشنودی کے حصول کے لیے پیش کرنے کا نام ہے مگر اس میں بدارج اور مراتب ہیں، جن و انس کے علاوہ باقی مخلوقات کی عبادت اضطراری عبودیت یا بے اختیار غلامی ہے اور جنوں کی عبادت آگرچہ بالاختیار عبودیت ہے یعنی وہ اپنے اختیار اور ارادہ سے اللہ تعالیٰ کی بندگی بجا لاتے ہیں اور اس میں انسانوں ہی کی طرح کامل فدویت امتثال امر انکساری اور فدائیت کی روح کارفرما ہوتی ہے۔ مگر انسانوں کو اپنی عبادت مین ایک اختصاص اور امتیاز حاصل ہے وہ یہ کہ حضرت انسان ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کا غلام بے دام اور بندۂ حقیر ہے مگر دوسری طرف وہ زمین پر اپنے مالک و آقا کا خلیفہ بھی ہے۔ اس لیے اس کے اندر عبودیت و فدائیت اور عشق و سرمستی کے ساتھ ساتھ حق خلافت کی ادائیگی کے لیے ایک اولوالعزمی بھی پائی جاتی ہے۔ جس کا حق وہ نوع بہ نوع ایثار و قربانی اور بالآخر راہِ حق میں اپنے خون کا آخری قطرہ بہا کر ادا کرتا ہے اور اسی وجہ سے جنوں اور فرشتوں سمیت تمام مخلوقات سے اشرف و اعلیٰ ہونے کا شرف پاتا ہے۔

# نماز اور اس کی حقیقت

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَر وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ"

میرے بھائیو اور عزیزو!

## نماز کی اہمیت و عظمت

اسلام ایک عظیم عمارت ہے جو پانچ بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے اور یہی پانچوں اس کے ستون ہیں جن پر یہ عمارت ایستادہ ہے۔ ان میں پہلا اور اہم تر ستون نماز ہے یہ ارکان اسلام میں سے ایسا رکن ہے جو سب سے پہلے امت مسلمہ پر فرض کیا گیا اور قیامت کے روز سب سے پہلے اسی سے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اسی کے بارہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "الصلوۃ فارق بین الحق والباطل" نماز حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہے۔ مزید فرمایا الصلوۃ عماد الدین من اقامھا فقد اقام الدین ومن ھدمھا فقد ھدم الدین نماز دین کا ستون ہے جس نے اسے قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے اسے گرا دیا اس نے دین کو گرا دیا۔ کسی آدمی کے اسلام کی شناخت اور علامت یہی نماز ہے کیونکہ اسلام قبول کرنے کے بعد نماز کا وقت داخل ہوتے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص دعوائے ایمان میں سچا ہے یا جھوٹا۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا: فان تابوا و اقاموالصلوۃ واتوالزکوۃ فخلوا سبیلھم کہ اگر یہ توبہ کریں اور نماز ادا کریں اور زکوۃ دیں تو ان کا راستہ

چھوڑ دو یعنی ان کے ایمان کو معتبر جانو۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا مسلمانوں کا لشکر اگر کسی آبادی پر گزرے اور معلوم نہ ہو کہ اہل بستی مسلمان ہیں یا غیر مسلم تو اذان کہو اگر بستی سے اذان کا جواب ملے تو اس بستی کو مسلمان جانو اور ان سے مسلمانوں جیسا سلوک کرو۔ کیونکہ نماز ہی اہل اسلام کی پہچان ہے۔ ارکان اسلام میں سے کوئی رکن بجز زکوۃ کے ایسا نہیں جس کی قرآن و سنت میں اس تکرار کے ساتھ تاکید آئی ہو جیسی تاکید نماز کی آئی ہے۔ قرآن کریم میں باربار اقیموا الصلوۃ (نماز قائم کرو) فرمایا گیا نمازوں کی حفاظت کا حکم دیا گیا۔ حافظوا علی الصلوات (نمازوں کی حفاظت کرو) ترک نماز پر شرک کے اندیشہ کا اظہار کیا گیا کہ نماز قائم کرو ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں مشرک نہ ہو جاؤ۔ اقیموا الصلوۃ ولا تکونوا من المشرکین اور شرک ایسی برائی ہے جس کا تصور بھی ایک مسلمان کے لیے ناقابل قبول ہے۔ مسلمانوں کو صرف اقامت صلوۃ پر عمل کرنے کا ہی حکم نہیں دیا گیا بلکہ اسے ہر مسلمان اور مسلمان معاشرے کی پہچان اور روح قرار دیا گیا اور اسے مسلمانوں کی ایسی صفت قائمہ و مستمرہ ٹھہرایا گیا جو مسلمانوں سے کبھی منفک نہیں ہو سکتی یعنی جس طرح برف سے ٹھنڈک، آگ سے تپش، چاند سے چاندنی، سورج سے روشنی، اور موتی سے آب الگ نہیں ہو سکتی اسی طرح ایک مسلمان بلکہ مسلمان معاشرہ سے نماز کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ارشاد فرمایا گیا والذین ھم علی صلواتھم یحافظون وہ مسلمان ہمیشہ اور ہر حالت میں نمازوں کی محافظت کرتے ہیں جس طرح ان کے جسموں سے ان کی روحوں کو جدا نہیں کیا جاسکتا اسی طرح ان کی دینی زندگی نمازوں کے اہتمام اور اس کے اثرات سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام جس کسی مسلمان کو مسجد سے چند نمازوں میں غائب دیکھتے۔ تو اس کی مزاج پرسی اور تیمارداری کے لیے اس کے گھر کا رخ کرتے انہیں یقین ہو جاتا کہ وہ یقیناً بیمار ہے یا اسے کوئی عذر لاحق ہے۔ ان کے لئے یہ بات ناقابل تصور تھی کہ کوئی مسلمان بدوں عذر بھی کبھی نماز باجماعت یا مسجد سے بیگانہ رہ سکتا ہے اور اگر انہیں یہ معلوم ہوتا کہ غیر حاضر شخص کوئی معقول

عذر نہیں رکھتا تو انہیں اس کے منافق ہونے کا یقین ہو جاتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ترک نماز نہیں بلکہ اہتمام نماز میں سستی کو بھی منافقین کی علامت قرار دیا۔ ارشاد فرمایا واذا قاموا الی الصلوۃ قاموا کسالی جب وہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو ڈھیلے ڈھالے اور کسمساتے ہوئے اور پروردگار کی نگاہ میں یہ مسلمانوں کا شیوہ نہیں پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں آخر منافقین نہ چاہتے ہوئے بھی نماز کیوں پڑھتے تھے اس کی دو وجہ تھیں (1) وہ جانتے تھے کہ مسلمان معاشرہ میں رہنے اور خود کو انہیں میں سے ظاہر کرنے کے لیے نماز میں شرکت ضروری ہے ورنہ مسلمان انہیں کبھی مسلمانوں میں شمار نہیں کرسکتے تھے کیونکہ انہیں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد خوب معلوم تھا "مَن تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ" جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا۔ 2- دوسری وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو جس سانچے میں ڈھالا گیا تھا اس میں نماز کا اہتمام نہ کرنے والوں کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ جس طرح ایک صحت مند معدہ مکھی یا ایسی ہی کسی چیز کو قبول نہیں کرتا بلکہ اگل دیتا ہے اسی طرح صحت مند مسلمان معاشرہ کبھی بے نماز کو برداشت نہیں کرتا۔ بلکہ بے نماز آدمی اس اکل کھرے معاشرے میں کھوٹ کی طرح الگ ہو جاتا ہے کیونکہ پروردگار نے اس مسلمان معاشرے کے معماروں یعنی انبیاء کرام کی یہ ذمہ داری ٹھہرائی تھی کہ وہ خود بھی نماز کی پابندی کریں اور اپنے ماننے والوں کو بھی اس کا حکم دیں اور اس کا آغاز اپنے گھر سے کریں آنحضرت سے فرمایا جا رہا ہے وَاْمُرْ اَهْلَکَ بِالصَّلٰوۃِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْهَا اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیجئے اور خود بھی اس کی پابندی کیجئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قرآن پاک میں قیامت تک کے لیے محفوظ فرما دی گئی۔ رب اجعلنی مقیم الصلوۃ و من ذریتی اے رب مجھے اور میری اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنا۔ ایسے معاشرے میں ترک نماز کی کہاں گنجائش رہ سکتی ہے جس میں یہ بات دل و دماغ میں اتار دی گئی ہو کہ نماز زندگی میں بجز جنون اور بے ہوشی کے کسی حالت میں بھی ساقط نہیں ہو سکتی اگر گھر کا سکون میسر نہیں،

حالتِ سفر درپیش ہے تو سفر کی روا روی میں بھی نماز چھوڑی نہیں جاسکتی البتہ قصر پڑھو یعنی دو رکعت نماز کافی ہے اور اگر بیماری کا عذر ہے تو عذر کے مطابق نماز پڑھو۔ یعنی قیام پر قادر نہیں ہو تو بیٹھ کر پڑھو۔ بیٹھ بھی نہیں سکتے تو لیٹ کر سر کے اشارے سے اور اگر اتنی بھی ہمت نہیں تو آنکھوں کے اشارے سے پڑھ لو۔ اگر وضو نہیں کرسکتے تو تیمم کرلو۔ اگر خود نہیں کرسکتے تو دوسرا کرا دے۔ اور اگر جنگ کی حالت درپیش ہو تو صلوۃ الخوف یعنی خوف کی نماز پڑھو۔ اندازہ فرمائیے جنگ کی ہولناکیوں میں غذا میسر نہیں آرام کا موقعہ نہیں جان کے لالے پڑے ہیں مگر نماز بہرحال پڑھنی ہے اگر مسلسل فائرنگ اور گولہ باری کی وجہ سے کسی طرح بھی نماز نہیں پڑھی جاسکتی تو پھر جب موقع ملے جو نمازیں قضا ہوگئی ہیں انہیں پڑھ لو۔ جیسا کہ غزوۂ خندق میں آنحضرت ﷺ کی دو نمازیں کفار کے مسلسل حملے کی وجہ سے قضا ہوگئی تھیں۔ تو آپ نے انہیں قضا پڑھا لیکن نمازوں کے قضا ہو جانے کا رنج اتنا شدید تھا کہ آپ کی زبان سے ان کفار کے لیے بددعا نکلی۔ حالانکہ آپ سراپا رحمت تھے اور کبھی اپنی ذات کے لیے کسی کو کبھی حرف ناملائم بھی نہیں فرمایا اور طائف کے پتھر کھا کر بھی بددعا نہیں فرمائی۔ لیکن نماز کے معاملہ میں آپ بہت حساس واقع ہوئے تھے۔ کیونکہ نماز فی الحقیقت اللہ تعالیٰ سے وفاداری کا اقرار و اعلان ہے اور اس کی مداومت اور پابندی اس عہدِ وفا کی پاسداری ہے اس لیے جب آپ اس عہد وفا کو شکست ہوتا دیکھتے تو اس دھرتی پر سایۂ رحمت ہونے کے باوجود غضبناک ہو جاتے۔ ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا میرا جی چاہتا ہے کہ میں کسی کو نماز پڑھانے کا حکم دوں۔ اور خود محلہ میں جاکر ان گھروں کو آگ لگا دوں۔ جن گھروں والے نماز کے لیے نہیں نکلتے۔ اگر مجھے بیماروں معذوروں اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں ضرور ایسا کر گزرتا۔ آنحضرت ﷺ کے نماز کے بارہ میں شدید حساس ہونے اور نماز کی اہمیت و عظمت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ مرض الوفات میں جبکہ نقاہت کے باعث آپ کی آواز جواب دے رہی تھی اور چند لمحوں بعد آپ واصل بحق ہونے والے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں

نے آنحضرت کے لب مبارک جنبش کرتے ہوئے دیکھے تو میں نے لبوں سے کان لگا دیئے۔ آپ فرما رہے تھے الصلٰوۃ وما ملکت ایمانکم لوگو نماز کی پابندی کرنا اور زیر دستوں سے حسن سلوک سے پیش آنا۔ جس تحفہ کو عالم لامکاں سے شب معراج آپ اپنے رب سے لے کر آئے تھے۔ دنیا سے دم واپسیں اسی کی یاد دہانی فرما رہے تھے۔ مسلمان معاشرے میں اسی تاکید و اہتمام کا اثر تھا کہ عالم اسلام پر غیر ملکی استعمار کے مکروہ سایہ پڑنے تک مسلمانوں میں ہر طرح کا عیب تلاش کیا جاسکتا ہے مگر بے نماز ہونا یعنی ترکِ نماز' یہ برائی مسلمانوں میں کبھی نہ تھی کیونکہ مسلمان خوب جانتے تھے کہ اسلام اور پروردگار سے ہمارے تعلق کا یہ آخری ٹانکہ ہے اگر یہ بھی ٹوٹ گیا تو پھر اسلام سے رسمی تعلق تو شاید باقی رہ جائے حقیقی تعلق باقی رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کی اجتماعیت کے تحفظ کے لیے غلط کار اور بدعمل حکمرانوں کو بھی آخر حد تک زیادہ سے زیادہ برداشت کرنے کا حکم دیا۔ مگر اس برداشت کی آخری حد یہ بیان فرمائی کہ جب تک وہ تمہیں اقامت صلوٰۃ کا حکم دیتے رہیں یعنی اس کے بعد انہیں برداشت کرنے کا کوئی جواز نہیں قرآن حکیم نے گذشتہ قوموں کے حوالے سے ان کی جس آخری برائی اور گمراہی کو بیان فرمایا ہے جس کے بعد وہ ہلاکت سے نہ بچ سکے وہ یہی نماز کو ضائع کر دینے کی حالت ہے ارشاد پاک ہے فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوۃ واتبعوا الشھوات پھر ان کے بعد ایسے ناخلف آئے جنہں نے نماز کو ضائع کر دیا اور شہوات کے پیروکار ہوگئے۔ پھر اللہ کا قانون حرکت میں آیا اور نامرادی و خسران اور تباہی و بربادی ان کا مقدر بن گئی۔ آہ وائے حسرتا' آج امت مسلمہ اپنی اس متاعِ بے بہا کو گم کر چکی بالخصوص اس کا طبقۂ خواص اس کی اہمیت افادیت اور عظمت کو بالکل بھلا چکا ہے۔

## نماز کی حقیقت

یہ بات دنیا کے مسلمات میں سے ہے کہ ہر اجتماعی. قوت جو اپنا ایک

نظریہ بھی رکھتی ہو اور دنیا میں اس کی بالادستی یا کم از کم اس کے اظہار کی خواہش مند ہو۔ وہ اپنے ماننے والوں کی تنظیم تہذیب اور تشکیل سیرت اس طریقے سے کرتی ہے جس سے ان کا نظریہ بروئے کار آسکے اور وہ مقاصد پورے ہو سکیں جو ان کے نظریے کو مستحکم کرنے اور قبولیت عامہ کے لیے ضروری ہوں۔ برصغیر میں انگریز استعماری قوت کی حیثیت سے وارد ہوا اس کے پیش نظر ہندوستان کو ترقی دینا یا اس برصغیر میں رہنے والوں کی فلاح یا بہبود نہیں تھی کہ وہ ان کی مادی علمی مذہبی تہذیبی اور اخلاقی تعلیم و تہذیب کے لیے اقدامات کرتا۔ اس کے پیش نظر صرف اپنے نوآبادی نظام کو مستحکم کرنا، اپنے غلبے کو مضبوط کرنا اور اپنی عمر دراز کرنا تھا۔ اس لیے اس نے اس مقصد کے لیے جو سول سروس پیدا کی اس میں صرف دو باتیں پیدا کرنے کی کوشش کی 1۔ اسے از اول تا آخر انگریز کا وفادار ہونا چاہیے۔ چاہے اس کے لیے مذہب سے بے وفائی کرنا پڑے اپنوں کو دغا دینا پڑے اور چاہے اس کے لیے کیسی ہی اخلاق سے گری ہوئی روش اپنانا پڑے۔ 2- اس سول سروس میں نظم و ضبط اور ڈسپلن ہونا چاہیے تاکہ ہر کام بروقت اور برمحل ہوسکے قطع نظر اس سے کہ ان کے اخلاق کا کیا حال ہے اور ان کے عادات و اطوار کیسے ہیں۔

اسی طرح اس نے فوج بنائی تو اسے مار دھاڑ کرنے اور مرنے مارنے کے قابل بنایا، اسلحہ کی ٹریننگ اور جسمانی و ذہنی توانائی اور چابکدستی ان کا مقصود ٹھہرایا۔ قطع نظر اس سے کہ ان میں رحم و مروت کے نام کی بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس کی فوج کے پیش نظر غلامی کی زنجیروں کی مضبوطی ان زنجیروں کو توڑنے والی قوتوں کی بیخ کنی اور مخالفت میں بلند ہونے والے سروں کی پامالی کے سوا کچھ نہ تھا۔

مسلمان دنیا میں ایک صالح اور روح پرور نظریے کی حامل قوم ہے۔ اس نظریے کو عام کرنا، علمی لحاظ سے متعارف کرانا، دلوں اور دماغوں کو اس کے لیے ہموار کرنا، اسے ایک سیاسی قوت بنا کر اپنے ماننے والوں پر اسے غالب و نافذ کرنا۔ زمین پر اسے بالادست قوت بنانا، اس کی تہذیب کو سب تہذیبوں پر

غالب کرنا اور اللہ کے بندوں کو ہر طرح کے ظلم و استبداد اور ہر طرح کے غلط مذہب اور غلط سماج کی غلامی سے آزاد کرانا اس کے پیش نظر ہے۔ اب ظاہر ہے اسے اپنے ماننے والوں میں اسی کے مطابق صلاحیت و اہلیت، تہذیب و اخلاق، علم اور شعور، نظم و ضبط اور جذبہ و احساس پیدا کرنا ہوگا۔ تاکہ وہ اپنے مطلوبہ اہداف و مقاصد حاصل کرسکے۔ اس کی سول سروس انہیں اخلاق و اطوار کی حامل ہوگی۔ اس کے عوام انہیں مقاصد سے سرشار ہوں گے۔ اس کی فوج انہی مقاصد و اہداف کی حفاظت و صیانت کی اہلیت کی حامل ہوگی۔

اس نظریے کے اساسی اصول اگر جاننے کی کوشش کی جائے اور یہ جانا جائے کہ کم از کم وہ کیا بنیادیں ہیں جن پر اس نظریے کی عمارت استوار ہے اور جو روح کی طرح اس کی تعلیمات اور جسدِ امّت میں جاری و ساری ہیں اور اس امت کا کوئی فرد کسی حالت میں بھی اس سے صرف نظر نہیں کر سکتا وہ فرد عوام میں سے ہو یا خواص میں سے وہ وقت کا حاکم ہو یا رعایا کا عام فرد، وہ علمی وجاہتوں کا پیکر ہو یا مال و دولت کی وسعتوں کا شناور، وہ ایک استاد ہو یا ایک سپاہی، اسے بہرصورت ان اصولوں کی پاسداری کرنا ہوگی وہ کسی حال میں ان کو نظرانداز کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ وہ اساسی اصول یا وہ بنیادیں دو ہیں جن سے وابستگی اور وفاداری امت مسلمہ اس کے افراد اور اس کے اداروں کی بقا کی ضامنِ ہے ان میں سے پہلا اصول اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا یقین اور اس کے لوازم ہیں۔ اور دوسرا اصول ہر مسلمان کو اپنی حیثیت کا ادراک، اپنی بندگی و غلامی کا اعتراف اور اس ذات کبریا سے گہری وابستگی کا احساس ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دنیا میں بظاہر قوتوں اور عظمتوں کے سرچشمے اور حوالے بہت سے ہیں۔ عناصِر قدرت کی قوتوں سے ہمارا شب روز کا واسطہ ہے۔ سورج کی برستی ہوئی آگ اور اس کی پھیلی ہوئی روشنی، چاند کی چاندنی اور تابانی اور پھر ہماری غذائی ضرورتوں میں اور پیداوار کی تیاری میں اور اسباب معیشت کی فراہمی میں ان کا عمل دخل، ان باتوں سے کون انکار کر سکتا ہے برق و رعد کی ہولناکیاں، دریاوں کا سیل بے پناہ، سمندروں کا جوار بھاٹا، یقیناً اپنے قوت و

ہیبت کی نمود رکھتے ہیں کتنی دفعہ ظاہر بین نگاہیں ان سے متوحش اور متاثر ہوتی رہی ہیں۔ کتنی دفعہ کم ظرف اور بے حوصلہ پیشانیاں ان کے سامنے سجدہ ریز ہوتی رہی ہیں۔ ان کی افادیت و فیض رسانی کو دیکھ کر عقائد و خیالات میں اضمحلال آتا رہا ہے۔ اور کتنے ہی ہاتھ دست سوال بن کر ان کی دریوزہ گری کرتے رہے ہیں اور اس صورت حال کے نتیجے میں انسان اشرف المخلوقات کہلا کر بھی اپنی ساری شرافت و فضیلت کو ان کے قدموں پر ڈھیر کرتا رہا ہے۔

امت مسلمہ کو یہ بنیادی بات سکھائی گئی کہ ان عناصر قدرت میں کوئی قوت و عظمت نہیں یہ دکھاوے کی عظمتیں ہیں۔ اصل عظمت و قوت اور کبریائی کا سرچشمہ وہ ذات کبریا ہے جس نے ان کو وجود بخشا اور یہ قوتیں عطا فرمائیں اور تمہیں جوہر عقل دے کر انہیں تمہارے لیے مسخر کر دیا۔ تمہیں اگر ڈرنا ہے خوف کھانا ہے جھکنا ہے دست سوال دراز کرنا ہے اور امیدیں باندھنی ہیں تو ان سے نہیں جو تمہاری چاکری میں لگے ہوئے ہیں بلکہ اس سے جو تمہارا بھی اور ان کا بھی خالق ہے جو ان کو بھی اور تمہیں بھی زندگی اور سامان زیست عطا کرنے والا ہے۔ اس تصور کو قبول کر لینے کے بعد اگر ایک طرف عناصرِ قدرت اور مظاہرِ قدرت کے حوالے سے تمہارے اندر قوتِ تسخیر جنم لے گی خود آگاہی تمہارا مقدر بنے گی عرفانِ ذات کے نتیجے میں راز حیات سے آگاہی حاصل کر سکو گے تو دوسری طرف اپنے پروردگار کی معرفت میں قوت و عظمت کے سرچشمے کو پہچان لو گے۔ تمہارے کمزور ارادے ولولوں کی صورت میں تبدیل ہو جائیں گے۔ تمہاری ناآسودہ آرزوئیں آسودگی کا سامان پائیں گی۔ دکھوں کی ماری ہوئی انسانیت شفا اور مرہم کی تلاش میں بھٹکنے کی بجائے حقیقی دارالشفا سے وابستہ ہو جائے گی دلوں کی بنجر دنیا اپنے مالک کی محبت و عظمت سے آباد ہو جائے گی۔ اس ذات کبریا کی کبریائی کو پہچان لینے کے بعد ہر بڑی سے بڑی قوت پتلیوں کا تماشا دکھائی دے گی۔ زندگی اور موت کے حقیقی خالق و مالک سے وابستگی کے بعد موت سے ڈرنے کی بجائے موت مرغوب ہو جائے گی ناامیدیوں اور مایوسیوں کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں بھی جب نکلنے کے راستے

مسدود ہو جائیں ایک مرد مومن کبھی مایوس اور ہراساں نہیں ہوتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میرا رشتہ اس ذات سے ہے جو بند راستوں کا کھولنے والا اور مایوسیوں میں امیدوں کے دیپ روشن کرنے والا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بحر قلزم کی طغیانی کو دیکھ کر چیخ اٹھی انا لمدرکون ہم پکڑ لیے گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کلا ان معی ربی سیھدین ہرگز نہیں میرے ساتھ یقیناً میرا رب ہے وہ مجھے ضرور راستہ دکھائے گا۔ اس کے ساتھ وابستگی کے بعد مایوسی کا کیا معنی؟ آنحضرت ﷺ ایک سفر میں ایک درخت کے نیچے محو استراحت ہیں کوئی ساتھی پاس نہیں، صحابہ دور دور درختوں کے نیچے آرام کر رہے ہیں اچانک ایک بدوی آدھمکتا ہے تلوار نیام سے کھینچ کر سر پر آکھڑا ہوتا ہے اور حضور کو دھمکاتے ہوئے پوچھتا ہے بتاؤ اب تمہیں کون مجھ سے بچا سکتا ہے۔ حضور نہایت اطمینان سے فرماتے ہیں "اللہ" یہ سن کر بدوی پر ایک ہیبت طاری ہو جاتی ہے کانپنے لگتا ہے اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔ میدان بدر میں ایک ہزار جنگجو سورماؤں کے مقابلے میں غیر مسلح تین سو تیرہ مسلمانوں کا آکھڑا ہونا بلکہ نہایت بے خوفی سے رات بھر اطمینان سے سونا اور صبح میدان کارزار میں زندگی اور موت سے بے نیاز ہو کر داد شجاعت دینا۔ جنگ موتہ میں ایک لاکھ کے مقابلہ میں تین ہزار مسلمانوں کا اپنے گھروں سے سینکڑوں میل دور دشمن ملک میں تین روز تک نہایت پامردی سے اڑے رہنا اور آخر دشمن کا پسپا ہو جانا، یہ سب اس بات کا نتیجہ تھا کہ ہم کمزور سہی مگر ہمارے سر پر سایہ اس ذات کبریا کا ہے جو تمام قوتوں کی مالک ہے۔ زندگی اور موت جس کے قبضے میں ہیں۔ فیصلوں کا سررشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ہماری حیثیت قطروں کی سہی مگر ہمارا ساتھ سمندر کے ساتھ ہے۔ سمندر کا قطرہ گو قطرہ ہوتا ہے مگر وہ صرف قطرہ نہیں بلکہ سمندر کا قطرہ ہے وہ اپنے اندر وہی خواص رکھتا ہے دریا کی موج چند مٹھی ریت میں جذب ہو سکتی ہے مگر سیل رواں یا بھنور کا حصہ بن کر ایک طاقت بن جاتی ہے کیونکہ اس کی طاقت اپنی نہیں بلکہ سیل کی طاقت ہے یہی مطلب ہے اقبال کے اس شعر کا:

؎ ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا و کارساز

جب مسلمان اس طاقت کے حقیقی سرچشمہ سے تعلق جوڑ لیتا ہے اور اپنے دل کو اس کی محبت سے معمور کرلیتا ہے اپنی پیشانی پر اس کے آستانے کا نقش ثبت کرلیتا ہے تو پھر باقی ہر آستانے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس کی محرومیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ دنیا کے دکھ سکھ ابدی راحتوں کے یقین میں بے حقیقت ہو جاتے ہیں عشقِ خداوندی کی سرمستیاں حبِ دنیا کے جوش کو سرد کر دیتی ہیں۔ آخرت کی طلب اور محبت دنیوی خواہشوں اور آرزوؤں کو بے قدر و قیمت بنا دیتی ہے۔ اس طرح اللہ کی کبریائی اور عظمت سے سرشار مسلمان ان کمزوریوں سے بالا بلند ہو کر اس طرح بے پناہ ہو جاتا ہے کہ دنیا کا کوئی تخت و تاج کوئی جہان پناہ کوئی حرص اور لالچ اور زر و جواہر کی کوئی چمک نہ اسے اپنے سامنے جھکا سکتی ہے اور نہ بہلا سکتی ہے یہ ہے اللہ کی کبریائی اور اس کی عظمت کا ایک مفہوم اور اس کے اثرات اور دوسرا مفہوم اس کے اکبر اور عظیم ہونے کا یہ ہے کہ وہ صرف تکوینی طور پر بڑا نہیں بلکہ تشریعی طور پر بھی بڑا ہے۔ یعنی صرف اسی کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ اطاعت مطلق اسی کی کی جائے اسی کو حکم دینے کا حق ہے اور اس کے حکم کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ ہمارا خالق ہے ہم اس کی مخلوق ہیں عقل اور اخلاق اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ صفتِ خلق جس کے لیے ہو امر یعنی حکم بھی اسی کا ہونا چاہیے۔ الا لہ الخلق والامر جس طرح سرِ نیاز اور جبینِ عبدیت اس کے سامنے جھکنا چاہیے اسی طرح قانون بھی اسی کا چلنا چاہیے۔ حاکمیت بھی اسی کی ہونی چاہیے۔ بقول اقبال:

؎ سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

اس کے فکر سے صرف مسجدیں ہی آباد نہ ہوں بلکہ گھر بازار منڈیاں معاشی اور تعلیمی ادارے عدالتیں ایوانِ حکومت کھیل کے میدان ادبی اور

تہذیبی سرگرمیوں کے مراکز اور ثقافتی سنٹرز سب اسی کی ہدایات اور احکام کے تابع ہوں کیونکہ وہ سب سے بڑا ہے اس کے قانون کی عملداری سے نہ حکمران باہر ہوں نہ مذہبی اکابر، نہ قبائل کے شیوخ نہ سیاسی رہنما، اس کے قانون کی ترجمان عدالتیں عام آدمی ہی کو نہیں حاکمِ وقت کو بھی بلا سکیں اور سزا دے سکیں۔ یہ مفہوم ہے اللہ اکبر یعنی اللہ کے سب سے بڑا ہونے کا اور اسلام اپنے ماننے والوں میں پوری قوت سے اسے اپنی اساس اور بنیاد کے طور پر بروئے کار لانا چاہتا ہے۔

اور دوسری بنیادی اساس یہ ہے کہ جس طرح ایک مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا ہمہ وقت استحضار رہنا چاہیے۔ اس طرح اسے ہمہ وقت یہ بات مستحضر رہنی چاہیے کہ میں اول و آخر بندہ ہوں۔ بندہ ہونے کی حیثیت سے میری تخلیق ہوئی ہے بندگی ہی میری تخلیق کا مقصد ہے بندگی ہی میری جبلت اور میری سرشت ہے۔ مجھے سب مخلوقات کے مقابلے میں آزادی بخشی گئی ہے۔ لیکن اللہ کے مقابلے میں میں آزاد نہیں ہوں میں من مرضی کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ میں اپنے لیے راہِ ہدایت اور راہِ عمل خود وضع نہیں کر سکتا۔ میری انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اس لیے اس امانت کا حق اس کے احکام کے مطابق ادا کرنے کا میں پابند ہوں۔ میں بندہ ہوں میرا آقا میری طاقت بھی ہے اور میری جائے پناہ بھی۔ اسی کا آستانہ میری سجدہ گاہ بھی ہے اور وہی میری نیاز مندیوں اور میرے عشق و گداز کا امین بھی۔ میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں اسی کے لیے ہیں اور میرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں بھی اسی کے لیے ہیں۔ میں ہر وقت ایک بے طاقت تنکے اور پتے کی طرح اس کی گرفت میں ہوں۔ میری گویائی پر اس کا پہرہ ہے میری دانش و بینش اس کے احتساب میں ہے۔ میرا دل اور اس کے احساسات اسی کے قبضے میں ہیں۔ میری فعلی اور انفعالی قوتیں اسی کی مرہونِ منت ہیں اور بالآخر اسی کے سامنے جواب دہ ہیں۔ اس احساس بندگی کے تاثر کی ایک جھلک ہمیں آنحضرت ﷺ کی عبادتِ نیم شب کی دعاؤں میں نظر آتی ہے۔ ایک دعا ملاحظہ کیجئے، کس طرح

ایک ایک لفظ سے بندگی اور عجز و درماندگی کا اظہار ہو رہا ہے اور یہ دعا اس ذاتِ والا صفات کی زبانِ فیض ترجمان سے ادا ہو رہی ہے جو باعثِ تخلیقِ کائنات، محبوبِ ربِ کائنات اور معصومِ عن الذنوب و السیأت ہے۔ میدانِ عرفات میں کھڑے فرما رہے ہیں:

"اللّٰھم اِنک تسمَعُ کلَامی و تریٰ مکانی و تعلمُ سِرّی و عَلانیتی لا یخفیٰ علیک شئیٌ من امری و انا البائسُ الفقیرُ المُستغیثُ المستجیرُ الوجِلُ المُشفِقُ المقرُّ المُعترَفُ بذنبی، اسألک مسألۃَ المِسکین وابتَھلُ الیکَ ابتِھالَ المذنب الذلیل وادعوک دعاءَ الخَائف الضّریر و دعاء من خضعت لک رقبتہٗ وفَاضَتْ لکَ عبرتَہَ و ذلَّ لک جسمہ و رغِم لک انفہ اللھم لا تجعلنی بدعائک شقیًا وکن لی رؤفا رحیماؔ یا خیر المسؤلین و یاخیر المَعطین" (کنزالعمال عن ابن عباس)

اے اللہ تو میری بات کو سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے اور میرے پوشیدہ اور میرے ظاہر کو جانتا ہے۔ تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ میں مصیبت زدہ ہوں محتاج ہوں فریادی ہوں، پناہ جو ہوں پریشان ہوں۔ ہراساں ہوں اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والا ہوں اعتراف کرنے والا ہوں، تیرے آگے سوال کرتا ہوں جیسے بے کس سوال کرتے ہیں۔ تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں جیسے گنہگار عاجز گڑگڑاتا ہے اور تجھ سے طلب کرتا ہوں جیسے خوفزدہ آفت رسیدہ طلب کرتا ہے اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہو اور اس کے آنسو بہہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی کئے ہوئے ہو

> اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو اے اللہ تو مجھے اپنے
> سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور میرے حق میں بڑا مہربان
> نہایت رحم کرنے والا ہو جا' اے سب مانگے جانے والوں سے
> بہتر اے سب دینے والوں سے اچھے۔

یہ ہیں وہ دو بنیادیں جن کی بنیاد پر اسلام اپنے ماننے والوں کی سیرت و کردار کی عمارت تعمیر کرنا چاہتا ہے جس میں ایک طرف اپنے مالک و خالق کی کبریائی اور عظمت و جلال کا ہمہ وقتی استحضار ہے اور دوسری طرف اپنی بندگی اور عجز و درماندگی کا گہرا احساس ہے۔ غور فرمائیے جس سیرت و کردار میں اللہ کی عظمت و جلال رچ بس جائے کیا وہ کبھی کسی بڑی سے بڑی قوت کے سامنے سرنگوں ہو سکتی ہے۔ وہ کسی فرعون اور نمرود سے مرعوب ہو سکتی ہے۔ کسی بڑے سے بڑے خطرے سے ہراساں ہو سکتی ہے کسی بڑی سے بڑی تکلیف کے پیش آجانے سے مایوس ہو سکتی ہے۔ کسی بڑی سے بڑی ابتلا میں بے صبر ہو سکتی ہے۔ اسے تو اگر نارِ نمرود میں پھینکا جا رہا ہو اور جبریل علیہ السلام پیشکش کریں کہ اے اللہ کے خلیل اگر آپ چاہیں تو میں کچھ مدد کروں تو حضرت خلیل استفسار کرتے ہیں کہ میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے کیا میرا مالک دیکھ رہا ہے یا نہیں کسی حضرت جبریل عرض کرتے ہیں اس کی نگاہوں سے کوئی چیز مخفی نہیں تو حضرت ابراہیم فرماتے ہیں پھر مجھے سوائے اپنے مالک کے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔

طائف کے پتھروں نے آنحضرت کو بری طرح زخمی اور مضمحل کر دیا ہے خون جوتوں میں جم گیا ہے جوتے چھڑانے سے چھوٹتے نہیں۔ آپ نڈھال ہو کر ایک باغ میں پناہ لیتے ہیں۔ اس بے کسی اور مظلومیت کی حالت میں ملک الجبال حاضر ہو کر اللہ کا سلام اور پیغام پہنچاتا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو ان طائف والوں کو طائف کے دو طرفہ پہاڑوں کو ملا کر پیس ڈالوں تاکہ یہ اپنے برے انجام کا مزہ چکھیں۔ آنحضرت نہایت اطمینان سے فرماتے ہیں۔ میں رحمت بن کر آیا ہوں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اہل طائف کی اولاد میں سے اپنا نام لینے والوں کو اٹھائے گا۔

اسلام کی تاریخ میں اس کے ماننے والوں نے ہر کڑے امتحان میں استقامت اور استقلال کی مثالیں چھوڑی ہیں۔ ہر کٹھن واری میں سرخروئی ان کا مقدر رہی ہے۔ ابتلاء و آزمائش کی ہر گھڑی میں صبر و تسلیم کے درخشاں نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ سب کس بات کا نتیجہ کس تعلیم کا اثر اور کس تربیت کا ثمر تھا۔ صرف اس بات کا کہ ان کی پشت پناہ ایک ذات کبریا ہے ان کے سر پر خداوند ذواجلال کا سایہ ہے اور ان کے دلوں میں رحمت ایزدی کی ٹھنڈک ہے۔

اسی طرح اسلامی سیرت و کردار کی دوسری بنیاد اپنی بندگی و درماندگی کا گہرا احساس ہے۔ ظاہر ہے جس دل و دماغ میں یہ احساس جڑ پکڑ جاتا ہے وہ اپنے ابنائے نوع ہی نہیں بلکہ اللہ کی ہر مخلوق کے لیے سایۂ رحمت بن جاتا ہے وہ دنیا میں ان اقدارِ حیات کا پیغامبر بن کر جیتا ہے جو ہوا اور پانی کی طرح حیاتِ انسانی کی ضامن ہیں۔ وہ اپنی ذاتی حیثیت میں ذمہ داری اور جوابدہی کے احساس کا پیکر ہوتا ہے وہ بڑے سے بڑے عہدہ و منصب پر فائز ہو کر بھی ایک بندہ ہی رہتا ہے۔ اس کی تمام تر منصبی وجاہت کے باوجود ایک اجنبی اسے مزدور سمجھ کر اپنا بوجھ اس کے سر پر لاد دیتا ہے۔ حکومت کی نازک ذمہ داری بھی اس کے سپرد کی جائے تو وہ فرعون و نمرود بن کر ظلم و جبر کی بجائے فقر و درویشی کی تصویر بن جاتا ہے۔ بقول اقبال:

ان کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دیں فقر ہے شاہی نہیں

مختصر یہ کہ تمام انسانی کمزوریوں اور تمام اخلاقی برائیوں اور فکر و خیال کی تمام کوتاہیوں اور کجرویوں کے یہی دو سبب ہیں۔ یعنی اللہ کی کبریائی اور اپنی بندگی کو فراموش کر دینا اور انسانیت کے احیاء اور انسانوں کے گھرانوں کی از سر نو آبادی کی بھی کوئی ضمانت ہے تو وہ بھی انہیں دو حقائق کا مسلمانوں کی زندگی میں پیدا ہو جانا ہے۔

# اسلامی سیرت و کردار میں نماز کا کردار

میرے بھائیو! اور عزیزو! میں نے گزشتہ گفتگو میں تفصیل سے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی سیرت و کردار کا دارومدار دو بنیادی حقائق پر ہے اور نماز انہی دو بنیادی حقائق اور عوامل کو پیدا کرنے اور ان کی بنیاد پر تعمیرِ سیرت کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ آیئے اب دیکھیں کہ نماز اپنا یہ کردار کس طرح انجام دیتی ہے۔

نماز کی تفصیلات پر غور کرتے ہوئے ہمارا سب سے پہلا تعارف اس ندا اور بلاوے سے ہوتا ہے جسے اذان کہتے ہیں۔ اذان کا پہلا جملہ ہی دل و دماغ میں ایک ارتعاش پیدا کر دیتا ہے تصور کیجئے رات کی تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے طبیعت میں ہول اٹھتا ہے اور اگر بدقسمتی سے حالات بھی ناسازگار ہیں یعنی ظلم کے پہرے ہیں۔ اقتدار حق و صداقت کی آواز کو دبانے میں طاقت و قوت استعمال کرنے پر تلا ہوا ہے زبانوں کو لونی لگ چکی ہے اور ہر کوئی منقار زیر پر ہے۔ ایسی حالت میں ایک منحنی سا موذن بلند مستورے پر کھڑا ہو کر انسانوں کی اس خاموش اور خوف زدہ بستی میں اللہ اکبر کہہ کر رب ذوالجلال کی کبریائی کا اعلان کرتا ہے اور لوگوں کے حوصلوں کو زندگی دیتے ہوئے توجہ دلاتا ہے کہ لوگو رات کے ان مہیب اندھیروں کو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا تھا کہ ان اندھیروں اور تاریکیوں میں سے سحر کی نمود ہوگی۔ غور سے دیکھو وہ پو پھٹ رہی ہے سپیدۂ سحر طلوع ہو رہا ہے۔ روشنی کا لشکر اندھیروں کے لشکر کو پسپا کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ جس عظیم ذات نے ان گھٹا ٹوپ ظلمتوں میں سے صبح کا اجالا نکالا ہے وہی تمہاری

قسمتیں بدلنے پر قادر ہے۔ وہی ذات کبریا جس نے رات کو دن سے بدلا ہے وہی اس جھوٹے اقتدار اور ظلم و استبداد کے جبر کو عدل و احسان سے بدلنے کی طاقت رکھتا ہے وہی ذات ہے جس کی بڑائی اور عظمت کا یقین تمہاری کمزوریوں کا مداویٰ بنے گا اور اسی کا بھیجا ہوا ضابطۂ حیات انسانیت کی سحر کا آئینہ دار ہے۔ اسی سے جھونپڑیوں کے اندھیرے ختم ہوں گے اور تخت و تاج اور غالب طبقات کے ہاتھوں ستائے ہوئے مظلوم و مقہور انسان عظمت و کبریائی کے اس حقیقی سرچشمے سے وابستہ ہوکر مظلومیت اور بے بسی کی زنجیریں توڑ ڈالیں گے اور یہ اذان ایک نفخ صور کی طرح آنے والے مستقبل کی نوید ہے۔ بقول اقبال:

؎ یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اللہ کی کبریائی کے اعلان کے بعد موذن کہتا ہے "اشہدان لا الہ الا اللّٰہ" میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں یعنی اے دنیا کے لوگو جب اللہ سب سے بڑا ہے مظاہر قدرت سے بھی بڑا ہے تخت و تاج اور اس کے حاملین سے بھی بڑا ہے۔ مشیخیت اور تقدس کے دعویداروں سے بھی بڑا ہے تو پھر میں اسے چھوڑ کر کسی اور کو الٰہ کیسے بناؤں یعنی اپنی جبینِ نیاز کسی اور کے سامنے کیسے جھکاؤں کسی اور کو حلت و حرمت اور غیر مشروط اطاعت کا اختیار کیسے دے دوں۔ کسی اور سے امید و بیم کا رشتہ کیسے جوڑوں۔ اپنی محرومیوں کے ازالے کے لیے کسی اور کے سامنے دست سوال کیسے دراز کروں اور اپنے دل و دماغ کو کسی اور کی محبت سے کیسے آباد کروں۔ پھر اسے معاً خیال آتا ہے کہ فکر و نظر اور ہدایت و صداقت کے اس خزانے کی خبر مجھے کس نے دی کس نے انسان کو از سرِ نو اس آستانے پر جھکایا اور کس نے اس قوت سے یہ صور پھونکا کہ آج دنیا ہزار انکار اور فساد کے باوجود اسی کے خیالات اور طرزِ فکر کی

گرفت میں ہے۔ بقولِ حالی:

؎ بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود اسی کی لگائی ہوئی ہے

اس لئے وہ پوری توانائی سے اور پوری سرخرشی میں اعلان کرتا ہے " اشهدان محمدا رسول اللہ" میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ اور اس کے بندے کے رشتے کو جوڑنے والی ذات صرف ذات محمد ﷺ ہے۔ وہی میرا آئیڈیل ہے۔ اسی کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ وہی محسن انسانیت ہیں وہی ہیں جنہوں نے زندگی کا ہر دکھ اٹھا کر ہمارے لئے زندگی نہ صرف آسان کر دی بلکہ زندگی کا محرمِ اسرار بھی بنایا اور اپنی سنت طیبہ کی شکل میں وہ چراغ روشن کئے جو تا ابد انسانیت کے لیے منارۂ نور ثابت ہوں گے۔ اس کے بعد موذن نماز کی طرف اور کامیابی و کامرانی کی دعوت دیتا ہے اور اس دعوت کی کامیابی اور زندگی میں اس کے گہرے شعور کے لیے پھر اللہ کی کبریائی اور صرف اسی کی الوہیت کے اعلان پر برق و رعد کی قوت رکھنے والے اس مژدہ جانفزا کی تکمیل ہو جاتی ہے پھر دعوت دینے والا اور قبول کرنے والے یعنی داعی اور مدعو دونوں اس نماز کے لیے اللہ کے گھر کی طرف لپکتے ہیں۔ اللہ کی کبریائی اور اپنی بندگی کے تصورات سے سرشار اور اس کی عبادت کے لیے ہمہ تن تیار ہو کر جب اللہ کے بندے اللہ کے گھر میں داخل ہوتے ہیں تو کبھی تنہا اور کبھی جماعت کے ساتھ نماز کا آغاز ہوتا ہے تو سب سے پہلے جو جملہ نمازی کی زبان پر آتا ہے وہ وہی ہے جس سے اذان کا آغاز ہوا تھا یعنی اللہ اکبر۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اسی سبق کو پھر دھرایا جارہا ہے کیونکہ جس سیرت و کردار کو پیدا کرنا مقصود ہے اس کا مدار اسی کلمہ پر ہے اور اس امت کو جو تہذیب اور طرز عمل دینا ہے اس کی شہ کلید بھی یہی ہے اور پھر یہ کلمہ صرف زبانوں سے ہی دھرایا نہیں جاتا بلکہ اس کے ساتھ ہاتھ بھی کانوں تک اٹھائے جاتے ہیں جس سے ایک عہد و پیمان کا اعلان مطلوب ہے۔ ہاتھ اٹھانے والا اعلان کرتا ہے' یا اللہ آج تک غفلت وجود کا شکار ہو کر نہ جانے کیسے کیسے گناہ اور کیسی کیسی کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ نہ جانے

کس کس کو بڑا جان کر ان کی بندگی اور چاکری کی ہے نہ جانے کس کس آستانے پر سر جھکایا اور منتیں مانی ہیں۔ نہ جانے کتنی دفعہ مختلف قوتوں اور نام نہاد عظمتوں کی پوجا کی ہے کیسے کیسے اپنے نفس اور اس کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے تیرے احکام سے تجاوز کیا ہے یا اللہ میں آج سے ان سب خداؤں کا انکار کرتا ہوں سب آستانوں سے سر اٹھاتا ہوں سب قوتوں کو پس پشت ڈالتا ہوں اور صرف تیری بڑائی کا اقرار و اعتراف کرتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر تسلیم و انقیاد کا پیکر بننے کا اعلان کرتا ہوں۔ میں بہ صمیم قلب اعلان کرتا ہوں کہ آج کے بعد میری بندگی و غلامی صرف تیرے لیے ہوگی۔ میری صلاحیتیں تیرے راستے میں کام آئیں گی۔ آج سے میرے دل کا بادشاہ تو ہے۔ کیونکہ "سُبحانکَ اللّٰھمّ و بِحمدِک" تو ہر عجز سے پاک ہے سب تعریفیں صرف تجھے ہی زیب دیتی ہیں۔ وتبارک اسمک تیرا نام برکت والا ہے و تعالیٰ جدک بندگی کے دعویدار بہت ہیں لیکن حقیقت میں صرف تیری بزرگی عظیم ہے' ولا الہ غیرک اس لئے میں تیرے سوا کسی اور کو الہ ماننے سے انکار کرتا ہوں۔ تیرے سوا کوئی معبود ہے نہ مطلوب نہ حاکم ہے نہ قانون و دستور دینے والا۔ یہ زندگی صرف تیری عطا ہے اور صرف تیری امانت۔ میں اسے تیرے لیے اور تیرے ہی احکام کے مطابق گذارنے کا اقرار و اعلان کرتا ہوں۔ لیکن مجھے اپنے عجز کا بھی اعتواف ہے اور اپنی کمزوریوں کا بھی اس لئے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم مجھے شیطان رجیم سے اپنی پناہ میں لے لے۔ دل و دماغ تیرے قبضے میں ہیں۔ تو اس کی اکساہٹوں اور بہکاووں سے میری حفاظت فرما اور نماز کے اندر بھی مجھے اپنے حصار میں لے لے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے۔ تیرے نام سے آغاز کر رہا ہوں۔ کیونکہ تو ہی آغاز و اختتام کا مالک ہے اور تیری تعریف میں میں رطب اللسان ہونا چاہتا ہوں۔ کیونکہ ہر طرح کی تعریف تیرے ہی لئے زیبا ہے۔ اور میں تیرے سوا کسی اور کی تعریف کروں بھی کیونکر؟ جبکہ تو صرف میرا خالق ہی نہیں بلکہ میری زندگی اور بقاء اس کے امکانات اور اسباب معیشت اور اس میں درجہ بدرجہ ارتقاء کا

ضامن و کفیل بھی تو ہے۔ میں دنیا میں آیا تو ہر مخلوق سے بڑھ کر بے کسی و بے بسی کی تصویر تھا۔ تو نے ہی میرے لیے میرے والدین کے دل میں شفقت و محبت پیدا فرمائی۔ باپ کے جہد و عمل اور ماں کے بے تاب جذبۂ محبت کو میری نگرانی و خدمت پر لگا دیا۔ میری ماں کے سینے میں میرے لیے غذا رکھی اور مجھے اسے حاصل کرنے کا سلیقہ دیا۔ ذرا بڑا ہوا تو سمع اور بصر سے نوازا۔ قوتِ شناخت عطا فرمائی۔ باقی حواس کا دیا روشن کیا۔ قسم قسم کی نعمتیں عطا فرمائیں۔ جسمانی اور معنوی قوتوں سے بہرہ ور فرمایا۔ جیسے جیسے ضرورتیں پیدا ہوتی گئیں ویسے ویسے صلاحیتیں اور توانائیاں حسب ضرورت عطا کی گئیں۔ کیونکہ تو رب العالمین ہے پھر عجیب بات یہ ہے کہ صرف حسب ضرورت نعمتیں ہی عطا نہیں کی گئیں بلکہ حسن و جمال اور رعنائی و نیرنگی کا ایک جہاں بھی آراستہ کر دیا گیا۔ ضرورت صرف پانی کی تھی مگر صرف پانی نہیں دیا گیا بلکہ چشمے سیماب اگلنے لگے برف کے تودے گلنے لگے، فوارے اچھلنے لگے، بارشیں برسنے لگیں، گھٹائیں جھوم جھوم کر اٹھیں آبشاروں نے قلب و نگاہ کی آسودگی کا سامان بھی کیا۔ ضرورت صرف غذا کی تھی مگر سبزے کا مخملیں فرش بچھایا گیا۔ گندم کے سنہرے خوشوں سے زمین کو دلہن کی طرح آراستہ کر دیا گیا۔ قسم قسم اور رنگ برنگ کے پھل اور پھول پیدا فرمائے گئے۔ کام و دہن کی لذت کا سامان بھی کیا اور مشام جان کو معطر بھی فرمایا۔ ضرورت لکڑی کی ہوئی مگر درختوں کو خوش رنگ پتوں کی چھتریاں عطا کی گئیں۔ چیڑوں کے جھنڈے گاڑ دیئے گئے۔ نوع بہ نوع پھلوں سے رنگ و خوشبو کی بہار پیدا کر دی گئی اور یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کیونکہ تو الرحمان الرحیم یعنی رحیم و رحمان ہے اور تیری رحمت کا تقاضا ہوا کہ تو ربوبیب کے ساتھ ساتھ حسن و جمال اور رنگ و نور کی دنیا بھی بسائے۔ اب ظاہر ہے کہ جس ذات نے اس کائنات کو پیدا فرمایا پھر اپنی مخلوق کی عہد بہ عہد ضرورتوں کو پورا فرمایا اور پھر انسان جیسی مخلوق پیدا فرما کر اسے ارادہ و تمیز کی نعمت قوت ادراک اور جوہر عقل سے نوازا۔ اب ظاہر ہے یہ ساری کائنات اور بالخصوص انسان کوئی خودرو پیدا تو نہیں ہے جو چند روزہ زندگی گذار کر

موت اور فنا کا شکار ہو جائے اور انسان کا خالق صرف رب اور رحیم و کریم ہی نہیں بلکہ عادل بھی ہے اس کے عدل کا تقاضا ہے کہ وہ ہماری زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد متعین کرے اور پھر اس زندگی کے بعد اس کے بارہ باز پرس بھی کرے کیونکہ وہ مالک یوم الدین بھی ہے۔ اے اللہ تیری ربوبیت نے ہمیں پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔ تیری رحمت نے دل و دماغ کی رعنائیاں عطا کیں۔ اور کائنات کے حسن و جمال سے محظوظ ہونے اور لذت اندوز ہونے کا سلیقہ عطا فرمایا۔ اب تیرے سامنے دست بستہ کھڑے اپنی بندگی کا اقرار کرتے ہوئے تجھی سے احساسِ بندگی اور اظہارِ بندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔ اور اپنی کمزوریوں کی تلافی کے لیے تجھی سے استعانت کرتا ہوں۔ "ایاک نعبد و ایاک نستعین" ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں اور تجھی سے یا اللہ درخواست گذار ہوں کہ تو مجھے صراط مستقیم کی ہدایت عطا فرما کیونکہ میری دانش نارسا اور وقت کے فلسفوں اور ازموں کی ستم خوردہ ہے میرا ایمان زناری اور میری استقامت خواہش و ہوس سے شکست خوردہ ہے۔ ان ٹیڑھے میڑھے راستوں اور الجھی ہوئی پگڈنڈیوں میں اور بکھرے ہوئے اور بپھرے ہوئے مسائل میں صراط مستقیم کی تلاش میرے لیے بہت مشکل ہے۔ یا اللہ تو میری دستگیری فرما اور ان لوگوں کے نقش قدم میرے سامنے روشن فرما دے جو تیرے انعام و اکرام کے مستحق ٹھہرے اور ان لوگوں کے سائے سے محفوظ فرما جو تیرے غضب کا مورد بنے۔ مجھے انبیاء و شہداء، صدیقین اور صالحین کے قافلے کا ایک فرد بنا دے اور ان سے بچھڑنے اور پچھڑنے سے محفوظ فرما، اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین" اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی دعا کو شرف قبولیت عطا فرماتا ہے اور پورے قرآن کریم کو سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ ہے وہ صراط مستقیم جس کے لیے تم نے دعا کی تھی۔ اب اسے پڑھو، سمجھو اور اس کی روشنی میں زندگی کے انفرادی اور اجتماعی مسائل حل کرو۔ یہی وہ نسخہ کیمیا ہے جس سے تمہارا مسِ خام کندن بنے گا اور کھرا اور کھوٹا الگ الگ ہو جائے گا۔ چنانچہ آنحضرت

ﷺ اور صحابہ کرام اپنی نمازوں میں تنہا بھی اور باجماعت بھی کثرت سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے۔ جہری نمازوں میں بالخصوص لمبی لمبی سورتیں تلاوت کرتے اور پھر چونکہ روزانہ بہ تکرار نمازوں میں قرآن پڑھا جاتا تو اسی سے حفظ میں بھی مدد ملتی احکام کا استحضار بھی ہوتا یاد دہانی میں بھی اضافہ ہوتا اور دل و دماغ میں بھی اس کی تعلیمات اترتی چلی جاتیں۔ آیاتِ رحمت سے سینے گداز ہوتے اور آیاتِ عذاب سے دل پگھلنے لگتے تھے۔ جب یہ سوز و گداز سینے میں ہلچل مچانے لگتا ہے تو بے اختیار زبان پر اپنے رب کی عظمت اور پاکی کا ورد مچلنے لگتا ہے۔ جسم اپنے رب کے حضور جھک جاتا ہے اور آدمی بے ساختہ پکارتا ہے "سبحان ربی العظیم" پاک ہے میرا رب جو عظمت والا ہے۔ اس نے زندگی گذارنے کے لیے کیسا انمول ضابطۂ حیات اور کیسا پاکیزہ وظیفۂ حیات عطا فرمایا ہے۔ جب آدمی سر جھکائے اپنے رب کی عظمتوں کو دل میں بسائے اور عاجزی و فروتنی کی تصویر بنے اپنے رب کی تسبیح و تحمید کر رہا ہوتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ میری عبدیت اور بندگی اللہ کی عظمت و کبریائی کے حصار میں ہے۔ میرا سب کچھ اسی کا عطیہ ہے میں اسی کا چاکر ہوں اور میری چاکری ہی میرا اصل سرمایہ ہے اب وہ چاہتا ہے کہ میں اپنے اس سرمائے کو کلیتہ" بہ ہمہ وجوہ اپنے رب کے سامنے ڈال دوں۔ چنانچہ وہ حالتِ جذب میں پکارتا ہے "سمع اللہ لمن حمدہ" اللہ نے اس کی سن لی جس نے اس کی تعریف کی۔ ربنا لک الحمد اے ہمارے رب ہر طرح کی تعریف تیرے لیے ہے پھر اپنا سر یعنی اپنی عقل و دانش کا سارا سرمایہ فخر و اعتماد کا تمام اثاثہ اور درد و سوز و آزومندی کی متاعِ بے بہا اپنے رب کے آستانے پر ڈال دیتا ہے اور پکارتا ہے "سبحان ربی الاعلی" پاک ہے میرا رب جو سب سے برتر و افضل ہے۔ سر زمین پر رکھے دیر تک بندگی و فروتنی کا نذرانہ پیش کرتا ہے۔ پھر اللہ اکبر کہہ کر اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے۔ اب عشق و سرمستی کی شورش کسی حد تک آنکھوں کے راستے بہتے ہوئے آنسوؤں اور سینے میں ابلتی ہوئی آہوں نے مدھم کر دی ہے اب وہ نہایت اطمینان سے اپنے رب کے حضور اپنی پوری زندگی کا

نذرانہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے رب کی نعمتوں کا استحضار کرتا ہے۔ اس کا دل پکارتا ہے یا اللہ تو نے مجھے بیش بہا نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ دل عطا فرما کر حوصلوں اور ولولوں کی دنیا عطا کر دی ہے۔ دماغ دے کر فکر و تدبر کا خزانہ کھول دیا ہے۔ ہاتھ پاؤں دے کر معیشت کی راہ آسان کر دی ہے۔ زبان عطا فرما کر زمزمہ سنجی، خوش نوائی اور حق گوئی کا جہاں آراستہ کر دیا ہے۔ یا اللہ یہ ساری نعمتیں تیری ہیں۔ "التحیات للّٰہ والصلوات والطیبات" ساری قولی عبادتیں ساری فعلی عبادتیں اور تمام مالی عبادتیں یا اللہ تیرے لیے ہیں۔ حمد و ثنا کے سارے ترانے جسمانی قوتوں اور ذہنی صلاحیتوں کی ساری کاوشیں اور دل کے سارے ولولے اور ہمہمے اور مال و دولت اور زر و سیم کے تمام علاقے:

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری
امیدیں مری جستجوئیں مری
یہی کچھ ہے مولا متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

یا اللہ یہ حاصل ہے میری بندگی کا۔ یہ سب کچھ تیری بارگاہ میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ پھر معاً اسے خیال آتا ہے کہ اپنے رب سے ٹوٹا ہوا یہ رشتہ کس نے جوڑا، انسانوں کے یہ منتشر ذرے کس نے جوڑ کر صحرا بنایا اور کس نے یہ قطرے ملا کر دریا بنا دیا کس نے انسان کو خود آگاہ بنا کر خدا آگاہ بنا دیا۔ ان احسانات کو یاد کر کے پکار اٹھتا ہے۔ "السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ" اے نبی آپ پر سلام ہو اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں۔ پھر اسے صحابہ کرام اور ان کے راستے پر چلنے والے صالحین کے گروہ یاد آئے جن کی جانفروشیوں سے ہمیں ایمان و اسلام کی دولت

ملی اور پھر ان سے اپنی وابستگی کا بھی خیال آیا تو پکارا "السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین" سلام ہو ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر۔ پھر اس سبق کی یاد دہانی اور اسی حقیقت کا احساس جو بندگی کا سبب بھی ہے اور حاصل بھی اور اس ذات عزیز کی یاد جو محسنِ انسانیت ہے۔ "اشھدان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ" رسول مقبول ﷺ کی یاد آتے ہی آپ کے بے پایاں احسانات یاد آنے لگتے ہیں۔ تو نمازی احساس و اعتراف کے تصور کے ساتھ درود شریف پڑھتا ہے۔ اس سبق کی یاددہانی کے ساتھ اپنی بندگی کی کمزوریوں کا احساس ابھرتا ہے اور وہ دعا کرنے لگتا ہے۔ جس میں کوتاہیوں کی معافی نماز کی قبولیت اور مستقبل میں فلاح و کامرانی اور عافیت مانگتا ہے اور جہنم سے پناہ طلب کرتا ہے اس طرح اس افضل عبادت کا خاتمہ احساسِ ندامت اور اعترافِ تقصیر پر ہوتا ہے اور کسی صحیفۂ اعمال کے خاتمہ کے لیے اس سے زیادہ مناسب و موزوں چیز کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ پھر وہ نماز کو اس طرح ختم نہیں کرتا جیسے وہ کسی قید میں تھا اور اب اس کو آزادی نصیب ہوئی ہے بلکہ بڑے خوشگوار اور پاکیزہ اسلوب میں دائیں بائیں منہ پھیرتا ہے اپنے ساتھی نمازیوں پر' سب مسلمانوں پر اور ان فرشتوں پر جو اس موقع پر موجود اور گواہ ہوتے ہیں سلام بھیجتا ہے اور کہتا ہے' "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی اور عالم میں منتقل ہو گیا تھا اور حاضر و موجود سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا تھا اب وہ پھر اپنی پہلی جگہ اور اپنی زندگی کے پہلے مرکز پر واپس آگیا ہے۔ نماز مومنوں کے لیے معراج ہے یہ گویا معراج سے واپس آیا ہے اور جو لوگ آس پاس ہیں ان کو سلام کر رہا ہے جیسے کسی طویل سفر اور طویل غیر حاضری کے بعد واپس آنے والے کا معمول اور دستور ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ نماز کا طریقہ اس کی کیفیت اس میں پڑھی جانے والی دعائیں اس میں تلاوت قرآن کریم کا اہتمام اور اس میں گہرا خشوع و خضوع ایک نمازی کے اندر اللہ کی کبریائی اور اس کی اپنی عبدیت اور بندگی کا تاثر ابھارنے اور اسلامی تشکیل سیرت و کردار میں کس قدر معاون اور مددگار ہوتا ہے اور پھر یہ کوئی

ایک دفعہ کا معاملہ نہیں بلکہ دن میں پانچ مرتبہ یہ مشق کرائی جاتی ہے۔ صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے ان تاثرات کو دل و دماغ میں ابھارا جاتا ہے بندے اور اس کے رب کے رشتے کی یاد دہانی کرائی جاتی ہے ایک بندے کو اس کی اصل حیثیت کا احساس دلایا جاتا ہے تاکہ جب وہ دن کے وقت اپنے فرائض زندگی اور کاروبار معیشت کا آغاز کرے تو یہ احساسات اور تاثرات ہمہ وقت اس کے ہمرکاب اور ہم نشین رہیں اور جب وہ اپنے معمولات میں حدود سے تجاوز کرنے لگے، مسرت و شادمانی کے لمحات میں بہکنے لگے، ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے امانتوں میں خیانت کرنے لگے، اقتدار و حکومت کے نشے میں ظلم و تعدی پر آمادہ ہو، یا محکومیت و مظلومیت میں اپنے تئیں بے سہارا پا کر ڈولنے لگے تو اللہ کی کبریائی اور عظمت اور اپنی بندگی و اطاعت کا گہرا شعور ہر قدم پر اس کی دستگیری کرے۔ ہمارے پروردگار سے بڑھ کر ہماری کمزوریوں کو اور کون جانتا ہے اسے خوب علم ہے کہ نسیان و ذہول اور خواہشات و جذبات سے مغلوبیت ہمارا وطیرہ ہے۔ اس لیے نماز جیسی یاد دہانی اور ذکر کو صرف صبح تک محدود نہیں رکھا بلکہ ہر بدلتی ہوئی حالت کا لحاظ فرماتے ہوئے بار بار اس کا حکم دیا۔ ہمارا سب سے زیادہ مصروفیت کا وقت دوپہر سہ پہر اور شام کا وقت ہے جب کاروبار معیشت زوروں پر ہوتا ہے اور اندیشہ ہوتا ہے کہ حبّ دنیا، ہوسِ زر اور دیگر عوامل کہیں اساسی مقاصد پر غالب نہ آجائیں تو ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں فرض فرما کر اصل حیثیت اور حقیقی مقاصد کی یاددہانی فرمائی اور انسانیت کو پستی میں ڈوب جانے اور غفلت میں بہک جانے سے بچایا اور پھر سونے سے پہلے عشاء کی نماز فرض فرما کر اور نسبتاً" لمبی نماز پڑھا کر دن بھر کی کوتاہیوں پر استغفار اطاعت و خدمت پر استقامت کی صورت میں شکر کے اظہار اور آنے والے کل کے لیے دعا و مناجات کا موقع عطا فرمایا۔ اس طرح دن میں پانچ مرتبہ اللہ سے بندگی و عبودیت کا عہد لیا گیا اور اسلامی سیرت و کردار کی ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دی گئی۔ جب تک اس عہد و پیمان میں شعور و آگہی کی کارفرمائی باقی رہے گی اسلامی سیرت و کردار میں ضعف پیدا ہو جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

# نماز میں محبت کی کارفرمائی
# اور دیگر کیفیات کا تذکرہ
# اور نماز کے مسائل

معزز حاضرین!

گزشتہ گفتگو میں آپ نے نماز کی تفصیلات اور ان میں مضمر کیفیات کا حال سنا۔ اس سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ نماز میں اللہ تعالیٰ نے تعلق باللہ، عبدیت اور کامل فدائیت کی ایسی روح سمو دی ہے کہ ان کی موجودگی میں ایک نمازی کے گمراہ ہو جانے کا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ انسان اپنے نسیان اور تغافل کی وجہ سے اور جذبات کے زیرِ اثر رہنے کے باعث بار بار ان کیفیات سے نہ صرف یہ کہ لاتعلق ہو جاتا ہے بلکہ بعض دفعہ نماز کی حقیقت بھی اس سے رخصت ہو جاتی ہے۔ وہ بظاہر نماز پڑھتا ہے لیکن اس کی نماز میں روح نہیں ہوتی۔ نماز اس کی ایک عادت بن جاتی ہے۔ جس سے زندگی کا حقیقی تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ نمازیں بظاہر اللہ کے لیے پڑھی جاتی ہیں۔ مگر باقی ساری زندگی کا رشتہ اللہ سے ٹوٹ کر غیر اللہ سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ بقول اقبال:

؎ تیری نماز بے حضور تیرا امام بے سرور
ایسی نماز سے گذر ایسے امام سے گذر

اسی لیے اسلام نے بندگی و عبودیت کے اس رشتے میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کو بھی لازم ٹھہرایا ہے بلکہ اسے مسلمانوں کی خصلت اور عادت مستمرہ کے طور پر بیان فرمایا۔ والذین آمنوا اشد حبا للہ مومن اللہ سے محبت میں بہت شدید یعنی بہت پختہ کار ہوتے ہیں۔ کیونکہ محبت ایک زور دار جذبہ ہے جو باقی سب جذبات پر باسانی غالب آجاتا ہے اور خود اس پر کسی دوسرے جذبے کا غالب آجانا آسان نہیں ہوتا۔ جس دل میں یہ جذبہ اتر جاتا ہے وہاں پھر کسی اور تعلق اور وابستگی کے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑتا' بقول اقبال:

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

آنحضرت ﷺ میں اس جذبۂ بیتاب یعنی محبت خداوندی کا اظہار اسی نماز کے ذریعہ ہوتا تھا۔ جب کبھی آپ پریشان ہوتے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرماتے ارحنی یا بلال اے بلال مجھے آرام پہنچاؤ۔ بلال پوچھتے حضور کیسے؟ فرماتے اذان کہو تاکہ نماز پڑھوں کیونکہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

پریشانی میں آدمی ہمیشہ اسی کو پکارتا اور یاد کرتا ہے جس پر سب سے زیادہ اعتماد اور پیار ہوتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کا حال یہ تھا کہ ذرا ہوا تیز چلتی یعنی آندھی آتی یا گھٹا اٹھتی یا سورج یا چاند کو گرہن لگتا تو آپ بے تاب ہو جاتے اور قدم فوراً" مسجد کو اٹھ جاتے اور الصلوۃ الجامعۃ کا اعلان ہونے لگتا آپ لمبی نماز پڑھاتے جس میں آپ کی بے چینی اور بے کلی دیکھنے والوں کو بے تاب کردیتی سینہ مبارک سے اس طرح آواز نکلتی جیسے ہنڈیا ابلتی ہے طائف کے پتھر کھا کر بھی یہ فرمایا کہ اے وہ ذات جس کے چہرے کے نور سے تاریکیاں کافور ہوتی ہیں اگر تو مجھ سے ناراض نہیں تو مجھے اپنے زخموں کی کوئی پرواہ نہیں کوئی حد ہے عشق و محبت کی؟ یہی محبت ایک مومن کا حقیقی سرمایہ ہے یہی محبت ہے جو اسے قوت اور توانائی عطا کرتی ہے یہی محبت ہے جو اس کے دل میں

کھٹک اور کسک بن کر اسے غیر شرعی امور سے روکتی اور اطاعت خداوندی پر اکساتی اور قوت فراہم کرتی ہے۔ سردیوں کی راتوں میں لحاف سے نکلنا اور وضو کرنا اور میٹھی نیند کو چھوڑ کر نماز پڑھنا اور گرمیوں کے دنوں میں روز کی صعوبت برداشت کرنا انتہائی مشکل کام ہیں لیکن اس مشکل کو جس جذبے کی کارفرمائی آسان کر دیتی ہے وہ یہی جذبہ ہے جو کچوکے دیتا ہے اور آخر آدمی کو اٹھا کھڑا کرتا ہے۔ بقول اقبال:

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمہیں پیاری ہے
طبعِ آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے
تمہیں کہہ دو یہی آئینِ وفاداری ہے

چنانچہ یہ نماز جب عبدیت کے ساتھ ساتھ محبت کی صورت اختیار کر جاتی ہے تو پھر یہ ایک مومن کی معراج بھی ہے اور پریشانی اور مصیبتوں میں سب سے بڑا سہارا بھی۔ اور حق و باطل کے معرکوں میں قوت کا سامان بھی۔ میدان بدر میں آنحضرت ﷺ کی نماز جہاں اللہ تعالیٰ سے بے پناہ عشق و محبت کا مظہر ہے وہیں عزم و استقلال کی آئینہ دار بھی ہے۔ عین سولی کے سامنے حضرت خیبب رضی اله عنہ کی نماز قوت و شوکت کا ایسا اظہار تھی جس نے مشرکین مکہ میں بہت سے افراد کو سراسیمہ کر دیا تھا اور حجاج بن یوسف کے ظلم و جبروت کے سامنے حضرت سعید بن جبیر کی نماز ایک ایسا اعلان حق اور جبر و استبداد کے سر پر ایک ایسی کاری ضرب تھی جس نے حجاج جیسے پر ہیبت آدمی کو ہلا کر رکھ دیا تھا کہ پھر اس کے بعد وہ کسی اور پر ظلم کرنے کا موقعہ نہ پاسکا۔

یہ تو خیر القرون کی باتیں ہیں مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نماز کی اہمیت افادیت اور قوت و طاقت نے ہر دور میں جب بھی اسے کامل شعور و احتساب کے ساتھ اختیار کیا گیا ضرور اپنا اظہار کیا ہے۔ مغلیہ خاندان میں اورنگ زیب عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ ایک ایسے ہی درویش صفت حکمران تھے جنہوں نے نماز کی حقیقت کو اپنا شعار بنایا تھا ان کی نماز ان کی عادت نہ تھی بلکہ کامل فدویت و

عبودیت اور اللہ سے بے پناہ محبت اور اسی پر توکل کی آئینہ دار تھی۔ گولکنڈہ کے محاصرے کے دوران جبکہ ان کی فوجیں اس قلعہ کو سر کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھیں یہ کٹھن کام ان کی نماز نے کر دکھایا' عین حالت جنگ میں بادشاہ نے نماز کی ادائیگی کا حکم دیا۔ صفیں ایستادہ ہوگئیں امام نے آگے بڑھ کر اللہ اکبر کہا۔ تو قلعے کی فصیل سے فائر ہوا۔ امام صاحب ڈھیر ہوگئے ایک دوسرے صاحب نے آگے بڑھ کر امامت کا منصب سنبھالا تو انہیں بھی نشانہ بنایا گیا۔ دو لاشیں پڑی تھیں اب کسی اور نے آگے مصلے پر کھڑے ہونے کی جرات نہ کی۔ دشمن مطمئن تھا کہ اب اور کوئی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ لیکن دشمن کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بادشاہ خود آگے بڑھا اور جماعت کی امامت شروع کر دی۔ تاناشاہ نے جب فصیل سے یہ منظر دیکھا تو بے ساختہ مرعوب ہوکر چلایا۔ خبردار فائر نہ کرنا یہ بادشاہ نہیں دیوتا ہے۔ اور ساتھ ہی اس نے قلعے کے دروازے کھولنے کا حکم دے دیا۔

آپ نے غور فرمایا کہ نماز کس طرح ایک آدمی میں بندگی و عاجزی اور اللہ کی عظمت و کبریائی کا شعور پیدا کرتی ہے اور پھر یہ خدا شناسی و خود شناسی کا جذبہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے بے پناہ محبت و عشق اور اپنی ذات کو اس کے لیے اور اس کے راستے میں فنا کر دینے کے جذبے میں ڈھل جاتا ہے۔ جو بالآخر ایک طاقت و قوت کی نمود بن کر ہر باطل سے اس طرح ٹکرا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اس کی پشت پر ہوتی ہے اور غیبی قوتیں اس کے ہم رکاب ہوتی ہیں مگر یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہوتا ہے جب تعمیر سیرت کا یہ عمل انفرادی دائرے سے نکل کر اجتماعی دائرے میں داخل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کشتی لکڑی کے تختوں سے تیار ہوتی ہے اور دیوار اینٹوں سے بنتی ہے اور یہ دیوار اور کشتی اس وقت تک کارآمد اور پائیدار ہے جب تک اس کے تختے پھٹنے ٹوٹنے اور دیمک لگنے سے محفوظ ہیں اور اینٹیں اچھی طرح پکی ہوئی اور پختہ ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اینٹیں دیوار میں اچھی طرح چنی گئی ہوں اور تختے اچھی طرح ایک دوسرے سے پیوست ہوں۔

یہی حال افراد انسانی کا ہے۔ قافلہ انسانیت کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ہر فرد خیر و صلاح کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو اور اس کی ذات میں کوئی سی کجی نہ ہو کیونکہ:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارہ

مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی انتہائی لازمی ہے کہ افراد کے درمیان گہرا ربط و ضبط ہو باہمی ہمدردی و خیر خواہی کا جذبہ موجزن ہو۔ برابری اور مساوات ان کا شعار ہو۔ ایک ہی فکر اور اس کے لیے گہری دلسوزی ان کی پہچان ہو یہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف اور ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے ہوں یعنی ان کے درمیان ایک ایسی اجتماعیت قائم ہو جس سے یہ ایک خاندان اور ایک قبیلہ کی شکل اختیار کرلیں کیونکہ:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

مزید یہ بات بھی کہ انہیں انسانی معاشرے میں خلافت و نیابت الٰہی کا فریضہ انجام دینا ہے اور زمین سے غلط نظام کو ختم کرکے صحیح اور عادلانہ نظام قائم کرنا ہے۔ یہ کام ظاہر ہے ایک ایک فرد تنہا تو انجام نہیں دے سکتا جبکہ زمین پر غلط نظام سے وابستہ انسانوں کے جتھے موجود ہیں جو نظام جاہلیت کو بچانے میں اپنا پورا زور صرف کریں گے۔ بنابریں ضروری ہے کہ نظامِ جاہلی اور اس کے پرستاروں کے مقابلے میں جو لوگ اٹھیں وہ صرف صالح سیرت و کردار کی انفرادی قوت ہی نہ رکھتے ہوں بلکہ ان میں گہری اجتماعیت بھی قائم ہو اور وہ اجتماعی شوکت و ہیبت کے صورت گر اور نمائندہ بھی ہوں۔ چنانچہ نماز یہ دونوں ضرورتیں بدرجۂ کمال انجام دیتی ہے وہ مسلمانوں میں اگر ایک طرف انفرادی طور پر صالح سیرت و کردار پیدا کرتی ہے جس کی تفصیل آپ پڑھ چکے تو ساتھ ہی وہ ان میں حقیقی اجتماعیت بھی پیدا کرتی ہے۔ وہ صرف انفرادی نماز کا حکم نہیں دیتی بلکہ نماز کو باجماعت ادا کرنے کی تاکید کرتی ہے۔ تاکہ مسلمان اذان

کی آواز پر بہ یک وقت مسجد کا رخ کر کے اجتماعی طور پر ایک ہی وقت میں احکام کی اطاعت کی خو پیدا کریں اور وہاں پہنچ کر ایک امام کی قیادت میں صفیں باندھ کر مقررہ اوقات میں ایک جیسی تسبیحات کے ساتھ اور ایک ساتھ مل کر ایک ہی امام کی ہدایات کے تحت ایک جیسی حرکات و سکنات رو بہ عمل لائیں اور اس طرح اللہ کی فوج کی شکل اختیار کریں جو صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے اس کے احکام کے مطابق وقت مقررہ پر پانچ وقت شب و روز میں اندھیرے اجالے میں ایک ہی اعلان (اذان) پر حرکت میں آجاتی ہے۔ اس حال میں کہ صرف جسم ہی حرکت میں نہیں آتے بلکہ دل و دماغ اور جسم و جان ایک ہی ارادۂ و نیت کے ساتھ ایک ہی خوشنودی کے حصول کے لیے سراپا اضطراب ہوتے ہیں اور پھر یہ تمام لوگ جو مسجدوں میں جمع ہوتے ہیں یہ مختلف برادریوں مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں ان میں شاہ بھی ہیں اور گدا بھی۔ امراء بھی ہیں فقراء بھی، گورے بھی ہیں کالے بھی، بڑے بھی ہیں چھوٹے بھی مگر اس وقت:

؎ ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندۂ صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری درگاہ میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اب یہ صرف ایک ہی خاندان کے افراد اور ایک ہی اجتماعیت کے ارکان ہیں۔ جن میں کامل مساوات ہے جن کی فکر ایک ہے جن کی دعائیں یکساں ہیں جن کے جذبات مشترک ہیں۔ جن کا نظریہ و نظام واحد ہے جن میں اقتداء و امامت کے تصورات ہم آہنگ ہیں۔ جن میں اجتماعی ذہنیت کارفرما ہے جن کے درمیان محبت ہمدردی تعاون وحدت روح اور وحدت عمل ہے۔ یہ سب کچھ ان میں شعوری نماز نے پیدا کیا ہے یعنی یہ اقامتِ صلوۃ کا نتیجہ ہے اسی لیے اس کو دین اسلام کا ستون قرار دیا گیا ہے۔ یہ ستون اگر منہدم ہو جائے تو مسلمانوں کی انفرادی سیرت اور اجتماعی ہیئت دونوں مسخ ہو کر رہ جائیں

اور وہ اس مقصد عظیم کے لیے کام کرنے کے اہل ہی نہ رہیں جس کی خاطر انہیں اٹھایا گیا ہے اسی بنا پر فرمایا گیا۔ "الصلوۃ عماد الدین من اقامھا فقد اقام الدین و من ھدمھا فقد ھدم الدین"

اب ہم چند ان مسائل کا ذکر کرتے ہیں جن پر نماز کے صحیح ہونے کا دارومدار ہے یا جن سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ رہی سنتیں اور مستحبات اور مکروہاتِ نماز اس کی تفصیل آپ فقہ کی کسی کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔

## نماز کے فرائض

نماز صحیح ہونے کے لیے چودہ چیزیں ایسی ضروری ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی رہ جائے تو نماز نہ ہوگی ان چودہ چیزوں کو نماز کے فرائض کہتے ہیں۔ ان میں سات چیزیں تو نماز سے پہلے فرض اور ضروری ہیں ان کو شرائط نماز کہتے ہیں اور سات چیزیں نماز کے اندر فرض اور ضروری ہیں ان کو ارکان نماز کہتے ہیں۔

### شرائطِ نماز :

شرائطِ نماز سات ہیں۔ اگر نماز سے پہلے ان میں سے کوئی ایک شرط بھی رہ گئی تو نماز نہ ہوگی۔

### 1- بدن پاک ہونا :

یعنی بدن پر اگر کوئی حقیقی نجاست لگی ہو تو اس کو بھی شرعی ہدایت کے مطابق دور کیا جائے اور اگر وضو کی ضرورت ہو تو وضو کرلیا جائے اور غسل کی حاجت ہو تو غسل کرلیا جائے۔ اگر بدن نجاست حقیقی اور حکمی دونوں سے پاک نہ ہوگا تو نماز نہ ہوگی۔

### 2- لباس کا پاک ہونا :

یعنی جو کپڑے وغیرہ پہن کر یا اوڑھ کر نماز پڑھے ان سب کا پاک ہونا ضروری ہے قمیض، پائجامہ، عمامہ، ٹوپی، کوٹ، شیروانی، چادر، کمبل، موزے، دستانے، غرض نمازی کے جسم پر جو بھی لباس ہو اس کا پاک ہونا ضروری ہے

ورنہ نماز نہ ہوگی۔

### 3- نماز کی جگہ کا پاک ہونا :

یعنی نماز پڑھنے والے کے دونوں قدموں اور گھٹنوں اور ہاتھوں اور سجدے کی جگہ کا پاک ہونا ضروری ہے چاہے یہ خالی زمین ہو یا زمین پر کوئی فرش، چٹائی اور مصلے وغیرہ بچھایا گیا ہو، ——— اگرچہ نماز صحیح ہونے کے لیے تو صرف اتنی ہی جگہ کا پاک ہونا ضروری اور شرط ہے لیکن ایسی جگہ پر بھی نماز پڑھنا اچھا نہیں ہے جو پاک ہو لیکن اس کے قریب ہی غلاظت ہو اور سخت تعفن پھیل رہا ہو۔

### ستر چھپانا :

یعنی جسم کے ان حصوں کو چھپانا جن کا چھپانا مرد اور عورت کے لیے فرض ہے۔ مرد کے لیے ناف سے لے کر گھٹنے تک چھپانا فرض ہے اور عورت کے لیے ہتھیلی، پاؤں اور چہرے کے علاوہ پورے جسم کا چھپانا فرض ہے البتہ پاؤں کھلنے میں اس کا لحاظ رہے کہ ٹخنے نہ کھلنے پائیں اس لیے کہ عورت کے لیے ٹخنوں کا چھپانا ضروری ہے۔

### 5- نماز کا وقت ہونا :

یعنی جس نماز کے لیے جو وقت مقرر ہے اس وقت کے اندر نماز پڑھی جائے، وقت آنے سے پہلے نماز پڑھی جائے گی تو نماز بالکل نہ ہوگی اور وقت نکلنے کے بعد پڑھی جائے گی تو نماز قضا ہوگی، ادا نہ ہوگی۔

### 6- استقبالِ قبلہ :

یعنی قبلے کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنا، اگر کسی واقعی معذوری اور مجبوری کے بغیر کوئی شخص قبلے کے علاوہ کسی دوسری جانب رخ کرکے نماز پڑھے گا تو نماز نہ ہوگی۔

### 7- نیت کرنا :

یعنی دل میں خاص اس فرض نماز کا ارادہ کرنا جو پڑھنا ہو اور اگر کسی وقت کی قضا نماز پڑھنا ہو تو یہ ارادہ کرنا کہ فلاں دن اور فلاں وقت کی نماز پڑھتا ہوں البتہ نفل اور سنت کے لیے یہی نیت کافی ہے کہ سنت یا نفل نماز پڑھتا ہوں، دل کے ارادے کا اظہار کرنے کے لیے زبان سے بھی نیت دھرانا اچھا ہے لیکن ضروری نہیں۔ اگر امام کے پیچھے نماز پڑھنا ہو تو اس کی نیت کرنا بھی ضروری ہے۔

### ارکانِ نماز :

نماز کے اندر جو چیزیں فرض ہیں ان کو ارکانِ نماز کہتے ہیں۔ ارکان نماز سات ہیں۔

### 1- تکبیرِ تحریمہ :

یعنی نماز شروع کرتے وقت اللہ اکبر یا اس کے ہم معنی مثلاً اللہ اعظم یا اللہ اعلیٰ وغیرہ ایسا جملہ کہنا جس سے خدا کی عظمت اور بڑائی کا اظہار ہوتا ہو، کسی اور مفہوم مثلاً" دعا اور استغفار کا اظہار نہ ہوتا ہو۔ اس تکبیر کے بعد چلنا پھرنا، کھانا پینا، اور بات چیت کرنا وغیرہ سب کچھ حرام ہو جاتا ہے اس لیے اس کو تکبیر تحریمہ کہتے ہیں۔

### 2- قیام :

یعنی نماز میں سیدھا کھڑا ہونا، نماز میں اتنی دیر کھڑا ہونا فرض ہے جتنی دیر میں اس قدر قرآن کی قراٴت ہو سکے۔ جو فرض ہے، یہ واضح رہے کہ قیام صرف فرض اور واجب نمازوں میں فرض ہے، نفل نمازوں میں قیام فرض نہیں ہے۔

### 3- قراُت :

یعنی نماز میں کم از کم ایک آیت پڑھنا، خواہ آیت بڑی ہو یا چھوٹی مگر یہ ضروری ہے کہ وہ آیت دو لفظوں سے مرکب ہو، جیسے اللہ الصمد اور اگر آیت میں ایک ہی لفظ ہو جیسے ص، ق، مدھامتان، تو فرض ادا نہ ہو گا۔

فرض نمازوں کی صرف دو رکعتوں میں قرأت فرض ہے، چاہے پہلی دو رکعتوں میں قرأت ہو یا آخری دو میں یا درمیانی دو میں یا پہلی اور آخری میں ہر صورت میں فرض ادا ہو جائے گا اور نفل، وتر اور سنت کی ساری رکعتوں میں قرات فرض ہے۔

### 4- رکوع :

ہر رکعت میں ایک مرتبہ رکوع کرنا فرض ہے، رکوع سے مراد یہ ہے کہ آدمی اس قدر جھک جائے کہ ہاتھ گھٹنوں تک پہنچ جائیں۔

### 5- سجدہ :

ہر رکعت میں دو سجدے کرنا فرض ہیں۔

### 6- قعدہ اخیرہ :

یعنی نماز کی آخری رکعت میں اتنی دیر بیٹھنا جتنی دیر، "التحیات للّٰہ" سے عبدہ و رسولہ، تک پڑھا جاسکے۔

### 7- اختیاری فعل سے نماز کو ختم کرنا :

یعنی نماز کے سارے ارکان ادا کرنے سے بعد کوئی ایسا فعل کیا جائے جو نماز کے منافی ہو اور جس سے نماز ختم ہو جائے۔

### واجباتِ نماز :

واجباتِ نماز سے وہ ضروری باتیں مراد ہیں جن کا ادا کرنا نماز میں ضروری ہے اگر ان میں سے کوئی چیز بھولے سے چھوٹ جائے تو سجدہ سہو کرلینے

سے نماز درست ہو جاتی ہے اور اگر بھولے سے کوئی چیز چھوٹنے کے بعد سجدہ سہو نہ کیا جائے یا قصداً کوئی چیز چھوڑ دی جائے تو نماز کا لوٹانا واجب ہوتا ہے۔

واجبات نماز چودہ ہیں۔

-1 فرض نمازوں کی پہلی دو رکعتوں میں قرات کرنا۔

-2 فرض نمازوں کی پہلی دو رکعتوں میں اور باقی نمازوں کی ساری رکعتوں میں سورہ فاتحہ پڑھنا۔

-3 سورہ فاتحہ پڑھنے کے بعد فرض نمازوں کی پہلی دو رکعتوں میں اور واجب سنت اور نفل نمازوں کی تمام رکعتوں میں کوئی دوسری سورت پڑھنا، چاہے پوری سورت پڑھے یا ایک بڑی آیت پڑھے یا تین چھوٹی آیتیں پڑھے۔

-4 سورہ فاتحہ کو دوسری سورت سے پہلے پڑھنا، اگر کوئی شخص پہلے دوسری سورت پڑھ کر بعد میں سورہ فاتحہ پڑھے تو واجب ادا نہ ہوگا۔

-5 قرات، رکوع اور سجدوں اور رکعتوں میں ترتیب قائم رکھنا۔

-6 قومہ کرنا، یعنی رکوع سے اٹھ کر سیدھا کھڑا ہونا۔

-7 جلسہ کرنا یعنی دونوں سجدوں کے درمیان بہ اطمینان سیدھا بیٹھ جانا۔

-8 تعدیل ارکان یعنی رکوع اور سجدے کو پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ اچھی طرح ادا کرنا۔

-9 قعدہ اولی یعنی تین اور چار رکعات والی نمازوں میں دو رکعات کے بعد ”التحیات“ پڑھنے کی مقدار بیٹھنا۔

-10 دونوں قعدوں میں ایک بار ”التحیات“ پڑھنا۔

-11 امام کو فجر کی دونوں رکعتوں میں، مغرب اور عشاء کی پہلی دو رکعتوں میں جمعہ اور عیدین میں، تراویح اور رمضان کے مہینے میں وتروں میں بلند آواز سے قرأت کرنا اور ظہر اور عصر اور مغرب اور عشاء کی آخری رکعتوں میں آہستہ آواز سے قرأت کرنا۔

-12 نمازوں کو "السلام علیکم" کے الفاظ کے ساتھ ختم کرنا۔

-13 نماز وتر میں قنوت کے لیے تکبیر کہنا اور دعائے قنوت پڑھنا۔

-14 دونوں عیدوں کی نماز میں زائد تکبیریں کہنا۔

## مفسدات نماز :

مفسدات نماز سے وہ چیز مراد ہیں جن سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اور نماز کا دوبارہ پڑھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ مفسدات نماز پندرہ ہیں، نماز کی حفاظت کے لیے ان کا یاد کرنا ضروری ہے۔

-1 نماز میں گفتگو کرنا، تھوڑی سی گفتگو کی جائے یا زیادہ ہر حال میں نماز فاسد ہو جائے گی اور نماز کو لوٹانا ضروری ہوگا، گفتگو کرنے کی پانچ صورتیں ہو سکتی ہیں۔

پہلی صورت: کسی آدمی سے خود بات کی جائے یا اس کی بات کا جواب دیا جائے، چاہے اپنی زبان میں بات کی جائے یا عربی زبان میں، یا خود قرآن پاک کے الفاظ میں، ہر صورت میں نماز فاسد ہو جائے گی۔ مثلاً:
یحیٰی نامی شخص سے قرآن کے الفاظ میں کہا یا یحییٰ خذ الکتاب
یا کسی خاتون سے کہا یمریم اقنتی لربک واسجدی وارکعی مع الراکعین یا کسی جانے والے سے قرآن کے الفاظ میں پوچھا فاین تذھبون یا کسی کو حکم دیا، اقرا کتابک
یا کسی سے رنج و غم کی خبر سن کر انا للّٰہ و انا الیہ راجعون پڑھ دیا۔ یا کسی کی چھینک سنی اور یرحمک اللّٰہ کہہ دیا۔
یا کوئی تعجب کی بات سنی اور سبحان اللّٰہ کہہ دیا۔
یا کوئی خوشی کی خبر سنی اور الحمد للّٰہ کہہ دیا۔
یا کسی پر نظر پڑی کہ وہ کوئی نازیبا بات کہہ رہا ہے یا کوئی بیہودہ حرکت کر رہا ہے اور کہہ دیا اللّٰہ یھدیک
یا کسی کو سلام کیا، یا سلام کرنے والے کا جواب دیا۔

یا نماز کے باہر کسی نے دعا مانگی اور دعا سن کر "آمین" کہا۔
یا اللہ کا نام سن کر جل جلالہ کہا۔
یا نبی ﷺ کا نام سنا اور درود شریف پڑھ لی۔
یا کسی خاتون نے بچے کو گرتے دیکھا اور بسم اللہ کہہ دیا۔

غرض یہ کہ کسی طرح بھی اگر کسی شخص سے گفتگو کرلی یا اس کی کسی حرکت یا بات پر متوجہ ہو کر کوئی جواب دے دیا، تو نماز ٹوٹ جائے گی اور دوبارہ پڑھنی ہو گی۔

دوسری صورت: کسی جانور سے متوجہ ہو کر کچھ کہہ دیا مثلاً نماز پڑھنے میں نظر پڑی کہ مرغی یا بلی کھانے کی چیز میں منہ ڈال رہی ہے اور اس کو ڈانٹنے اور بھگانے کے لیے کچھ کہہ دیا، اس صورت میں بھی نماز فاسد ہو جائے گی۔

تیسری صورت: خود اپنے طور پر زبان سے کچھ کلمات کہہ دینا۔ چاہے اپنی زبان میں کچھ کہے یا عربی زبان میں کہے بہرحال نماز ٹوٹ جائے گی۔ ہاں اگر کوئی ایسا کلمہ یا کلمات کہے جو قرآن مجید میں موجود ہیں تو نماز فاسد نہ ہو گی اور اگر وہ کلمہ اس شخص کا تکیہ کلام ہو تو قرآن کا لفظ ہونے کے باوجود نماز فاسد ہو جائے گی مثلاً کسی کا تکیہ کلام "نعم" ہے تو اگرچہ یہ لفظ قرآن میں موجود ہے پھر بھی نماز ٹوٹ جائے گی۔

چوتھی صورت: دعا اور ذکر کرنا، دعا اور ذکر چاہے اپنی زبان میں ہو یا عربی زبان میں ہر حال میں نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر قرآن و حدیث میں آئی ہوئی دعاؤں یا اذکار میں سے کوئی دعا بے موقع مانگی یا بے موقع ذکر کیا تو نماز فاسد نہ ہو گی اور اس چیز کی دعا سے بھی نماز فاسد ہو جائے گی جو انسانوں سے بھی مانگی جا سکتی ہے، چاہے عربی زبان میں مانگے۔

پانچویں صورت: کوئی شخص حالت نماز میں کسی دوسرے شخص کو جو قرآن غلط پڑھا رہا ہے لقمہ دے دے، چاہے یہ شخص نماز پڑھ رہا ہو یا

نماز سے باہر تلاوت کر رہا ہو، نماز فاسد ہو جائے گی ہاں اگر غلط پڑھنے والا خود اس شخص کا امام ہو تو لقمہ دینے سے نماز فاسد نہ ہوگی اور اگر مقتدی قرآن میں دیکھ کر لقمہ دے یا دوسرے شخص سے صحیح سن کر اپنے امام کو لقمہ دے تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر امام لقمہ لے لے تو امام کی نماز بھی فاسد ہو جائے گی۔

-2 حالت نماز میں قرآن پاک دیکھ کر تلاوت کرنا، اس سے بھی نماز ٹوٹ جاتی ہے۔

-3 شرائط نماز میں کوئی شرط ختم ہو جائے چاہے وہ نماز کی صحت کی شرط ہو یا نماز کے وجوب کی، بہرحال نماز ٹوٹ جائے گی۔ مثلاً طہارت باقی نہ رہے، وضو ٹوٹ جائے یا غسل کی حاجت ہو جائے، یا حیض کا خون آجائے، یا کپڑے نجس ہو جائیں، یا جائے نماز نجس ہو جائے یا کسی عذر اور مجبوری کے بغیر کوئی قبلے سے منہ پھیر لے، یا ستر کھل جائے اور اتنی دیر کھلا رہے جتنی دیر میں رکوع یا سجدہ کیا جاسکے، یا کسی وجہ سے ہوش و حواس جاتے رہیں۔ یا دیوانگی اور بے ہوشی کا دورہ پڑ جائے یا کسی وجہ سے آدمی مدہوش ہو جائے غرضیکہ اگر کوئی ایک شرط بھی ختم ہو گئی تو نماز فاسد ہو جائے گی۔

-4 فرائض نماز میں سے کوئی فرض چھوٹ جائے، چاہے بھولے سے چھوٹ جائے یا قصداً" کوئی ترک کر دے، مثلاً قیام نہیں کیا یا رکوع اور سجدہ چھوڑ دیا یا قرات بالکل ہی نہ کی، خواہ سہواً" ایسا ہو جائے یا قصد ایسا ہو ہر حال میں نماز دوبارہ پڑھنا ضروری ہے۔

-5 واجبات نماز میں سے کوئی ایک یا سب قصداً" چھوڑ دینا۔

-6 واجبات نماز بھولے سے چھوٹ گئے لیکن سجدہ سہو نہیں کیا تب بھی نماز لوٹانا ضروری ہے۔

-7 کسی عذر اور صحیح ضرورت کے بغیر کھانسنا، ہاں اگر کسی بیماری کی وجہ سے بے اختیار کھانسی آجائے یا کوئی حلق صاف کرنے کے لیے

کھانسے، یا مقتدی اس لئے کھانس دے کہ امام اپنی غلطی سمجھ لے، یا کوئی اس لیے کھانسے کہ لوگ سمجھ لیں کہ وہ نماز پڑھ رہا ہے تو ان صورتوں میں نماز فاسد نہ ہوگی اور اگر اس طرح کی کسی صحیح ضرورت اور معذوری کے بغیر کوئی کھانسے تو نماز ٹوٹ جائے گی۔

8- کسی رنج و غم یا تکلیف و درد یا شدید مصیبت میں آہ و بکا کرنا، یا اف، اوہ اینہ، یا کوئی اور درد انگیز آواز نکالنا، اس سے بھی نماز ٹوٹ جائے گی۔ البتہ بے اختیاری میں کبھی کوئی آواز نکل گئی یا خوفِ خدا سے لرز کر یا قبر و حشر کی سختی کا تصور کر کے یا جہنم کی ہولناکی کو یاد کر کے اگر کوئی رو پڑے یا قرآن کی تلاوت سے شدید متاثر ہو کر کوئی رونے لگے یا آہ نکل جائے تو ان صورتوں میں نماز فاسد نہ ہوگی۔

9- نماز کی حالت میں قصداً" یا بھولے سے کچھ کھا پی لے، مثلاً جیب میں کوئی کھانے کی چیز رکھی تھی بے خیالی میں نکال کر کھالی یا جانتے بوجھتے کھالی ہر حال میں نماز فاسد ہو جائے گی ہاں اگر کبھی دانتوں میں سے کوئی معمولی سا ریزہ جو چنے کے دانے سے کم ہو نکلا اور نمازی نے نگل لیا تو اس سے نماز فاسد نہ ہوگی۔

10- کسی عذر کے بغیر نماز میں، چند قدم چلنا پھرنا اس سے بھی نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

11- عمل کثیر کرنا، یعنی کوئی ایسا کام کرنا جس کو دیکھ کر دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ یہ شخص نماز نہیں پڑھ رہا ہے مثلاً کوئی دونوں ہاتھوں سے کپڑے درست کرنے لگے، یا کوئی خاتون نماز میں چوٹی باندھنے لگے یا نماز کی حالت میں بچے نے دودھ پی لیا تو ان صورتوں میں نماز ٹوٹ جائے گی۔

12- قرآن پاک کی تلاوت میں کوئی بڑی غلطی کرنا، جس سے معنی بدل جائیں یا تکبیر میں کسی نے اللہ کے الف کو کھینچ کر پڑھ دیا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔

13- بالغ آدمی کا قہقہہ مار کر یا آواز سے ہنسنا۔

14- کسی دیوار پر کچھ لکھا تھا' یا کوئی پوسٹر لگا تھا' یا کسی خط پر نظر پڑی اور زبان سے پڑھ لیا تو نماز ٹوٹ جائے گی ہاں اگر زبان سے پڑھے بغیر مطلب سمجھ لیا تو نماز فاسد نہ ہوگی۔

15- عورت کا مرد کے برابر کھڑے ہونا' بشرطیکہ وہ اتنی دیر کھڑی رہے جتنی دیر میں ایک سجدہ یا رکوع کیا جاتا ہے تو نماز ٹوٹ جائے گی۔ ہاں اگر کوئی ایسی کم سن لڑکی کھڑی ہو جائے جس کی طرف رغبت نہ ہوتی ہو' یا عورت ہی کھڑی ہو جائے لیکن درمیان میں پردہ حائل ہو تو نماز فاسد نہ ہوگی۔

# زکوٰۃ کا تعارف اور اس کی حقیقت

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
”فَاِنْ تَابُوا وَاَقَامُو الصَّلٰوۃَ وٰاتُوالزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُم فِی الدِّیْنِ“
لیکن اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز کے پابند ہو جائیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ تمہارے بھائی ہو جائیں گے دین میں۔

محترم خواتین و حضرات!

ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن زکوٰۃ ہے قرآن و سنت میں جابجا اس کی فرضیت کا ذکر آیا ہے۔ قرآن کریم میں 82 مقامات پر نماز کے ساتھ اسے ذکر فرمایا گیا ہے۔ مسلمانوں کے جہاں جہاں اوصاف بیان کئے گئے ہیں وہاں بھی یقیمون الصلوۃ ویوتون الزکوۃ یعنی نماز اور زکوٰۃ کو ایک ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ اسلام کی صحت و قبولیت کے لیے نماز اور زکوٰۃ ہی کو بطور شرط اور علامت کے ذکر فرمایا۔ ارشاد ہوا:

فَاِنْ تَابُوا وَاَقَامُو الصَّلٰوۃَ وٰاتُوالزَّکٰوۃَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَھُم اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرُ الرَّحِیْم پھر اگر یہ توبہ کرلیں اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو بیشک اللہ بڑا مغفرت والا بڑا رحمت والا ہے۔

اسی طرح اہل شرک و کفر کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ صلح اور مسلمانوں کے ساتھ اخوت کی علامت بھی نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کو ٹھہرایا گیا۔ فرمایا فان تابوا واقاموا الصلوۃ و آتوالزکوۃ فاخوانکم فی الدین لیکن اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز کے پابند ہو جائیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ دین میں تمہارے

بھائی ہو جائیں گے۔

رسول ﷺ نے زکوٰۃ کو اسلام کے بنیادی ارکان میں شمار فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں نماز قائم کرنا زکوٰۃ دینا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

آپ سے پوچھا گیا اسلام کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا۔ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ فرض نماز قائم کرو زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو۔

ضمام بن ثعلبہ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ میں اللہ کی قسم دلا کر آپ سے پوچھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے اغنیاء سے زکوٰۃ حاصل کریں اور فقراء میں تقسیم کر دیں آپ نے فرمایا کہ ہاں بالکل۔

بخاری و مسلم حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ گواہی دیں اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد ﷺ اس کے رسول ہیں نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو اپنے خون اور اپنے مالوں کو مجھ سے محفوظ کر لیتے ہیں سوائے اسلام کے حق کے اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔

زکوٰۃ کی اہمیت کا اس سے اندازہ فرمائیے کہ اس کے بغیر نہ اسلام مکمل ہوتا ہے نہ نماز ہوتی ہے اور نہ کوئی عمل نفع دیتا ہے۔ آنحضرت ﷺ ارشاد فرماتے ہیں' اِنَّ مِنْ تَمامِ اِسلامِکُم اَن تَوْدُّوا زَکٰوۃ اموالِکم اپنے اسلام کو پورا کرنے میں یہ بھی ہے کہ تم اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں۔

وَمَنْ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَلَمْ یُؤَدِّ الزَّکٰوۃَ فَلَیْسَ بِمُسْلِمٍ یَنْفَعُہٗ عَمَلُہٗ

جو نماز پڑھے اور زکوٰۃ نہ دے تو وہ ایسا مسلمان نہیں کہ اس کا عمل اسے نفع

پہنچائے اس پر بس نہیں بلکہ ترکِ زکوٰۃ ایسا گناہ ہے جس کی وجہ سے بارشیں رک سکتی ہیں۔ آنحضرت کا ارشاد ہے:

"ولم یَمنَعُوا زکوٰۃ اموالھم الا مَنعُوا القطرَ مِن السّماءِ ولو لا البَھائم لَم یُمطَرُوا زکوٰۃ ادا نہ کرنے سے پانی آسمان سے روک دیا جاتا ہے اور اگر یہ جانور نہ ہوتے تو کبھی بھی بارش نہ ہوتی۔ یہ تو دنیا میں ہوگا آخرت میں اس نافرمانی کا جو انجام ہوگا اس کا اندازہ اس سے کیجئے۔ کہ معراج کے سفر میں آنحضرت نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا کہ ان کے آگے پیچھے دھجیاں لٹک رہی ہیں اور وہ جانوروں کی طرح تھوہر کانٹے اور دوزخ کے پتھر کھا رہے ہیں تو آپ نے دریافت فرمایا "من ھولاء یا جبریل قال ھولاء الذین لا یودون صدقات اموالھم" اے جبریل یہ کون لوگ ہیں انہوں نے جواب دیا یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تھے۔

قرآن کریم میں پروردگار ارشاد فرماتا ہے ترجمہ جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خبر دیجئے جس دن اس کو جہنم کی آگ میں گرم کرکے ان کی پیشانیوں پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغ دیئے جائیں گے اور ان سے یہ کہا جائے گا کہ یہ وہی خزانہ ہے جس کو تم لوگوں نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔ اب تم اس خزانے کے عذاب کو چکھو۔

حمزہ فرماتے ہیں (بخاری اور نسائی کی روایت ہے) کہ یہی مال گنجا سانپ بن کر اپنے مالک کا پیچھا کرے گا اور یہ مالک اس سے بھاگے گا یہاں تک کہ وہ سانپ اس کو پکڑ کر اس کا ہاتھ چبائے گا اور اس کے گلے کا طوق بن جائے گا اور اس کی باچھیں چیرتا ہوا کہے گا۔ انا مالک انا کنزک میں تیرا مال ہوں میں تیرا خزانہ ہوں۔ جس کو تو جمع کرتا تھا۔ جس طرح ترک زکوٰۃ پر دنیا اور آخرت میں عذاب الیم کی وعید اور اللہ کی نعمتوں اور برکتوں سے محرومی پر متنبہ کیا گیا ہے اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی پر دنیا و آخرت میں اس کے ثمرات و نتائج اجر و ثواب اور مال و دولت میں برکت کی بشارتیں بھی دی گئی ہیں اور

ہمیں آگاہ کیا گیا ہے کہ تم جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس میں اس طرح خیر و برکت عطا فرماتا ہے جس طرح وہ ایک ایک دانہ کو کھلیان میں اور ایک گٹھلی کو ثمر آور شجر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے مَثَلُ الَّذِین یَنفقونَ اموالھم فِی سَبیلِ اللّٰہ کَمَثَلِ حَبَّۃ انبَتَتْ سَبعَ سَنَابل فِی کُلِّ سُنبُلَۃٍ مِائَۃُ حَبَّۃ واللّٰہ یضَاعِفُ لِمَن یشاءُ واللّٰہ واسِعٌ علیم۔

ترجمہ جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی میں خرچ کرتے ہیں ان کے مال کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک دانہ ہے کہ اس سے سات بالیاں اگیں ہر ہر بالی کے اندر سو دانے ہوں۔ اللہ جسے چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے اللہ بڑا وسعت والا بڑا علم والا ہے۔

وما اتیتم من زکوۃ تریدون وجہ اللّٰہ فاؤلئک ھم المضعفون

ترجمہ: تم جو زکوٰۃ دو گے جس سے اللہ کی رضا طلب کرو گے تو ایسے ہی لوگ ہیں جو بڑھائے جائیں گے یہ بھی بتایا گیا کہ جو اللہ کی راہ میں صدقہ و خیرات کریں گے وہ اللہ کے یہاں اس کا بیش از بیش اجر بھی پائیں گے اور دنیا و آخرت میں خوف غم اور پریشانیوں سے محفوظ رہیں گے۔ ارشاد فرمایا گیا:

”اَلَّذِینَ یُنفِقُونَ اَموالھُم بِالَّیلِ وَالنَّھارِ سِرّاً
وَعَلانیۃً فَلَھُم اجرُھُم عِندَ رَبِّھِم لاَخوف علیھم ولاَ
ھُم یَحزَنُون

جو لوگ اپنا مال رات اور دن پوشیدہ اور آشکارا خرچ کرتے رہتے ہیں سو ان لوگوں کے لیے ان کے پروردگار کے پاس اجر ہے نہ ان کے لیے کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

”اِنَّ الَّذین آمَنوا وعَمِلُوا الصّالِحَات واَقاموا الصَّلوٰۃ
واٰتو الزکوۃ فلھم اَجرُھم عِندَ رَبِّھِم ولا خوف
علیھم ولا ھم یحزنون“

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے

> اور نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ ادا کی ان کے لیے ان کا اجر
> ان کے پروردگار کے پاس ہے نہ ان پر کوئی خوف ہو گا اور
> نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے بھی زکوٰۃ ادا کرنے والوں کو مختلف بشارتوں سے نوازا اور اس کو مال و اولاد اور دنیا و آخرت دونوں جگہ باعث برکت اور باعث نجات فرمایا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جب کوئی اپنے مال سے کچھ صدقہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے دائیں ہاتھ میں لے لیتا ہے اگر وہ صدقہ کھجور ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں بڑھتا رہتا ہے۔ اور اتنا بڑھ جاتا ہے کہ پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی اپنے بچھڑے یا بکری کے بچے کی پرورش کرتا ہے حضرت ابو ہریرہ سے ہی روایت ہے کہ آنحضرت نے فرمایا کہ ایک آدمی کھلے میدان میں جارہا تھا کہ اس نے بادل سے ایک آواز سنی کہ فلاں کے باغ کو سینچ دو۔ چنانچہ بادل اپنی جگہ سے ہٹا اور سب پانی ایک قطعہ زمین میں انڈیل دیا۔ وہاں ایک تالاب یا گہرائی تھی۔ جہاں سارا پانی بھر گیا۔ اس نے اس پانی کی طرف چلنا شروع کیا تو دیکھا کہ ایک آدمی کھڑا ہوا اس پانی سے اپنے کھیت کو سینچ رہا ہے۔ اس نے پوچھا اللہ کے بندے تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے وہی نام بتایا جو اس نے بادل سے سنا تھا۔ اس نے پوچھا اللہ کے بندے تم نے ہمارا نام کیوں پوچھا؟ اس نے کہا میں نے اس بادل میں جس کا یہ پانی ہے اس نام کے ساتھ ایک آواز سنی کہ فلاں کے باغ کو سینچ آو۔ اب مجھے بتاؤ کہ تم اس کھیت میں کیا کرتے ہو؟ اس نے کہا اب جبکہ تم پوچھ ہی رہے ہو تو سنو میں اس کی پیداوار کا ایک تہائی حصہ صدقہ کر دیتا ہوں اور ایک تہائی سے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی پرورش کرتا ہوں اور ایک تہائی دوبارہ اسی میں لگا دیتا ہوں۔ (صحیح مسلم)

رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”صدقہ کی وجہ سے آدمی کا مال کبھی کم نہیں ہوتا اور معاف کرنے سے اللہ تعالیٰ بندے کو عزت ہی عطا فرماتا ہے اور

جب کوئی اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع سے کام لیتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ بلند کرتا ہے۔" (مسلم ترمذی)

ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ "کوئی صبح بندوں پر ایسی نہیں گذرتی کہ دو فرشتے نہ اترتے ہوں جن میں ایک یہ کہتا ہے کہ اے اللہ خرچ کرنے والے کو اس کا بدل عطا فرما اور دوسرا یہ کہتا ہے کہ بخیل کے مال کو تلف کر دے۔" (شیخین)

زکوٰۃ کی اہمیت اور انسانی فلاح و بقا اور مسلمان معاشرے کی خوشحالی و فارغ البالی کے حوالے سے اس کی ضرورت و افادیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ زکوٰۃ صرف مسلمانوں پر ہی فرض نہیں کی گئی بلکہ پہلی امتوں کو بھی اس کا حکم دیا گیا اور ہر امت پر نماز اور زکوٰۃ کی پابندی لازم ٹھہرائی گئی۔

قرآن کریم میں ان تمام انبیاء و رسل کے حوالہ سے (جو عربوں میں معلوم و معروف تھے) ہمیں بتایا گیا ہے کہ ان تمام پر نماز اور زکوٰۃ کو فرض ٹھہرایا گیا تھا۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام جو ابوالانبیاء کہلاتے ہیں اور آج کے تینوں آسمانی مذاہب یعنی یہودیت عیسائیت اور اسلام انہیں اپنا بزرگ مانتے اور اپنا انتساب انہیں کی طرف کرتے ہیں اور مشرکین عرب انہیں ہی اپنا مورث اعلیٰ سمجھتے اور ان کی پیروی کا ادعا رکھتے تھے۔ ان کا اور ان کی نسل کے انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کریم کہتا ہے:

> "وَجعلناھُم آئمۃً یّھدُونَ بامرنا واوحَینا الیھم فعلَ الخَیراتِ وَ اِقَامَ الصَّلوٰۃِ وَ ایتاءِ الزَّکوٰۃ وکانوا لناعابدین"
>
> ہم نے ان کو انسانوں کا پیشوا بنایا وہ ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی راہنمائی کرتے تھے۔ ہم نے وحی کے ذریعہ ان کو نیک کام کرنے اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی تعلیم دی اور وہ ہمارے عبادت گذار تھے۔

حضرت اسماعیل علیہ اسلام کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

"وکان یامر اھلہ بالصلوۃ والزکوۃ وکان عند ربہ مرضیا وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور وہ اللہ کے نزدیک برگزیدہ تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی اور خیر و برکت کی دعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے زکوٰۃ کے ساتھ مشروط فرمایا۔ قرآن مجید میں ہے:

"قال عذابی اصیب بہ من اشاء و رحمتی وسعت کل شئی فساکتبھا للذین یتقون و یوتون الزکوۃ والذین ھم بایاتنا یومنون"

کہا میں اپنے عذاب میں جسے چاہوں گا گھیر لوں گا اگرچہ میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے مگر اس رحمت کو میں انہیں لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو مجھ سے ڈریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔

بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے پروردگار فرماتے ہیں:

لَئِنۡ اَقَمۡتُمُ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَیۡتُمُ الزَّکٰوۃَ وَ اٰمَنۡتُمۡ بِرُسُلِی و عَزَّرۡتُمُوۡھُمۡ و اَقۡرَضۡتُمُ اللہ قرضًا حسنًا لاُکَفِّرَنَّ عنکم سیاٰتکم

اگر تم نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے اور میرے رسولوں پر ایمان لاتے اور ان کی مدد کرتے اور تم اللہ کو قرض حسنہ دیتے تو میں تم سے تمہارے گناہ مٹا دیتا اور تمہیں جنتوں میں داخل کرتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو بنی اسرائیل کی طرف اللہ کے آخری رسول ہیں۔ قرآن پاک نے ان کا قول نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں انی عبداللّٰہ آتانی الکتاب و جَعَلَنِی نَبِیًّا وَجَعَلَنِی مُبَارَکًا اینما کنتُ و اَوصَانی بالصلوۃوالزکٰوۃمادمتُ حَیًّا

میں اللہ کا بندہ ہوں اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے

اور مجھے مبارک بنایا ہے۔ جہاں بھی میں ہوں اور مجھے نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا ہے جب تک میں زندہ رہوں۔

یہ قرآن کریم کا بیان ہے آپ نے دیکھا ہے کہ تمام سابقہ انبیاء اور ان کی امتوں پر نماز کے ساتھ زکوٰۃ بھی لازم ٹھہرائی گئی ہے اور اسی میں ان امتوں کے لیے دنیوی خیر و برکت اور اخروی نجات کی خبر دی گئی ہے یہی بات کچھ مختلف انداز میں ایک غیر مرتب اور اجمالی صورت میں سابقہ آسمانی کتابوں میں بھی کہی گئی ہے اور ہمارے ہمسایہ یعنی ہندوؤں کی کتابوں میں بھی ہمیں اس کا ذکر ملتا ہے لیکن ہم اسے غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں مقصود صرف یہ کہنا ہے کہ زکوٰۃ ارکان اسلام میں ایک ایسا اہم رکن ہے جس کا حکم نماز کی طرح اور نماز کے ساتھ تمام مذاہب میں موجود رہا اور اسلام میں اسے پوری جامعیت اور ہمہ گیری کے ساتھ اس طرح فرض کیا گیا کہ اسی سے امت مسلمہ کے مالی لحاظ سے کمزور افراد کی کفالت اور عزت نفس کے تحفظ کا سامان بھی کیا گیا اور اسی سے مال و منال، دولت دنیا ہوس زر اور حبِ دنیا سے پیدا ہونے والے مفاسد کا سدباب کیا گیا۔ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ حقیقت زکوٰۃ معلوم کی جائے۔ زکوٰۃ کا لغوی معنی ہے پاکی پاکیزگی صفائی ستھرائی اور اضافہ اور بڑھوتری۔ یعنی زکوٰۃ کی فرضیت کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ مسلمان معاشرہ میں ایک ایسا مذاق' مزاج' روح اور اسلوب پیدا کیا جائے جس سے دو مقاصد پورے ہوں۔

1- ناپاک مال یعنی ناجائز اور حرام مال کے تمام ذرائع ختم کر کے مال یعنی کمائی اور آمدنی کو حلال طیب اور پاکیزہ بنایا جائے۔ نیز پاک کمائی کے نتیجے میں معاشرت معیشت اور رسم و رواج کی جتنی ناپاک اور غیر صحت مند روایات اور خصوصیات جنم لیتی ہیں ان کا امکان یا وقوع روک دیا جائے۔

2- زکوٰۃ کے نتیجے میں مسلمانوں میں حلال اور طیب ذرائع کو اس طرح فروغ دیا جائے جس سے ایک صالح اور خوشحال معاشرہ وجود میں

آئے اور دولت فسق و فجور کا ذریعہ نہیں بلکہ اطاعت مروت، جود و کرم اور ادائے امانت کا ذریعہ بن جائے اور کفالت عامہ کا اسلامی تصور کھلی آنکھوں سے دیکھا جاسکے۔

ان دونوں مقاصد کے فہم کا دار و مدار مندرجہ ذیل امور کے جاننے اور سمجھنے پر ہے ان کے بغیر یہ بات سمجھ نہیں آسکتی کہ زکوٰۃ سے یہ مقاصد کیونکر پورے ہو سکتے ہیں۔

1- مسلم فرد اور امت مسلمہ کا مقصدِ وجود کیا ہے؟ یعنی ہماری انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

2- مال و زر انسانی سیرت و کردار کے بنانے اور بگاڑنے میں کیا کردار ادا کرتا ہے؟ اور اس کے مفاسد سے بچنے کے لیے علاج کیا ہے؟

3- مسلمانوں کی خوشحالی سے مراد کیا ہے؟ اور اس کی ضمانت کیا ہے؟

اب ہم بالترتیب ان نکات پر گفتگو کرتے ہیں:

1- قرآن کریم اپنے ماننے والوں میں سب سے پہلے حقیقتِ ایمان دیکھنا چاہتا ہے وہ کہتا ہے کہ جن حقائق اور صداقتوں کو قبول کر کے تم دائرہ ایمان میں داخل ہوئے ہو انہیں حقیقی طور پر مانو انہیں اپنے دل و دماغ میں اتارو انہیں اپنے تمام احساسات پر غالب کرو۔ انہیں کے مطابق تمہارے اندر سیرت و کردار ظہور پذیر ہونے چاہیں۔ تم اللہ تعالیٰ کو معبود مطلق اور حاکمِ حقیقی مان چکے ہوں۔ محمد ﷺ کو اللہ کا رسول بلکہ آخری رسول مان چکے ہو اور انہیں کی اطاعت اور پیروی کا عہد کر چکے ہو قرآن کریم کو آخری صحیفۂ ہدایت کے طور پر قبول کر چکے ہو اب تمہاری زندگی اللہ کی حاکمیت کے زیر اثر رسول ﷺ کی پیروی اور قرآن کریم کی رہنمائی میں بسر ہونی چاہیے۔ اس کے لیے قرآن کریم ایک تو عبادت کا لفظ استعمال کرتا ہے یعنی تمہیں اللہ کا عبد یعنی غلام بن کر زندگی گذارنا ہے اور دوسرا لفظ اسلام کا استعمال کرتا ہے جس کا معنی ہے سپرد کر دینا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق قرآن کریم کہتا ہے اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت للہ رب العالمین یاد کرو جب ابراہیم سے اس کے رب

نے کہا اسلام لے آ یعنی اپنا آپ سپرد کر دے تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا میں نے اپنا آپ اللہ رب العالمین کے سپرد کر دیا۔ دوسری جگہ قرآن کریم نے مزید وضاحت کرتے ہوئے ابراہیم علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم دہرایا۔ ” قل اِنَّ صَلاتِی و نُسُکی و مَحیایَ و مَماتِی للّٰہ رب العالمین لا شریک لَہ و بذالک امرتُ و انا اول المسلمین اے ابراہیم کہہ دیجئے بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العالمین کے لیے ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے مسلمان ہوں۔

پھر سورہ البقرہ میں اسی بندگی و غلامی اور خود سپردگی و سرافگندگی کی حامل زندگی کو البر یعنی اللہ تعالیٰ سے وفاداری قرار دیا ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ انفرادی لحاظ سے ہمارا مقصدِ وجود اللہ تعالیٰ کا وفادار بندہ بن کر اس طرح زندگی گذارنا ہے کہ ہمارا سب کچھ اللہ کے لیے ہو اسی کی اطاعت اسی سے وفاداری اور اسی کی رضامندی کا حصول ہمارے پیش نظر رہے حتی کہ اسی راستے میں موت آجائے۔

ظاہر ہے ہمارا یہ انفرادی مقصدِ وجود بروئے کار نہیں آسکتا' آجائے تو باقی رہ نہیں سکتا۔ جب تک ہماری اجتماعی زندگی ان تصورات کے مطابق وجود میں نہ آئے کیونکہ انسان زندگی کے عمل میں باہم دگر ایک دوسرے سے پیوست اور ایک دوسرے کے مد و معاون اور محتاج ہیں۔ عائلی زندگی معاشرتی زندگی اداراتی زندگی کاروباری زندگی ریاستی زندگی کہیں بھی انسان تنہا نہیں ہے۔ انسان کی زندگی تو ایک رواں دواں دریا کی طرح ہے جس کی ایک ایک موج دریا کا حصہ بلکہ اس کی زندگی اور قوت دریا کے اندر اور اس سے وابستگی میں ہے۔ انسان کی زندگی بھی ربط و ضبطِ باہم سے عبارت ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اس لحاظ سے ہمارا انفرادی مقصدِ وجود اگر اللہ تعالیٰ کی بندگی اسی کے

سامنے خود سپردگی و سرافگندگی اور اسی کی اطاعت و وفاداری ہے تو ہمارا اجتماعی مقصدِ زندگی یقیناً انہیں صفات و خصوصیات پر مشتمل نظام زندگی کا قیام و نفاذ ہے۔ جس کے نتیجے میں اگر ایک طرف اللہ ہی کی عبادت و اطاعت ہو اور اسی کا قانون حاکم و آمر ہو تو دوسری طرف اللہ کے بندے اس کی نعمتوں سے شاد کام اس کے قانون کی دی ہوئی سہولتوں سے خوشحال اور اس کے عدل و احسان کے زیر سایہ مطمئن اور نہال ہوں۔ اسی کو شریعت کی زبان میں خلافت علی منہاج النبوۃ کہا گیا ہے۔ اس خلافت کے حامل لوگ اگر ایک طرف اپنے زیر تصرف علاقے میں اللہ کی زمین پر اس کی نافرمانی برداشت نہیں کرتے تو دوسری طرف منصب خلافت پر فائز شخص اس حد تک جواب دہی کا احساس رکھتا ہے کہ اسے فکر رہتی ہے کہ اگر فرات کے کنارے کتا بھی بھوکا مرگیا تو عمر اللہ کو کیا جواب دے گا؟ اور ایک شخص پر معمولی ظلم دیکھ کر چیخ اٹھتا ہے کہ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا تم نے کب سے انہیں غلام بنا لیا ہے؟ اور اگر ملک میں قحط پڑ جاتا ہے کہ یہ شخص اس وقت تک آسودگی سیرشکمی اور آرام و راحت کو اپنے اوپر حرام کرلیتا ہے جب تک ملک کے ہر آدمی کو پیٹ بھر کر کھانا میسر نہیں آجاتا۔

ذرا غور کیجئے ایسی خلافت کے قیام اور ایسی سیرت و کردار کی تشکیل ایمانی قوت اخوت و مروت اور قربانی و ایثار کے جذبہ کے بغیر ممکن ہے؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے۔ یہاں قدم قدم پر ایسے موانع ہیں۔ جو انفرادی تشکیل سیرت کے راستے میں بھی حائل ہیں اور اجتماعی نظم خلافت ک راستے میں بھی رکاوٹ ہیں۔ آیئے ان موانع پر غور کریں۔

اللہ کی بندگی اور اپنی ذات اور صلاحیتوں اور توانائیوں کو اللہ کے آستان پر ڈھیر کر دینے اور اعلائے کلمتہ الحق کے لیے انہیں کھپا دینے میں پہلی رکاوٹ آدمی کی نفسانیت اور اس کے تقاضے اور غیر خدا کی بندگی اور طاغوت کی اطاعت ہے۔ اس پر قابو پانے کے لیے ہم پر نماز فرض کی گئی ہے۔ جس سے نفس کی آلودگیوں کی تطہیر اور صرف بندگیِ رب کا جذبہ دلوں میں پیدا کرنے

کے لیے مدد ملتی ہے۔

دوسری رکاوٹ ضروریاتِ زندگی اور آرام و راحت کی طلب و خواہش کا حد سے بڑھ جانا ہے جس سے انسان قوتِ ارادی سے محروم اور ضبطِ نفس سے عاری ہو جاتا ہے اس کا علاج صیام رمضان سے کیا گیا۔

تیسری رکاوٹ مال و زر کی بے جواز طلب اور حبِ دنیا کا خمار ہے اور یہی مذکورہ بالا امور میں ہماری ترتیب کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی سیرت و کردار کے بگاڑ میں سب سے موثر عامل ہوس زر یا حبِ دنیا ہے۔ جتنے بڑے بڑے اخلاقی جرائم ہیں۔ آپ ان کے اسباب کا کھوج لگائیے۔ سب کی تہ میں آپ کو یہی سبب کارفرما نظر آئے گا۔ آدمی جب قناعت سے محروم ہو کر بندۂ درہم و دینار بنتا ہے تو وہ اگر ملازم ہے تو رشوت خوری کے مرض میں مبتلا ہوتا ہے۔ محکموں کے فنڈز ہضم کر جاتا ہے اور جہاں تک ہاتھ بڑھ سکتا ہے غبن اور خیانت سے دریغ نہیں کرتا اگر تاجر ہے تو ملاوٹ کرتا ہے ذخیرہ اندوزی کے ذریعے کساد بازاری یا قیمتیں بڑھانے کی کوشش کرتا ہے اگر ڈاکٹر ہے تو انسانی رشتے کے تقدس کو بھول کر حصولِ زر کے لیے جلاد بن جاتا ہے۔ استاد ہے تو علم کا سوداگر بن جاتا ہے عالم دین ہے تو دین بیچتا اور فتوی فروشی کا ارتکاب کرتا ہے۔ حاکم ہے تو ملک اور قوم بیچ ڈالتا ہے اور اگر اس کے دل میں بے خوفی' شریانوں میں خون کی تیزی' اور دماغ میں مہم جوئی کا شوق ہے تو ڈاکے ڈالتا اور بینک لوٹتا ہے اور اس میں کوئی پڑھے لکھے اور ان پڑھ ہونے کا بھی فرق نہیں۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ڈاکے ڈالنے میں بالعموم بڑے گھروں کے چشم و چراغ شریک ہوتے ہیں۔ اور سمگلنگ کا کاروبار انہیں کے دم قدم سے فروغ پذیر ہے۔ اسی طرح حب دنیا اور ہوس زر کا یہ جذبہ قومی سطح تک پہنچ جاتا ہے تو پھر قومی زندگی کرپشن اور بداخلاقی کے سرطان کا شکار ہو کر جوان جذبوں اور اولوالعزمیوں سے محروم ہو جاتی ہے پھر اس کے نمایاں لوگ بھی جو کسی قوم کسی اجتماعی قوت کے نمائندہ ہوتے ہیں ان کی سوچ کا محور بجز جلب منفعت اور ہوس زر کے اور کچھ نہیں رہتا پورے عالمِ

اسلام کو سامنے رکھتے ہوئے اگر ہم مسلمان قیادت کو دیکھیں تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور اگر تاریخ کے آئینہ میں جھانک کر دیکھیں تو وہاں بھی قدم قدم پر ہمیں اس کے شواہد ملتے ہیں۔ عباسی خلافت کا آخری تاجدار مستعصم باللہ جو تاتاریوں کے ہاتھوں ہلاک ہوا اور جس کی بزدلی اور حب دنیا نے مسلمانوں کی تاریخ کو داغدار کر دیا۔ اس کے متعلق مورخ کہتا ہے کہ موصوف کا سب سے بڑا شوق یہ تھا کہ ہر روز عصر کی نماز کے بعد موصوف اپنے خزانے سے ہیرے منگواتے اور غروب آفتاب تک انہیں الٹتے پلٹتے دل بہلاتے رہتے۔

ہماری قریبی تاریخ میں سلطان ٹیپو ہماری قومی عظمت اور آزادی کے نگہبان بن کر اٹھے تھے۔ لیکن انہیں شکست سے دوچار کرنے والے انگریز نہیں بلکہ وہ ہوس پرست بندۂ درہم و دینار اور سگانِ دنیا تھے جنہوں نے چند ٹکوں کی خاطر سلطان سے غداری کی اور مسلمان قوم کی آزادی کو انگریز کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔

آپ نے دیکھا کہ مال و زر اور دنیا کی محبت کا یہ جذبہ جب حد سے بڑھتا ہے تو کس طرح انفرادی اور اجتماعی مفاسد کا ظہور ہونے لگتا ہے اور اخلاق و کردار کس بری طرح سے تباہ ہونے لگتے ہیں لیکن یہ مفاسد یہیں تک نہیں رکتے بلکہ اس کے نتیجے میں قومی زندگی ایک ایسے اضمحلال اور فروتنی کا شکار ہوتی ہے کہ دیکھنے کو یہ قوم بڑی آسودہ حال بڑی ترقی یافتہ اور بڑی توانا دکھائی دیتی ہے مگر حقیقت میں اس کی بنیادیں ہل جاتی ہیں اس کی حقیقی طاقت کے سرچشمے خشک ہو جاتے ہیں اور اس کی قومی عظمت زوال پذیر ہو جاتی ہے۔

دوسری صدی ہجری کی ابتداء کا واقعہ ہے کہ موجودہ افغانستان کے فرمان روا نے جس کا خاندانی لقب رتبیل تھا بنی امیہ کی حکومت کو خراج دینا بند کر دیا۔ پیہم چڑھائیاں کی گئیں مگر وہ مطیع نہ ہوا۔ ولید بن عبدالملک اموی کے عہد میں جب اس کے پاس طلب خراج کے لیے سفارت بھیجی گئی تو اس نے مسلمانوں کے سفراء سے دریافت کیا وہ لوگ کہاں گئے؟ جو پہلے آیا کرتے تھے۔

کہا گیا وہ لوگ تو گذر گئے۔ رتبیل نے کہا "اگرچہ تمہاری صورتیں ان سے زیادہ شاندار ہیں مگر وہ تم سے زیادہ عہد کے پابند تھے۔ تم سے زیادہ طاقتور تھے۔

مورخ لکھتا ہے کہ یہ کہہ کر رتبیل نے خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور تقریباً نصف صدی تک اسلامی حکومت سے آزاد رہا۔ رتبیل نے دشمن کی حیثیت سے وہ بات کہی جو تاریخ کی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ جس کے بارہ اقبال کہتے ہیں:

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

آج جبکہ علم کی فروانی ذوق نظر میں وسعت اور ولولوں کی ہماہمی ہے۔ آج بھی عمر رسیدہ لوگوں کو جانے دیجئے۔ ہمارا نوجوان اسی کربلا میں کھڑا ہے۔ اسے اس طرح کے معمولات زندگی کا عادی بنا دیا گیا ہے اور کامیابی و کامرانی ترقی و خوشحالی اور آسودگی و فارغ البالی جیسے الفاظ کو ایسا مفہوم پہنا دیا گیا ہے جس نے ہر نوجوان کے پاؤں میں سٹیٹس کی بیڑیاں گلے میں پرسٹیج کا طوق اور مال و دولت دنیا کو اس کا معبود اور مقصود بنا دیا ہے۔ نتیجتہً" وہ ہمہ وقت حالات کی گرفت میں ہے اس کی جان اپنے تن میں نہیں بلکہ ایک ایسے روایتی طوطے میں ہے جس کا نام فکرِ معاش ہے۔ اس کی پوری زندگی اسی قبلہ کے طواف میں گذرتی اور اسی آستانے پر بسر ہوتی ہے۔ بقول اقبال:

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش

ہوسِ زر اور حبِّ دنیا سے پیدا ہونے والے مفاسد کا یہ ایک اجمالی

خاکہ ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مال و دولت ایک ایسی چیز ہے جس سے ہر انسان کا ہر وقت کا سابقہ ہے۔ اگر اس تعلق کو حدود میں نہ رکھا جائے تو مندرجہ بالا مفاسد ظہور پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور ان مفاسد کی موجودگی میں انفرادی سیرت و کردار کی اسلامی خصوصیات کیسے بروئے کار لائی جاسکتی ہیں اور منصبِ خلافت کی نازک زمہ داریاں کیسے ادا کی جاسکتی ہیں۔ اس لیے از بس ضروری ہے کہ اگر مسلمانوں کو اپنا انفرادی اور اجتماعی مقصد وجود روبعمل لانا اور اس کی ذمہ داریوں کو بہ تمام و کمال انجام دینا ہے تو ان مفاسد کو پیدا ہونے سے روکا جانا چاہیے۔

# حب دنیا سے پیدا ہونے والے مفاسد کا علاج

بزرگو بھائیو اور عزیزو!

گزشتہ گفتگو میں، میں نے زکوٰۃ کی قرآن و سنت میں فرضیت و اہمیت اور مال و دولت کے ناروا استعمال اور حب دنیا سے پیدا ہونے والے مفاسد کا ذکر کیا تھا۔ آج کی گفتگو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام ایک دین فطرت اور اصلاح انسانی کا سب سے کامل اور جامع پروگرام ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ان مفاسد کا کوئی حل تجویز نہ کرتا۔ چنانچہ اس نے اس کا ایک شافی و کافی حل تجویز کیا کہ جب تک مسلمان اس پر عامل رہے امت مسلمہ بالعموم ان مفاسد سے بچی رہی۔ آئیے اب دیکھتے ہیں کہ وہ حل کیا ہے؟

1- سب سے پہلے اس مال و دولت سے متعلق تصورات کی اصلاح کی۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت مبارکہ کے وقت مال و زر کے بارہ دو تصورات کارفرما تھے۔ 1- مال و دولت ایک آلودگی ہے جو آدمی اللہ سے تعلق پیدا کر کے اس کی پادشاہی میں داخل ہونا چاہتا ہے اسے ہرگز اس سے تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ اسے دنیا کے ہر کام اور ہر اشتغال سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ہر کسب اور ہر اکتساب سے بچنا چاہیے کیونکہ یہ مال و دولت سے تعلق کا ذریعہ اور دنیا داری ہے۔ اسی تصور کی وجہ سے عیسائیوں میں رہبانیت پیدا ہوئی۔ ہندو مت میں جوگی ازم نے وجود پایا اور بدھ مت میں بھکشو پیدا ہوئے۔ یہ تصور چونکہ فطرت سے بغاوت اور انسانیت کی تذلیل تھی اس لیے انسانی ذہن نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا عام انسانی چلن اس کے برخلاف رہا۔ صرف عبادت گاہوں اور جنگلوں میں اس کے نمونے اب تک باقی ہیں۔

2- دوسرا تصور یہ تھا اور اب بھی ہے کہ مال و زر انسانی کسب اور کدوکاوش کا نتیجہ ہے انسان اپنی محنت سے اسے پیدا کرتا ہے۔ یہ ہر لحاظ سے اس کی مِلک اور یہ اس کا مالک ہے۔ اسے اس پر بہ ہمہ وجود کلّی اختیارات حاصل ہیں وہ اسے سینت سینت کر رکھے، اسراف و تذیر سے کام لے۔ ازراہِ تعیش اڑائے اور خرچ کرے۔ خواہشات کے حصول میں صرف کر ڈالے۔ وہ ہر طرح اس کا مجاز ہے۔

اسلام نے ان دونوں تصورات کو رد کیا اور ان کی اصلاح کرتے ہوئے ایک تیسرا نقطہ نگاہ پیش کیا۔ اس نے بتایا کہ مال و زر اور دولت دنیا میں بجائے خود کوئی ناپاکی کوئی خباثت اور کوئی خرابی نہیں بلکہ یہ انسانی ضروریات کے حصول کا ذریعہ ہے دکھی اور مفلس و نادار انسانوں کی اعانت و مدد کا واسطہ ہے۔ اسی سے دل جیتے جاسکتے اور دکھی دلوں پر مرہم رکھا جاسکتا ہے۔ اسے راہ خدا میں صرف کرکے اللہ کا قرب حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اسے سخاوت سے لٹانے والا عرشِ الٰہی کے سائے میں جگہ پا سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں پروردگار نے اسے الخیر کے نام سے موسوم فرمایا۔ اس میں فی نفسہ کوئی خرابی نہیں۔ اس میں خرابی اس کے غلط استعمال اور اس سے محبت کرنے اسے ترجیح دینے اور اسے مقصد زندگی بنانے سے پیدا ہوتی ہے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔ اِنَّ الانسانَ لِرَبّٖہ لکَنَود و اِنَّہ علیٰ ذٰلک لَشہید و انہ لحُبّ الخَیر لَشَدِید انسان اپنے رَب کا ناشکرا ہے اور وہ خود اس پر گواہ ہے۔ اور وہ خیر یعنی مال و دولت کی محبت میں بڑا سخت ہے ان آیات پر غور فرمایئے مال و دولت کو خیر کے نام سے یاد فرمایا گیا۔ یعنی مال تو سرتاپا خیر ہے البتہ خرابی اس میں اس سے محبت اور محبت میں غلو سے پیدا ہوتی ہے۔ جس کے نتیجے میں انسان میں بجائے شکر کے ناشکری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو تمام برائیوں کی اساس ہے۔ اس لیے اسے ناپاک سمجھ کر اسے ترک مت کرو بلکہ اسے خیر کا ذریعہ بناؤ اسے انسانیت کی خدمت قربِ الٰہی کے حصول اور غلبۂ دین کے لیے صرف کرو۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے کیسی کام کی بات فرمائی

جس کا مفہوم یہ ہے کہ مال و دولت جب تک ہاتھ کی چھڑی یا جیب کی گھڑی ہے تو کوئی نقصان نہیں دیتا البتہ اگر یہ دل کا محبوب بن کر مقاصدِ زندگی، دین اور انسانیت پر ترجیح پا جائے تو پھر اس سے بڑھ کر خطرناک کوئی اور چیز نہیں۔ پھر یہ سیاہ ناگ کی طرح کسی وقت بھی ڈس سکتا ہے۔

دوسرا تصور بھی اسلام نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ انسان جو کچھ محنت کرتا اور سعی و کاوش سے کام لیتا ہے اور جس کی وجہ سے اپنے کسب و اکتساب پر حقِ ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے۔ کیا یہ محنت اور سعی و کاوش کا جذبہ اور اس میں صرف ہونے والی توانائیاں اور استعمال ہونے والی ذہنی صلاحیتیں اس کی اپنی پیدا کردہ ہیں اور پھر جس زمین پر محنت کرتا اور جس فضا میں دوڑ بھاگ کرتا اور جن عناصر سے کام لیتا ہے اس کی مخلوق ہیں؟ اور پھر سعی و محنت کے نتیجے میں جو کچھ وجود میں آتا ہے کیا وہ صرف اسی کی سعی و کاوش کا نتیجہ ہوتا ہے یا وہاں کچھ اور عناصر بھی کارفرما ہوتے اور اس کی معاونت کرتے ہیں۔ اگر یہ سب کچھ اس کا اپنا نہیں ہے پھر یہ کیسے حقِ ملکیت کا دعویٰ کرتا اور اس بنیاد پر اپنے لامحدود اختیارات کی عمارت تعمیر کرتا ہے؟ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے "

اَفَرَأَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَاۤ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ"

(سورہ واقعہ)

ترجمہ: اچھا پھر یہ بتاؤ کہ تم جو کچھ بوتے ہو اسے تم اگاتے ہو یا (اس کے) اگانے والے ہم ہیں اگر ہم چاہیں تو اس (پیداوار) کو چورا چورا کر دیں پھر تم حیرت کرنے لگو۔ کہ (اب کی تو) ہم پر تاوان پڑ گیا۔ بلکہ ہم (بالکل ہی) محروم ہو گئے اچھا پھر یہ بتاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو اس کو بادل سے تم برساتے ہو یا (اس کے) برسانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو کڑوا کر ڈالیں تو

تم شکر کیوں نہیں کرتے۔ اچھا پھر یہ بتاؤ کہ جس آگ کو تم سلگاتے ہو۔ اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟ ہم نے اس کو یاددہانی کی چیز اور مسافروں کی نفع کی چیز بنایا ہے۔

ان تمام سوالات کا جواب ظاہر ہے اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان تمام امور کا مالک اور ان تمام قدرتوں کا حامل اور یہ تمام نعمتیں دینے والا اور خود حضرت انسان اور اس کی صلاحیتوں اور اس کے احساسات و امکانات کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی کی دین اور عطا ہے۔ یہ سب کچھ اس کی امانت ہے انسان کو اس کا مالک نہیں اسے اس کا امین بنایا گیا ہے۔ اس کو اس میں تصرف کے جو محدود اختیارات دیئے گئے ہیں وہ اسی امانت کے تصور کے حوالے سے ہیں اور اسی حوالے سے وہ آخرت میں اس سے جواب طلبی کرے گا۔ اس طرح اسلام نے پہلے سے موجود دونوں تصورات کو رد کرکے یہ تیسرا امانت کا تصور دیا۔ جس کے قبول کرلینے سے ان تمام مفاسد کا راستہ بند ہو جاتا ہے جو مال و دولت کو ملکیت سمجھنے' اسے مقصد زندگی بنانے اور اس کی محبت کا اسیر ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس سے دولت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تمام آلودگیوں سے بچنے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ بقول اقبال:

کرتا ہے دولت کو ہر آلوگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امین
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و نظر کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

اسلام کا یہ انقلاب انگریز تصور ہے جس نے انسانی سوچ کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اب وہ مال و دولت کو ذاتی خواہشات پر بے دریغ اڑانے یا بخل کا شکار ہو کر روک روک کر رکھنے کی بجائے اس کو اللہ کی امانت سمجھنے لگا اور اس کے صرف اور استعمال سے پہلے سوچنے لگا کہ اس سلسلے میں میری ذمہ داریاں کیا ہیں؟ میرے اختیارات کی حدود کیا ہیں؟ صرف کے جائز مصارف کیا ہیں؟

پھر اسلام نے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھایا۔ اپنے ماننے والوں کو بتایا کہ تم امت محمدیہ علی صاحبہا السلام کے لوگ دوسری امتوں کی طرح نہیں ہو کہ صرف اپنی اور اپنی دنیا کی فکر میں مگن رہو بلکہ تم تو دنیا کو بنانے اور سنوارنے کے لیے اٹھائے گئے ہو۔ تمہیں پوری دنیا کو اللہ کے راستے پر ڈالنا اور اس کے آستانے پر جھکانا ہے۔ اللہ کی زمین پر اللہ کے نام کو بلند کرنا اور اس کے پیغام کو غالب کرنا ہے تم شہ لولاک ﷺ کے شاہیں ہو اور شاہین پستیوں کا نہیں بلندیوں کا خوگر ہوتا ہے۔ بقول اقبال:

؎ ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ وحور
کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

تم اس امت کا ہراول دستہ ہو، قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے تمہیں اخلاقی معنوی اور روحانی زندگی کی نئی تاریخ کے لیے بنیادیں فراہم کرنی ہیں جس پر ایک تابناک مستقبل کی تعمیر ہو سکے۔ اس لیے تمہاری نگاہوں میں درہم و دینار کی حیثیت خزف ریزوں سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ تمہاری بلند ہمتی اور عالی ظرفی کے سامنے متاعِ دنیا مچھر کے پر سے بھی حقیر تر ہونی چاہیے۔ اور پھر عملی مثالوں سے تربیت بھی فرمائی۔ حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ مدینہ طیبہ کے بالائی علاقے سے گذر رہے تھے کہ کوڑے کرکٹ کے ایک ڈھیر پر آپ نے بکری کا ایک مردہ بچہ پڑا ہوا دیکھا۔ آپ رک گئے۔ آپ نے صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم میں سے کوئی اسے خریدے گا۔ صحابہ نے عرض کیا۔ حضور اس مردہ بچے کو کوئی لے کر کیا کرے گا۔ فرمایا اس کی بھی کوئی قیمت ہو سکتی ہے لیکن اللہ کی نظر میں پوری دنیا کی اتنی بھی قیمت نہیں۔

ایک اور موقعہ پر ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ کی نگاہ میں پوری دنیا کی قیمت مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافر کو پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ دیتا۔

ایک موقعہ پر تنبیہہ کے انداز میں فرمایا ما الفقر اخشی علیکم و لکنی اخشی ان تبسط علیکم الدنیا کما بسطت علی من قبلکم فتنافسوھا کما تنافسوھا فتھلکم کما اھلکتم

میں تم پر بھوک اور غربت سے نہیں ڈرتا لیکن اس بات سے فکر مند ہوں کہ تم پر دنیا وسیع کر دی جائے جیسے تم سے پہلے لوگوں پر وسیع کی گئی پھر تم ایک دوسرے سے (دنیا طلبی) میں آگے بڑھنے میں لگ جاؤ۔ جیسے تم سے پہلے لوگ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں لگے رہے۔ پھر یہ دنیا طلبی کی دوڑ تمہیں ہلاک کر دے جس طرح پہلوں کو ہلاک کر چکی ہے۔

اس لیے جب کبھی آنحضرت کسی صحابی کو معمولی سا بھی اس کا اہتمام کرتے دیکھتے (جو شریعت کی نظر میں ناجائز بھی نہ ہوتا) تو آپ اس پر ناگواری کا اظہار فرماتے۔

ایک دفعہ ایک محلے سے گذرتے ہوئے ایک دو منزلہ مکان دیکھا یعنی گھر کی چھت پر ایک کمرہ بنا لیا گیا تھا۔ آپ رک گئے۔ پوچھا یہ کس کا مکان ہے۔ بتایا گیا فلاں صحابی کا ہے۔ مغرب کی نماز میں وہ صحابی حاضر ہوئے سلام عرض کیا۔ آپ نے ناراضگی سے منہ پھیر لیا۔ وہ صحابی بہت پریشان ہوئے ادھر ادھر پوچھا تو انہیں معلوم ہو گیا کہ آپ دوسری منزل اٹھانے سے کبیدہ خاطر ہوئے ہیں۔ وہ گھر گئے اور مکان گرا دیا آنحضرت کو پتہ چلا تو بہت خوش ہوئے۔

اندازہ فرمائیے شرعا” اس عمل میں کوئی قباحت نہیں لیکن آنحضرت ایک ایسی امت کا ہراول دستہ تیار کر رہے تھے جس نے پوری دنیا کے سامنے مثال بننا تھا۔ اس لیے یہاں سوال جائز ناجائز کا نہیں تھا بلکہ مال و دولت جس کی محبت کی گرفت انسان کے مزاج پر ہمیشہ بہت مضبوط رہی ہے۔ انسان کو اس گرفت سے آزاد کرنا اور ایک نیا مزاج تیار کرنا تھا جس پر گرفت اللہ‘ اس کے رسول حقوق العباد اور مقاصد عظیم کی ہوتی۔ جس کے بارہ اقبال کہتے ہیں:

؎ مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم

اس مزاج کو مزید مضبوط اور توانا کرنے کے لیے مسلمانوں کی اولوالعزمی، عالی ہمتی اور وسیع النظری کو آواز دی گئی اور انہیں بتایا گیا کہ تمہاری تگ و تاز کا میدان یہ دنیا ضرور ہے لیکن تمہاری تگ و تاز اسی دنیا تک محدود نہیں بلکہ تم آخرت کے مسافر ہو اس لیے تمہارے انعام و اکرام اور صلہ و جزا کا تعلق بھی اسی آنے والی دنیا سے ہے۔ اور وہاں کی جزا اور صلہ اپنی قدر و قیمت میں کیسا ہو گا یہاں تو اس کا تصور بھی محال ہے البتہ کسی حد تک اس کی تمنا باندھنے کے لیے اسے جنت کا نام دیا گیا اور کہا گیا کہ تمہاری تگ و تاز کی طرح تمہاری آرزوویں اور خواہشات بھی متاع دنیا تک محدود نہیں ہونی چاہیں۔ بلکہ تمہاری عالی ظرفی کے سامنے اس دنیا اور متاعِ دنیا کی کوئی حقیقت نہیں ہونی چاہیے۔ اس لیے ہم تم سے ایک معاملہ کئے لیتے ہیں کہ ہم تمہارے کم قیمت اموال و انفس لے کر تمہیں جنت عطا کئے دیتے ہیں۔ فرمایا ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ ترجمہ: بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے۔

چنانچہ اس طرح مال و دولت کی محبت سے پاک اللہ تعالیٰ اس کے رسول اور زندگی کے عظیم تر مقاصد کی محبت سے سرشار متاعِ دنیا کو حقیر جاننے والا مال و زر کو اللہ کی امانت ماننے والا بلند ہمتی عالی ظرفی اور اولوالعزمی کا حامل ایک مزاج تیار کر کے حب دنیا اور ہوسِ زر سے پیدا ہونے والے ان مفاسد کا علاج کر دیا گیا جو انفرادی تشکیلِ سیرت اور اجتماعی خلافت کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں مانع اور رکاوٹ بن سکتے تھے۔ تو نہ صرف اسراف و تبذیر اور بخل کا راستہ بند ہو گیا بلکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان مال و دولت کے معاملے میں اپنے جائز اختیارات سے بھی دستبردار ہو گئے اور ان کی اولین ترجیح اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی تعمیل اور اسلام اور مسلمانوں کی ضروریات بن گئیں۔ اس اقرار کے بعد کہ سب مال اللہ تعالیٰ کا ہے اور وہ سب اس کے

امین اور ٹرسٹی ہیں ہر قربانی ان پر آسان ہوگئی اور یہ بات یہاں تک بڑھ گئی کہ وہ اپنی ضروریات روک کر اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں پر خرچ کرتے تھے۔ حضرت ابو طلحہ انصاری کی میزبانی کا واقعہ تاریخ میں مشہور ہے اور اس کی نظیر انسانی تمدن کی پوری تاریخ میں شاید ہی مل سکے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول مجھے سخت بھوک اور فاقہ ہے۔ آپ نے اپنے یہاں دریافت فرمایا وہاں کچھ نہ تھا۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا کوئی آدمی ہے جو اس رات اس شخص کی میزبانی کرے یہ سن کر حضرت ابو طلحہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ میں ہوں یا رسول اللہ اس کے بعد وہ اپنے گھر گئے اور بیوی سے کہا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے مہمان ہیں جو کچھ میسر ہے ان کو پیش کر دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ صرف بچوں کا کھانا ہے۔ انہوں نے کہا جب عشاء ہو جائے تو بچوں کو کسی طرح بہلا کر سلا دو اور آ کر چراغ بجھا دو۔ ہم لوگ رات اسی طرح گذار دیں گے۔ انہوں نے یہی کیا صبح ہوئی تو یہ انصاری صحابی رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو فلاں اور فلاں کا یہ کام بہت پسند آیا یا یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو ہنسی آئی۔ اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئی۔ و یوثِرُونَ علیٰ انفسھم ولو کَان بھم خَصاصَة وہ (دوسروں کو) اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود فاقہ میں ہوں۔

چنانچہ یہی وہ عظیم اور قیامت تک آنے والوں کے لیے باعث فخر لوگ ہیں کہ جب پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں تو جواب ملتا ہے جو ضرورت سے بچ رہے خرچ کر دو۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ و یسئلونک ماذا یفقون قل العفو اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں آپ کہہ دیجئے کہ جو ضروریات سے بچ رہے۔

مزید فرمایا لَن تَنالُو البِرَّ حتیٰ تَنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّون تم ہرگز البر یعنی اللہ سے وفاداری کا حق ادا نہیں کرسکتے جب تک محبوب ترین چیز اس کے راستے میں خرچ نہ کرو۔

انسانی فطرت اور انسانی جذبات و احساسات کی تاریخ پر نگاہ رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ انسان کے صراطِ مستقیم سے بھک جانے اور اخلاقِ عالیہ کی مثل اعلیٰ پر ہمیشہ باقی نہ رہنے کے امکانات رہے ہیں۔ اس لیے تنبیہہ کرتے ہوئے اور آگاہی دیتے ہوئے فرمایا قُل اِنْ کَانَ آبَاؤُکُم وَاَبناءُ کم و اخوَانکم وَ ازوَاجُکم و عَشِیرَتکم و اموَال اقتَرفتمُوھَا و تجارۃٌ تَخشَوَن کَسَادَھَا و مَسَاکِنُ تَرضَونَھَا اَحَبَّ اِلَیکُم من اللّٰہ و رَسُولِہ و جِھَادٍ فِی سبیلِہ فَتَرَبَّصُوا حتّٰی یاتی اللّٰہ بِاَمرِہ اے پیغمبر کہہ دیجئے اگر تمہارے آباؤ اجداد اور تمہاری اولادیں اور تمہارے بھائی بند اور تمہاری بیویاں اور تمہارا خاندان اور تمہارے مال جنہیں تم نے کمایا ہے اور تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے رہتے ہو اور اقامت گاہیں جنہیں تم پسند کرتے ہو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کے راستے میں جہاد سے تمہیں زیادہ محبوب ہیں تو پھر انتظار کرو حتی کہ اللہ کا عذاب آجائے۔

مزید فرمایا: ھَا اَنتم ھٰؤُلَاءِ تَدعَونَ لِتُنفِقُوا فِی سبیلِ اللّٰہ و مَن یَّبخَل فَاِنَّمَا یَبخَلُ عَن نَّفسِہ واللّٰہ الغَنِیُّ وانتم الفُقَرَاء وَ ان تَتَوَلَّوا یَستَبدِل قَومًا غیرکم ثم لا یکونُوا امثَالَکم

یہ تمہیں ہو جنہیں پکارا جا رہا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ (اب) جو شخص بخل کرتا ہے تو وہ اپنے نفس سے بخل کرتا ہے اور اللہ غنی ہے اور تم فقراء ہو اور اگر تم پشت پھیرتے ہو تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو بدل دے گا اور وہ تم جیسے نہیں ہوں گے۔

مدینہ طیبہ میں جب حالات کچھ پر سکون ہوئے تو مسلمانوں کو اپنے کاروبار اور اپنی کھیتی باڑی کی طرف توجہ ہوئی۔ آنحضرت سے عرض کیا گیا کہ اجازت ہو تو تجارت اور زراعت کی کچھ دیکھ بھال کرلیں۔ اس پر آیت کریمہ نازل ہوئی۔

وانفِقُوا فِی سَبِیلِ اللّٰہ ولا تُلقُوا بِاَیدِیکُم اِلَی التَّھلکَۃ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو یعنی ضروریات کا

حصول اپنی جگہ لیکن دیکھنا اپنے اہداف سے نظریں ہٹنے نہ پائیں۔ ورنہ ہلاکت میں جا پڑو گے۔

ایک بات ذہن میں رہے کہ مال و دولت کے لیے امانت کا تصور اور پھر ضرورت سے زائد راہ خدا میں خرچ کر دینے کا حکم اور مسلمانوں کا ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر راہ حق میں مال کو خرچ کرنے کا جذبہ اس کا آغاز زکوٰۃ کی فرضیت سے نہیں ہوا کیونکہ زکوٰۃ کی فرضیت تو مدینہ طیبہ میں ہجرت کے بعد ہوئی لیکن انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب اور اس کے نتیجے میں اس ذوق اور مزاج کو پیدا کرنا جو مال کو اپنا نہیں اللہ کا جانے، اس کا سراغ تو ہمیں مکہ معظمہ میں بھی ملتا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ اسے نام بھی زکوٰۃ کا دیا گیا ہے۔ حالانکہ ابھی زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے اس سے مراد وہ اصطلاحی زکوٰۃ نہیں بلکہ مطلق خیرات ہے لیکن اسے یہ نام دے کر ایک تو ذہنوں کو فرض زکوٰۃ کے لیے تیار کرنا معلوم ہوتا ہے اور دوسرے شاید اشارہ اس کی حقیقت اور معنویت کی طرف ہے یعنی اس خیرات سے مقصود مال اور دل و دماغ کو مال سے اور اس کی محبت سے پیدا ہونے والی آلودگیوں سے پاک و صاف کرنا ہے۔

یہ جو عرض کیا گیا ہے کہ زکوٰۃ کا سراغ ہمیں مکی زندگی میں ملتا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ سورہ المومنون مکی سورہ ہے اس میں ارشاد فرمایا گیا ہے قد اَفلَحَ المُؤمِنُونَ الَّذِینَ ھَم فِی صَلَاتِھِم خَاشِعُونَ وَالَّذِینَ ھُم عَنِ اللَّغوِ مَعرِضُونَ وَالَّذِینَ ھَم لِلزَّکٰوۃِ فَاعِلُونَ کامیاب ٹھہرے وہ مومن جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں اور وہ جو فضول کاموں سے اعراض کرنے والے ہیں اور وہ جو زکوٰۃ ادا کرنے والے اور اس پر عامل ہیں۔

مسلمانوں نے پانچ سن نبوی میں ہجرت حبشہ کی ہے۔ اس موقع پر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے حضرت نجاشی شاہ حبشہ کے سامنے آنحضرت کی بعثت اور آپ کی تعلیم پر گفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرمایا، اَمَرَنَا اَن نَعبُدَ اللّٰہ وحدَہ وَلَا نَشرِک بہ شیئًا وَاَمَرنَا بِالصَّلٰوۃِ والزکٰوۃِ والصیام ہمیں آنحضرت نے حکم دیا کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو

شریک نہ کریں اور ہمیں حکم دیا گیا نماز پڑھنے زکوٰۃ دینے اور روزے رکھنے کا۔

اس طرح ابتدائی نبوی دور سے جس طرح غیر اصطلاحی نماز کے ذریعہ تعلق باللہ پیدا کرنے اعتماد علی اللہ کو راسخ کرنے اور نفسانی تقاضوں کو زیر کرنے کا کام شروع کر دیا گیا۔ اسی طرح مطلق خیرات یعنی انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعہ مال و دولت کے حوالے سے اس مقصد کو بروئے کار لانے کا آغاز کر دیا گیا جس کا ہم نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

لیکن اگر ہم تفکر و تدبر کا ایک قدم اور آگے بڑھائیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ مال و دولت کا تعلق اللہ کی ملکیت اور انسانوں کے پاس امانت ہونے کے حوالے سے اور جنت کے بدلے میں اس مال کو مسلمانوں سے پروردگار کے خرید لینے کے حوالے سے جس طرح اللہ تعالیٰ سے ہے اسی طرح بندوں کے حقوق اس مال سے متعلق ہونے کی وجہ سے بندوں سے بھی ہے۔ اب اگر اللہ کے تعلق کے تقاضوں کے حوالے سے اصلاح کا عمل مکمل بھی ہو جاتا لیکن حقوق العباد کے حوالے سے کچھ نہ ہوتا اور بندوں کے تعلق سے متعلق ہدایات نہ دی جاتیں بلکہ انسانی ہمادردی و خیر خواہی پر مبنی مزاج تیار نہ ہوتا تو کبھی اس کے خاطر خواہ نتائج نہ نکلتے۔ بقول جگر مراد آبادی:

؎ جب تک کہ غمِ انساں سے جگر انسان کا دل معمور نہیں
جنت ہی سہی دنیا لیکن جنت سے جہنم دور نہیں

قرآنِ کریم میں ارشاد ہوتا ہے "فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَ مَا اَدْرٰاکَ مَالْعَقَبَہ فَکُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْکِیْنًا ذَا مَتْرَبَہ"

مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی سے گذرنے کی ہمت نہ کی اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دشوار گذار گھاٹی؟ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔

یہاں دشوار گزار گھاٹی سے مراد زندگی کا وہ رویہ اور اسلوب ہے جس میں خواہشات اور جھوٹی آرزوؤں کی تکمیل کی بجائے قربانی و ایثار کی روایت کو

زندہ کیا جاتا ہے اور مال و دولت کی محبت پر غلبہ پاکر حقوق العباد کی ادائیگی میں اور اللہ کی رضا کے حصول میں تسلیم و انقیاد کی راہ اختیار کی جاتی ہے۔ اس رویہ میں خیر کے بہت سے کام شامل ہیں۔ لیکن ان میں نمایاں ترین کام تین ہیں جن کا اس آیت میں پروردگار نے ذکر فرمایا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ نے بھی ان کے بڑے فضائل بیان فرمائے ہیں۔

ان میں پہلا کام گردن کو غلامی سے چھڑانا ہے۔ یعنی کسی غلام کو آزاد کرنا یا اس کی مالی مدد کرنا تاکہ وہ اپنا فدیہ دے کر آزادی حاصل کرلے۔ یا کسی غریب کی گردن قرض کے بوجھ سے آزاد کرانا۔ یا کسی بے وسیلہ آدمی کی تاوان وغیرہ سے جان چھڑانا یا کسی بے گناہ قیدی کی ضمانت یا قرض وغیرہ ادا کرکے رہائی دلانا۔

اسی طرح کسی یتیم اور مسکین کی مدد کرنا اور بھوک میں کھانا کھلانا اور کسی بے سہارا شخص کی دستگیری کرنا اسے آنحضرت نے جہاد کے برابر قرار دیا۔ ارشاد فرمایا۔ السَّاعِی عَلَی الاَرمَلَۃ و المسکین کالسَّاعِی فی سبیل اللہ بیوہ اور مسکین کی مدد کے لیے دَوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسے جہاد فی سبیل اللہ میں دوڑ دھوپ کرنے والا۔

آنحضرت ﷺ نے انسان کا مرتبہ اور اس کی حاجت برآری و غمخواری کی قیمت اور اہمیت اتنی زیادہ بلند کی کہ اس سے بلند کسی اور معیار کا تصور ہی ناممکن ہے۔ اس میں کوتاہی کرنے والا ایسا ہے جس طرح خاص خدا کی نافرمانی اور کوتاہی کرنے والا ہے۔ مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمایئے۔ مشہور حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ سے فرمائیں گے کہ میں بیمار ہوا تو نے میری عیادت نہیں کی۔ وہ کہے گا اے رب میں کیسے آپ کی عیادت کرتا آپ تو رب العالمین ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تجھ کو معلوم نہیں تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے لیکن تو نے اس کی عیادت نہ کی اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو تو نے مجھے کھانا نہیں دیا وہ کہے گا اے رب میں کیسے آپ کو کھانا دیتا آپ تو رب العالمین ہیں اللہ تعالیٰ

فرمائے گا تجھ کو خبر نہیں کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا اور تو نے اس کو کھانا نہیں دیا اگر اس کو کھانا کھلاتا تو وہ کھانا میرے پاس پہنچتا اے ابن آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ وہ کہے گا کہ اے رب میں آپ کو کیسے پانی پلاتا آپ تو رب العالمین ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا لیکن تو نے اس کو پانی نہیں پلایا اگر تو اس کو پانی پلا دیتا تو اس کو میرے پاس پاتا۔ (مسلم)

صحیح حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس کے پاس ایک سواری زائد ہو تو جس کے پاس ایک بھی سواری نہ ہو اس کو دے دے۔ جس کے پاس ایک ناشتہ زائد ہو اس کو دے دے جس کے پاس ناشتہ نہ ہو (ابو داؤد)

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جس کے پاس دو کا کھانا ہو تو وہ تیسرے کو بھی کھانا کھلائے اور جس کے پاس تین کا کھانا ہو وہ چوتھے کو شریک کرے (ترمذی)

آپ نے مزید فرمایا مجھ پر ایمان نہیں لایا وہ شخص جو رات بھر پیٹ بھر کر سوتا رہا اور اس کا پڑوسی بھوکا رہا۔ حالانکہ اس کو اس بات کی خبر تھی۔ (طبرانی فی الاوسط)

ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک آدمی رسول ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ یا رسول اللہ مجھے کپڑا پہنایئے آپ نے اس سے کہا کیا تمہارا کوئی ایسا پڑوسی نہیں ہے جس کے پاس دو جوڑے زائد ہوں۔ اس نے عرض کیا کہ ایک سے زیادہ ہیں آپ نے فرمایا پھر اللہ تعالیٰ جنت میں اس کو اور تم کو جمع نہ کرے۔

آپ نے انسان کے ساتھ غم خواری اور احسان کی یہ فرما کر تو تکمیل ہی فرما دی "لَا یومنَ احَدَکم حتیٰ یَحبَّ لِاَخیہ ما یَحبُّ لنفسہ" تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مسلمان نہیں ہو گا جب تک اپنے بھائی کے لیے بھی وہی نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے۔ اس طرح مال و دولت اور دنیا اور متاع دنیا سے متعلق تصورات و اعمال کی جہتیں مکمل ہو گئیں اور اسلامی معاشرہ اطاعت و انقیاد، سخاوت و ایثار اور انفرادی و جماعتی انانیت سے آزادی کی آخری سطح تک پہنچ گیا۔

# زکوٰۃ کا اصطلاحی مفہوم اور اس کی تفصیلات

برادرانِ عزیز!

گذشتہ خطبہ میں مال و دولت سے پیدا ہونے والے مفاسد کا اسلام نے جو ایک جامع حل پیش کیا ہے میں نے نہایت تفصیل سے اس کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اسلام نے انسان کو انسان کے ساتھ حاجت برآری اور غم خواری کی کیا قیمت رکھی ہے اور اسے کس قدر اہمیت کے قابل سمجھا ہے۔ لیکن ایک چیز بہت واضح ہے کہ اسلام کی نگاہ میں خیر خواہی اور ہمدردی کا مقام خواہ کیسا ہی بلند کیوں نہ ہو انسانوں میں باہمی تقاوت‘ حوصلہ مندی اور خیر کے جذبات میں باہمی فرق اس قدر واضح ہے کہ ہر غور و فکر کرنے والا آدمی اسے بآسانی محسوس کرسکتا ہے۔ چنانچہ اسلام اللہ کا بھیجا ہوا ایک دینِ فطرت ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ انسانی جذبات و احساسات کے اس تقاوت کا اندازہ نہ کرتا اور تمام سے انہیں بلند درجہ اعمال اور اخلاق عالیہ کا مطالبہ کرتا جو اللہ کے مخصوص اور مقرب بندوں کا شیوہ رہے ہیں اس لیے مسلمانوں کی سوسائٹی جب بہت وسیع ہو گئی اور ان میں مختلف اخلاقی و روحانی مراتب اور درجات قائم ہوگئے۔ انسانوں کے مختلف گروہ اور قسمیں ہوگئیں۔ جن میں مالدار بھی تھے اور غریب اور متوسط الحال بھی اور ایسے فیاض اور سخی بھی کہ داد و دہش ان کا ذوق اور غذا بلکہ مزاج اور طبیعت ثانیہ بن گئی تھی اور بخیل اور جزرس اور میانہ رو اور معتدل بھی۔ ایک طرف ایسی قوت ایمانی تھی کہ بڑے سے بڑا خطرہ مول لے سکتی تھی۔ دوسری طرف ضعفِ ایمانی کے نمونے بھی

تھے جو عالم اسلام کے دور دراز گوشوں اور عہد آخر کی نسلوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت اور حکمت تھی کہ اس نے ایسے متنوع مختلف الحال معاشرہ کے لیے ایک ایسا واضح اور معین نصاب مقرر کر دیا جس کی مقدار و تعداد' اصول و شرائط اور علامات و نشانات سب پوری طرح واضح اور مقرر ہیں یہ نصاب نہ اتنا زیادہ ہے کہ متوسط طبقہ اس کے بارہ پریشان ہو جائے نہ اتنا کم کہ امراء و دولت مند طبقہ اہلِ ہمت اور اہلِ خیر کی نگاہ سے گر جائے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ بھی بڑی حکمت تھی کہ اس کو کسی کی رائے یا شخصی ہمت و حوصلہ پر نہیں چھوڑا گیا۔ نہ اس کو ان انسانی جذبات کے حوالے کیا گیا جن میں مد و جزر اور اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ اس کو قانون سازوں' علماء یا حکام کے حوالہ بھی نہیں کیا گیا۔ اس لیے کہ ان پر بھی کلی اعتماد ممکن نہیں۔ کیونکہ وہ بھی ہوائے نفس سے محفوظ و مامون نہیں۔ ان سب باتوں کے پیشِ نظر زکوٰۃ اپنے نصاب و مقدار کے ساتھ فرض کی گئی۔ رسول ﷺ نے اللہ کی ہدایت کے مطابق زکوٰۃ سے متعلق تمام تفصیلات خود طے فرما دیں اور یمن میں حضرت معاذ بن جبل کو تحریری شکل میں بھجوائیں اور یہی تفصیلات من و عن حدیث کی کتابوں میں نقل ہوئیں۔ اور امت کا معمول ٹھہریں ان تفصیلات میں زکوٰۃ کی مقدار کا تعین بھی ہے اور ان چیزوں کی نشاندہی بھی جن پر زکوٰۃ فرض ہے اور یہ بھی کہ زکوٰۃ کب فرض ہوگی۔ آپ نے ان چیزوں کی چار قسمیں فرمائیں۔ 1- از قسم کاشت اور باغات 2- مویشی یعنی اونٹ گائے بکری وغیرہ 3- سونا چاندی 4- مالِ تجارت اپنی تمام قسموں سمیت۔

زکوٰۃ سال میں ایک بار فرض ہے۔ البتہ باغات اور زمین کی پیداوار کا سال اس وقت پورا ہوگا جب یہ باغات اور کھیتیاں پک جائیں اور اپنے کمال کو پہنچ جائیں۔ اگر زکوٰۃ ہر مہینہ یا ہر ہفتہ ادا کرنا پڑتی تو دولت مند لوگوں کے لیے نہایت ضرر رساں اور تکلیف دہ ہوتی اور اگر عمر میں ایک بار فرض ہوتی تو غربا اور مساکین کے حق میں مضرت رساں ہوتی۔ اس لحاظ سے اس سے زیادہ موزوں اور معتدل حکم کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کو ہر سال ادا کیا جائے۔

زکوٰۃ کی مقدار کے تعین میں نہایت دقتِ نگاہ اور حکمت و مصلحت سے کام لیا گیا۔ یعنی اس میں بنیاد محنت، جدوجہد اور سہولت و مشقت کو ٹھہرایا گیا۔ چنانچہ جو مال و دولت آدمی کو اچانک اور یکمشت دستیاب ہو جائے مثلاً کوئی کان کوئی معدنی ذخیرہ یا خزانہ۔ اس میں سال گذرنے کا انتظار نہ کیا جائے گا بلکہ حاصل ہوتے ہی اس پر خمس (پانچواں حصہ) واجب ہو جائے گا البتہ جس کی تفصیل میں خود اس کی محنت اور سعی کو دخل ہو اور اس نے اس کے لیے محنت و مشقت برداشت کی ہو تو اس پر عشر واجب ہو گا مثلاً کھیتی اور باغات وغیرہ۔ لیکن اس سے مراد وہ کھیتی اور کاشت ہے جس کو بونے جوتنے کا کام تو وہ خود کرتا ہے لیکن اس کی سینچائی اس کو خود نہیں کرنا پڑتی نہ اس کے لیے کنواں کھودنا اور رہٹ لگانا پڑتا ہے یہ وہ زمین ہے جسے بارانی کہا جاتا ہے ہاں اگر کوئی شخص ڈول کے ذریعے یا کسی اور طریقہ سے اس کی سینچائی کرتا ہے تو بیسواں حصہ اس پر واجب ہو گا یعنی پانچ فیصد اور کوئی ایسا کام ہو جس کے اضافہ کا انحصار مالک کی محنت پر ہو اور اس کا انتظام نگرانی اور حفاظت اس کے ذمہ ہو تو اس پر اس سے بھی نصف یعنی چالیسواں حصہ واجب ہو گا۔ اس لئے کہ اس میں اس کو کھیتی باڑی سے زیادہ مصروف رہنا پڑتا ہے اور ہر وقت نگرانی کرنی ہوتی ہے کھیتی باڑی اور باغات وغیرہ میں تجارت سے کم دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے اور اس میں اتنا وقت بھی صرف نہیں ہوتا جتنا کسی دوکان، کارخانہ یا کمپنی میں ہوتا ہے اسی طرح بارش سے جو کھیتی پیدا ہوتی ہے وہ سینچائی والی کھیتی سے زیادہ اچھی اور آسان ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی خزانہ کی دریافت ان سب چیزوں سے زیادہ آسان ہے اور اس میں کچھ بھی کرنا نہیں پڑتا۔ چنانچہ نقدی کے لیے دو سو درہم یعنی ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت اور سونے کے لیے بیس مثقال یعنی ساڑھے سات تولے، غلہ اور پھلوں کے لیے پانچ وسق یعنی بیس من بکری کے لیے چالیس بکریاں، گائے کے لیے تیس گائے اور اونٹ کے لیے پانچ اونٹ نصاب مقرر کیا گیا۔ اس سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ نقدی اگر ساڑھے باون تولے چاندی کے برابر ہو جائے اور چاندی ساڑھے باون تولے اور سونا

ساڑھے سات تولے ہو تو ان کی قیمت پر اڑھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ ہوگی لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ ان کے ساتھ نقدی نہ ہو اور اگر نقدی ہو تو پھر ان کا وزن نہیں دیکھا جائے گا بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ نقدی اور سونا چاندی مل کر ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت کو پہنچے ہیں یا نہیں۔ اگر پہنچ گئے تو زکوٰۃ قیمت پر ہوگی ورنہ نہیں۔

اسی طرح اگر سونا اور چاندی الگ الگ نصاب کو نہ پہنچیں لیکن دونوں مل کر کسی ایک کے نصاب کو پہنچ جائیں تو مجموعی قیمت پر زکوٰۃ ہوگی۔

مرد اور عورت الگ الگ حقِ ملکیت رکھتے ہیں۔ اس لیے جو زیور عورت کی ملکیت ہوگا اس کی زکوٰۃ عورت کے ذمہ ہوگی اور جو مرد کی ملکیت ہوگا بے شک وہ عورت کی تحویل اور تصرف مین ہو اس کی زکوٰۃ مرد کے ذمہ ہوگی۔ اگر گھرمیں دونوں کا مجموعی زیور نصاب کو پہنچ جائے لیکن الگ الگ نصاب سے کم ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ بعض لوگوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ زکوٰۃ تو منفعت بخش چیزوں میں ہے۔ زیور تو زیبائش اور زینت کے لیے ہے اس میں زکوٰۃ نہیں ہے۔۔ لیکن یہ صحیح نہیں شریعت نے نہ صرف زینت کو جائز رکھا بلکہ بیوی کو اپنے شوہر کے لیے زینت کرنے کا حکم بھی دیا۔ لیکن اس نے زینت آرائی کے لیے ایک حد مقرر کی ہے۔ وہ ساڑھے سات تولے سونا اور ساڑھے باون تولے چاندی سے کم تک ہے اس سے زیادہ سونا چاندی روک کر ارتکاز کرنا پسندیدہ نہیں البتہ اگر ایسی ہی زینت سے دلچسپی ہوگئی ہے تو پھر اس پر زکوٰۃ ادا کرکے سونا چاندی کی منفعت بخش صلاحیت کو بروئے کار آنے دینا چاہیے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے گھر میں ایک خاتون آئیں ان کے ساتھ ان کی ایک چھوٹی بیٹی تھی جس کے ہاتھ میں سونے کے کنگن تھے۔ آپ نے پوچھا اس کی زکوٰۃ دیتی ہو۔ خاتون نے عرض کیا نہیں۔ آپ نے فرمایا تم یہ پسند کرو گے قیامت کے دن یہی کنگن تمہارے لیے آگ کے بن جائیں۔ اس نے فوراً" وہ کنگن اتار کر آپ کے سامنے ڈال دیئے۔

آپ کی زوجہ محترمہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ میں سونے کا زیور تھا۔ محترمہ نے آنحضرت سے پوچھا۔ حضور یہ کنز ہے۔ آپ نے فرمایا اگر یہ سونے کے نصاب کو پہنچ جائے اور پھر اس سے زکوٰۃ نہ نکالی جائے تو یہ کنز ہے (یعنی جس پر وعید آئی ہے) اور اگر زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو پھر یہ کنز نہیں۔

ان دو حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ زیور پر بھی زکوٰۃ ہے۔ بشرطیکہ ان کا وزن نصاب تک پہنچ جائے کم پر نہیں۔ نقدی اور سونا چاندی کی طرح سامانِ تجارت پر بھی زکوٰۃ ہے یعنی آپ نے تجارت میں جتنا سرمایہ لگایا ہے اگر اس کی مالیت ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت کے برابر یا اس سے زیادہ ہے تو اس پورے سرمائے پر سال گذرنے کے بعد زکوٰۃ ہوگی۔ یہ تجارت چاہے دوکان کی صورت میں ہو یا فیکٹری کارخانہ یا مل کی شکل میں سب میں صرف ہونے والے سرمائے پر زکوٰۃ ہوگی۔ صرف نفع اور پرافٹ پر نہیں البتہ فیکٹری میں نصب مشینوں' آلات فیکٹری کی زمین اور عمارت پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ اسی طرح رہائشی مکان چاہے کرایہ پر دے رکھا ہو' لباس' ضرورت کی چیزوں اور سواری پر بھی زکوٰۃ نہیں۔

جانوروں پر بھی زکوٰۃ ہے اور اس کی تفصیل اس طرح سے ہے اور یہ وہ شرح نامہ ہے جو آنحضرت ﷺ نے تحریری شکل میں عمال کو بھیجا تھا۔

○ اونٹ پر ایک سے چار تک زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی البتہ پانچ سے نو تک ایک بکری۔ دس سے چودہ تک دو بکریاں۔ پندرہ سے انیس تک تین بکریاں۔ انیس سے چوبیس تک چار بکریاں۔ پچیس سے 35 تک اونٹ کا ایک سال کا بچہ۔ 36 سے 45 تک اونٹ کا دو سالہ بچہ۔ 46 سے 60 تک تین سالہ بچہ۔ 61 سے 75 تک چار سال کا اونٹ 76 سے 90 تک دو سال کے دو بچے۔ 120 کے بعد ہر چالیس پر دو سال کا ایک بچہ اور ہر پچاس پر تین سال کا ایک بچہ۔

○ بکری پر ایک سے 39 تک کوئی زکوٰۃ نہیں البتہ 41 سے 120 تک

ایک بکری 121 سے 200 تک دو بکریاں۔ 201 سے 300 تک تین بکریاں پھر ہر سو پر ایک ایک بکری۔

○ گائے بیل بھینس پر ایک سے 29 تک کوئی زکوٰۃ نہیں البتہ 30 پر ایک بچھڑا جو دوسرے سال میں ہو۔ 40 پر ایک بچھڑا جو تیسرے سال میں ہو اور 60 پر دو سال کے دو بچھڑے۔ 70 پر ایک تین سال اور ایک دو سال کا۔ 80 پر تین سال کے دو۔ 90 پر تین سال کے تین۔ 100 پر دو سال کے دو اور تین سال کا ایک۔ غرض اصول یہ ہے ہر تیس بننے والے عدد پر ایک دو سالہ اور ہر چالیس بننے والے عدد پر ایک سہ سالہ۔

اونٹ، گائے، بیل، بھینس اور بکری پر زکوٰۃ کی تفصیلات آپ نے ملاحظہ کی۔ اس میں یہ خیال رہے کہ بھیڑ، مینڈھا اور دنبہ وغیرہ بکری کے ذیل میں آتے ہیں۔ اس لیے ان پر زکوٰۃ اسی تفصیل کے مطابق ہوگی۔ البتہ گھوڑے اور خچر اور ہندوستان میں ہاتھی پر زکوٰۃ نہیں۔ البتہ احناف کے یہاں جو گھوڑے تجارت کے لیے ہوں ان پر زکوٰۃ ہے۔

آپ نے زکوٰۃ کی تفاصیل ملاحظہ فرمائیں۔ یہ ہمدردی و غمگساری اور حسن سلوک کی کم سے کم حد ہے۔ یہ ایسا فریضہ ہے جس سے روگردانی اور فرار اللہ تعالیٰ کو کسی صورت میں منظور نہیں ہے۔ اسلامی شریعت نے نہایت جزم اور سختی کے ساتھ اس کا مطالبہ کیا ہے اور اس کو اسلامی شریعت میں مسلمانوں کا شعار اور دین کے بنیادی ارکان میں سے ایک رکن قرار دیا ہے۔ جو اس کا منکر ہو گا یا اس کی ادائیگی سے جان بوجھ کر روگردانی کرے گا وہ اسلام کے دائرہ سے خارج اور جمہور امت سے علیحدہ سمجھا جائے گا۔ چنانچہ یہی وہ منکرین زکوٰۃ تھے جن سے آنحضرت ﷺ کے بعد اس امت کے سب سے افضل ترین شخص حضرت ابو بکر ؓ نے کھلے طریقے میں قتال کیا تھا اور اس قتال میں تمام صحابہ ان کے ساتھ تھے اور اس اقدام پر ان سب کا اجماع تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے اعمال اور طرزِ زندگی اور اپنی نصیحتوں

ارشادات، ہدایات اور تعلیمات میں صرف اسی حد تک اکتفا نہیں فرمایا اور اس کی ہمدردی و خیر خواہی اور ادائیگی حق کو سب سے اعلیٰ مثال یا آخری شکل قرار نہیں دیا بلکہ ترمذی کی روایت کے مطابق حضرت فاطمہ بنت قیس کے جواب میں آنحضرت نے ارشاد فرمایا "ان فی المال حقا سوی الزکوۃ" بے شک مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے اور اس کے بعد آپ نے سورہ بقرہ کی وہ آیت پڑھی جس میں زکوٰۃ کے علاوہ مستحق لوگوں کو دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ کا مال کے ساتھ رویہ اور اپنے اہل بیت کے ساتھ آپ کا معاملہ فقر و فاقہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ آپ کی یہ آرزو آپ کی زبان سے سنی گئی کہ یا اللہ مجھے ایک وقت سیر کر کے کھلا تاکہ میں تیرا شکر ادا کروں اور ایک وقت بھوکا رکھ تاکہ میں صبر کروں آپ کی ازواج مطہرات اس کی گواہی دیتی ہیں کہ آپ کے گھر میں اکثر فقر و فاقہ کی حالت رہتی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ رسول ﷺ کے اہل بیت گیہوں کی روٹی سے کبھی بھی سیر نہیں ہوئے۔ ہم دو دو مہینے اس حالت میں گذارتے تھے کہ ہمارے گھر میں چولہا بھی نہیں جلتا تھا اور ہماری غذا صرف کھجور اور پانی ہوتی تھی۔ جس وقت حضور ﷺ نے انتقال فرمایا اس وقت ہمارے گھر میں کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جسے کوئی ذی روح کھا سکتا۔ سوائے ایک روٹی کے ٹکڑے کے جو میری الماری میں رکھا ہوا تھا۔ آپ کا طرز عمل تو یہ تھا کہ اپنی ضرورت سے زائد مال کو کبھی گھر میں رکھنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ اسی طرح صدقات کا مال جو عام مسلمانوں کی ملکیت ہے ایک لمحے کے لیے گھر میں رکھنے کے روادار نہ تھے۔ جب تک اس کی تقسیم نہ فرما دیتے آپ کو سکون نہ ہوتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول ﷺ کے مرض وفات کے زمانے میں ہمارے پاس چھ یا سات دینار تھے۔ آپ نے مجھے حکم دیا کہ اس کی تقسیم کر دو۔ حضور کی تکلیف کی وجہ سے مجھے اس کا موقع نہ ملا۔ پھر آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم نے ان چھ سات دیناروں کے ساتھ کیا کیا؟ میں نے عرض کیا کہ میں آپ کی تکلیف کی وجہ سے ایسی مشغول ہوئی کہ خیال نہیں رہا۔ آپ

نے اسی وقت ان کو منگوایا اور اپنے ہاتھ میں رکھا اور فرمایا کہ اللہ کے نبی کا کیا گمان ہو گا اگر وہ خدا سے اس حالت میں ملے کہ اس کے پاس یہ (مال و دولت) ہو۔

آپ ان اموال کو ان کی مناسب جگہوں پر پہنچاتے اور تقسیم کرنے میں بالکل تاخیر نہیں فرماتے تھے اور نہ آپ کو یہ پسند تھا کہ اسے دوسرے وقت پر اٹھا رکھا جائے۔ عقبہ بن الحارث کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کے پیچھے نماز عصر پڑھی۔ آپ نے سلام پھیرا اور بہت تیزی کے ساتھ لوگوں کو پھلانگتے ہوئے ازواج مطہرات میں ے کسی کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ لوگ آپ کی عجلت کی وجہ سے بہت گھبرائے & واپس تشریف لائے تو آپ نے لوگوں کی گھبراہٹ اور حیرت کو محسوس کر کے فرمایا کہ مجھے یاد آیا کہ ہمارے گھر میں کچھ سونا رکھا ہوا ہے مجھے اچھا محسوس نہ ہوا رات اسی حالت میں گذاروں کہ وہ میریے پاس رہے۔ آنحضرت ﷺ کے اس طرز عمل اور سیرت نے صحابہ کرام کی زندگی اور ان کے اذواق و رجحانات پر گہرا اثر چھوڑا اور یہی روح ان کے رگ و ریشہ اور ان کے اخلاق میں سما گئی۔ جو آپ سے زیادہ قریب تھے وہ قدرتی طور پر آپ سے زیادہ مشابہ تھے۔ تاریخ نے ان کے زہد و غم گساری' حاجت برآری' قناعت پسندی' جفاکشی اور ایثار و قربانی کے جو واقعات اور کارنامے محفوظ کر دیئے ہیں وہ اخلاق و مذاہب کی تاریخ میں سب سے بلند اور سب سے زیادہ روشن نظر آتے ہیں اور دنیا کی کوئی قوم ان کے قریب تک نہیں پہنچ سکی۔ خلفائے راشدین کی حیثیت تو اس معاملہ میں ضرب المثل ہے لیکن باقی صحابہ اور صحابیات بھی اس معاملہ میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں اور اس کے نتیجے میں ایسے عجیب و غریب واقعات بھی پیش آئے جنہوں ے غم گساری کی حدوں کو مساوات و برابری سے ملا دیا اور حسن جوار اور ایثار کو بلند سے بلند مقام تک پہنچا دیا۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی اصحاب میں سے کسی کو ایک بکری کی سری ہدیہ ملی۔ انہوں نے یہ سوچ کر کہ فلاں شخص مجھ سے زیادہ حاجت مند ہے اس کو وہاں

بھیج دیا۔ اس نے یہی بات سوچ کر اس کو تیسرے کے پاس بھیج دیا۔ اسی طرح یہ سری ایک سے دوسرے کے پاس جاتی رہی۔ کئی گھروں کا چکر لگانے کے بعد انہی کے پاس واپس پہنچ گئی۔ مال و دولت اور متاع دینا کے بارے میں صحابہ کرام کی اس زہد و قربانی کا یہ سلسلہ تابعین کی طرف منتقل ہوا اور اس سے پھر آخری نسلوں میں پہنچا۔ سید التابعین حسن بصری رحمتہ اللہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ جب صبح ہوتی تو ایک آدمی یہ آواز لگاتا تھا گھر والو! اپنے یتیم کی خبر لو، اپنے مسکین کی خبر لو۔ چنانچہ آئندہ نسلوں میں مختلف مواقع پر مسلمانوں کے اندر جو بڑے بڑے سخی اور ایثار پیشہ لوگ ہمیں نظر آتے ہیں وہ اسی متاعِ بے بہا کا ورثہ ہے جو ایک نسل دوسری نسل کی طرف منتقل کرتی رہی۔ اس سلسلہ میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اور ہمارے قریبی زمانے کے کئی نامور بزرگ اسی سلسلہ کی خوبصورت کڑیاں ہیں حتی کہ مسلمانوں میں ایسے ایسے سلاطین بھی گذرے ہیں جو زہد و ایثار اور استغناء و بے نیازی کی ایسی خوبصورت مثالیں تھے کہ جس نے انہیں طبقۂ زہاد میں شامل کر دیا تھا۔ حضرت صلاح الدین ایوبی، حضرت نور الدین زنگی، سلطان شمس الدین التمش، سلطان ناصر الدین محمود اور سلطان اورنگزیب عالمگیر اس کی چند نمایاں مثالیں ہیں۔ یہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے ساری زندگی خزانے سے ایک پائی تک لینا پسند نہ کی اور اس حال میں زندگی گذاری کہ عمر بھر ان پر زکوٰۃ فرض نہ ہو سکی اور جو آیا وہ اللہ کے راستے میں لٹا دیا اور ان میں بعض تو ایسے لوگ ہیں کہ وہ اپنی وراثت میں اتنا ‘مال‘ بھی نہ چھوڑ کر گئے کہ ان کی ‘تکفین و تدفین کا انتظام ہو سکتا۔

# زکوٰۃ کے سلسلے میں چند قابلِ غور پہلو اور مصارفِ زکوٰۃ کی تفصیل

معزز حاضرین!

'مال و دولت اور متاع دنیا کے ساتھ انسانی تعلق کے نتائج دوگونہ اور دو طرفہ ہیں۔ ایک طرف وہ نتائج ہیں جو ایک مالدار میں حبِ دنیا اور ہوسِ زر سے پیدا ہوتے ہیں اس کا علاج تو زکوٰۃ کے وجوب' مال و دولت کے بارہ میں امانت ہونے کا تصور اور ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کرکے کیا گیا ہے۔ دوسری طرف وہ نتائج ہیں جو مالداروں کے ایثار و قربانی اور داد و دہش سے حاجتمندوں اور لینے والوں کے طرز عمل میں پیدا ہوتے یا ہو سکتے ہیں۔ ان نتائج و اثرات میں سرفہرست عزتِ نفس کا مجروح ہونا پھر رفتہ رفتہ اس پر قانع ہو جانا اور بالآخر دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے والوں اور گداگروں کا ایک طبقہ تیار ہو جانا ہے۔ جو انسانیت کے لیے ذلت کے داغ سے کم نہیں۔

اسلام ایک فطری اور ہمہ گیر دین اور اصلاحِ نفس اور نظامِ زندگی کی درستی کا ایک جامع علاج اور منصوبہ ہے یہ کیسے ممکن تھا وہ اس اہم معاملے کو نظر انداز کر دیتا۔ چنانچہ اس نے اس روگ کا بھی نہایت موثر علاج کیا۔ اس نے سب سے پہلے مالداروں پر زکوٰۃ دیتے ہوئے اور خیرات کرتے ہوئے قلبی احساسات کی اصلاح اور طرز عمل کی درستی پر زور دیا۔ اس نے تعلیم دی کہ صدقہ اور زکوٰۃ کو خلاصۃ" لوجہ اللہ ادا کیا جائے۔ یعنی لینے والے پر نہ کسی قسم

کا احسان کا بار رکھا جائے نہ اس کو ممنون کرم بنایا جائے۔ نہ عام مجمع میں اس کو ذلیل و رسواء کرنے کے لیے دیا جائے۔ کیونکہ اس سے لینے والے کی خوداری کی روح اور اخلاقی غیرت کی حس کو صدمہ پہنچتا ہے اس لیے حکم دیا گیا کہ دینے والوں کے ذہن میں دیتے ہوئے صرف یہ تصور ہونا چاہیے "انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاء ولا شکورا" ہم تم کو خدا کی خوشنودی کے لیے کھلاتے ہیں۔ ہم تم سے کوئی بدلہ اور شکریہ نہیں چاہتے۔

یہ بھی فرمایا گیا کہ تمہارے احسان دھرنے طعنہ دینے یا لینے والے کو ذلیل و رسوا کرنے سے تمہارے صدقہ و خیرات کی حقیقت باطل ہو جائے گی اور تمام ثواب اکارت جائے گا۔

"اَلذین یَنفقوَن اموالھم فی سبَیل اللہ ثم لا یَتبعوَن ما انفقوا مَناً ولا اذی لھم اجرھم عند ربھم وَلا خوف علیھم ولا ھم یحزنوَن قولُ معروف و مغفِرۃ خیرٌ من صَدَقۃٍ یَتبعھا اذی واللہ غنیٌ حلیم (بقرہ)

جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور اس کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں نہ طعنہ دیتے ہیں ان کا اجر ان کے خدا کے پاس امانت ہے اور نہ ان کو قیامت میں کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ کچھ نرمی کی بات کہہ کر اور چشم پوشی سے سائل کو ٹال دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد طعنہ دیا جائے۔ یا احسان جتایا جائے۔ خدا تمہاری ایسی خیرات سے بے نیاز ہے اور تمہارے ایسے کاموں پر بردبار ہے۔

اسے ایک تشبیہ سے مزید واضح فرمایا:

یا ایھا الذین آمنوا لا تُبطلوا صَدقاتکم بالمنِّ والاذی کالذی یُنفقُ مالہ رئاءَ الناسِ ولا یومنُ باللہ ولا بالیوم الآخر فمثلہ کمثَلِ صفوان علیہ تُراب فاصَابہ وابَل فترَکہ صَلد الا یقدرون علی شئی مما کسبوا واللہ لا یھدی القومَ الکافرین مسلمانوں اپنے صدقوں کو احسان جتا کر اور طعنہ دے کر برباد نہ کرو جیسے کہ وہ اپنے صدقوں کو برباد کرتا

ہے جو محض لوگوں کے دکھلانے کو دیتا ہے اور خدا اور قیامت پر ایمان نہیں لاتا۔ اس قسم کی خیرات کی مثال اس چٹان کی ہے جس پر کچھ گرد پڑی ہوئی ہو اس پر بارش پڑے اور اس کو صاف اور چٹیل کر دے کہ اب اس پر کوئی چیز جم نہیں سکتی ہے۔ ان لوگوں نے جو کام کیا اس سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ خدا کافروں کو ہدایت یاب نہیں کرتا۔

2- صدقہ دینے والوں کو دوسری ہدایت یہ دی گئی کہ صدقہ و خیرات اعلانیہ نہیں بلکہ چھپا کر دیا جائے تاکہ ایک طرف دینے والا ریاکاری اور نمود و نمائش سے محفوظ رہے گا تو دوسری طرف لینے والے کی عزت نفس مجروح ہونے سے بچ جائے گی۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ بہتر صدقہ وہ ہے کہ "داہنے ہاتھ سے دو تو بائیں کو بھی خبر نہ ہو۔" البتہ بعض مواقع ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں دوسروں کو تشویق و ترغیب کے لیے صدقہ خیرات اور زکوٰۃ کے اعلان کی ضرورت ہوتی ہے۔ یا کسی اور نیک فرض کے تحت اظہار ضروری ہو جاتا ہے۔ اس لیے قرآن پاک نے دونوں کا لحاظ کرتے ہوئے فرمایا۔ اِنْ تَبدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِیَ وَاِنْ تُخفُوهَا و تُوتُوهَا الفُقَراء فهو خیر لکم (البقرہ)

تم صدقہ کو کھلم کھلا دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر تم اس کو چھپا کر فقراء کو دو تو یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے۔

مالداروں کو یہ ضروری ہدایت دینے کے ساتھ ہی اسلام نے لینے والوں کو بھی ہدایات دیں تاکہ وہ عزت نفس خودداری اور غیرت کی حفاظت کر سکیں۔ اسلام ضرورت مندوں کو حسب ضرورت لینے اور سخت مشکل کے وقت سوال کرنے کی بھی اجازت دیتا ہے۔ تاہم وہ گداگری اور بھیک مانگنے سے نہایت شدت سے منع کرتا ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کو خوددار حوصلہ مند قانع پرچشم اور محنتی و مستعد دیکھنا چاہتا ہے۔ آنحضرت ﷺ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ اَلیَدُ العُلیا خیرٌ مِن الیَدِ السُّفلیٰ اوپر والا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے۔ یعنی دینے والا لینے والے سے بہتر ہے۔ اسی لیے حوصلہ مندی کی ترغیب کے لیے

آپ نے بعض صحابہ سے اس بات کی بیعت لی کہ وہ کسی سے کبھی کچھ نہیں مانگیں گے۔ ایک دفعہ آپ نے فرمایا جو شخص مجھے یہ ضمانت دے کہ وہ کسی سے مانگے گا نہیں تو میں اس کے لیے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ آپ کے آزاد کردہ غلام ثوبان بولے میں یہ ضمانت دیتا ہوں چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے۔

حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں۔ انہوں ے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ سے سوال کیا آپ نے عنایت کیا' پھر مانگا پھر تیسری دفعہ یہ صورت پیش آئی۔ تو آپ نے فرمایا۔ اے حکیم' یہ مال بظاہر نہایت شیریں اور خوش رنگ چیز ہے جو اس کو شرافت کے ساتھ لے گا اس کو اس میں برکت دی جائے گی اور جو لالچ کے ساتھ لے گا اس کو برکت نہ ملے گی اور اس کی حالت ایسی ہوگی جیسے کوئی کھاتا چلا جائے اور اس کا پیٹ نہ بھرے اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔ حکیم نے کہا آج سے میں پھر کسی سے کچھ نہ مانگوں گا اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں خلفاء ان کو اپنا وظیفہ لینے کے لیے بلاتے تھے اور وہ انکار کرتے رہے اور آخر عمر تک اسی انکار پر قائم رہے۔

اس عمومی ممانعت کے ساتھ خاص طور پر ان لوگوں کو مانگنے سے منع فرمایا جو کمانے اور محنت کرنے کے قابل تھے۔ فرمایا: "لا یحل الصدقة لغنی ولا لذی مرة سوی" غیر محتاج اور صحیح و سالم یعنی تندرست آدمی کے لیے صدقہ حلال نہیں۔ بلکہ آپ نے یہاں تک فرمایا۔

"وِالّذِی نفسی بیَدِہ لاَنۡ یَّاخذ احَدکم حَبلَه فیَحتَطب علی ظهرہ خیرٌ له من انَ یاتیَ رجلاً فیسألہ اعطاہ اوَمَنَعَہٗ" قسَم ہے اس ذاتَ کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم میں سے کسی کا رسی لے کر اپنی پیٹھ پر ایندھن اٹھانا (یعنی جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانا اور بازار میں بیچنا) اس سے بہتر ہے کہ وہ دوسرے سے بھیک مانگے اور وہ اسے دے یا نہ دے۔ اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ گداگری اور بھیک مانگنے کا طریقہ جو سخت مجبوری کی حالت

کے علاوہ اختیار کیا جائے وہ ہر حال میں انسان کی شرم و حیاء اور غیرت و آبرو کو برباد کر دیتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

”مَازَالَ الرَّجُلُ یَسئَلُ النَّاسَ حتی یَاتِی یومَ القیامة لیسَ فی وجهه مُضغَةَ لحم (بخاری) آدمی ہمیشہ مانگتا پھرتا ہے یہاں تک کہ وہ قیامت کے روز اس طرح آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا نہ ہوگا۔

اس پوری صورتِ حال کو سامنے رکھئے تو صاف نظر آتا ہے کہ اسلام نے ایک طرف دولت کو اللہ کی امانت قرار دے کر دولت مند اور منعم کو اسراف تبذیر اور بخل سے بچایا اور زکوٰۃ فرض کر کے اور ایثار و قربانی پر ابھار کر معاشرے کے گرے پڑے زندگی کی کشمکش میں پیچھے رہ جانیوالے اور ناگہانی حادثوں کا شکار ہونے والے لوگوں کی کفالت کا انتظام کیا اور دوسرے طرف نادار اور مفلس لیکن صحت مند لوگوں کو خودداری اور حوصلہ مندی کا جذبہ و ولولہ دے کر اور سوال کرنے اور گداگری سے نفرت دلا کر اور آخرت میں رسوائی و نامرادی سے ڈرا کر زندگی کی کشمکش اور حصول معیشت میں شریک کر کے معاشرہ کے کار آمد افراد بنا دیا۔ اس طرح مسلمانوں کے معاش اور اقتصاد کی بنیاد تضامن اور تکافل باہمی پر رکھ کر ہر مسلمان کو دوسرے کے جسم کا حصہ اور مصالح زندگی میں شریک کر دیا۔ ایسے معاشرے میں دولت مند کی دولت رک کر معاشرتی اخلاقی اور معاشی مفاسد پیدا نہیں کرتی بلکہ گردش میں رہ کر نئے ہاتھ تلاش کرتی ہے جو اس کی قوتِ نمو میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔

کیونکہ دولت ہمیشہ سرمائے اور کمانے والے ہاتھ سے پھلتی پھولتی ہے افزائش دولت میں جس طرح سرمایہ اپنا رول ادا کرتا ہے اسی طرح محنت کرنے والا ہاتھ بھی اپنا رول ادا کرتا ہے جس معاشرے میں ربوا یعنی سود یا سودی کمپنیوں کے ذریعے یا ارتکاز اور اکتناز کی صورت میں دولت اپنا رول ادا کرتی ہے وہاں طبقات پیدا ہوتے نفرتیں بڑھتی سرمایہ داری میں اضافہ ہوتا اور صحت مند و توانا ہاتھ اور ذہن بیکار پھرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں افزائش دولت کا

ایک عامل یعنی محنت بیکار ہو جاتا ہے اور معاشرے میں انارکی پھیلتی اور لا اینڈ آرڈر کے مسائل سر اٹھاتے ہیں۔ اسلام نے زکوٰۃ پر مبنی نظامِ اقتصاد دے کر خوبصورتی سے مسلمان معاشرہ کو ان قباحتوں اور مشکلات سے بچایا تھا۔ اے کاش مسلمان اسے سمجھیں اور اپنی دنیا و آخرت کی بہتری کا سامان کریں۔

زکوٰۃ کی تفصیل کے بعد اب ہم مصارف زکوٰۃ کا ذکر کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے مندرجہ ذیل آیت میں تمام مصارف کو بیان فرما دیا ہے:

"انما الصدقات للفُقَرَاءِ والمساکین والعملینَ
عَلیها والمُؤلَّفةِ قلوبهم و فِی الرِّقَابِ و والغرِمین و
فی سبیلِ اللّٰه و ابنِ السَّبیلِ فریضة منَ اللّٰه واللّٰهُ
عَلیمٌ حکیمٌ"

ترجمہ:

یہ صدقات تو دراصل اصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں۔ اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو۔ نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرضہ داروں کی مدد کرنے میں اور راہِ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔

اگرچہ اس آیت میں صدقات کا لفظ استعمال ہوا ہوہے جس میں واجب اور نفلی دونوں صدقات داخل ہیں مگر اس آیت میں باجماعِ امت صدقاتِ فرض ہی کے مصارف کا بیان مراد ہے اور تفسیر قرطبی میں ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں لفظ صدقہ مطلقاً" بولا گیا ہے اور کوئی قرینہ نفلی صدقہ کا نہیں ہے تو صدقہ فرض ہی مراد ہوتا ہے۔ اس آیت کو لفظ "انما" سے شروع کیا گیا ہے یہ لفظ حصر و انحصار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس شروع کے ہی کلمہ نے بتا دیا کہ صدقات کے جو مصارف آگے بیان ہو رہے ہیں تمام صدقات

واجبہ صرف انہی میں خرچ ہونے چاہیں۔ ان کے علاوہ کسی دوسرے مصرفِ خیر میں صدقات واجبہ صرف نہیں ہو سکتے۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ "صدقات" صدقہ کی جمع ہے۔ صدقہ لغت میں اس مال کے جز کو کہا جاتا ہے جو اللہ کے لیے خرچ کیا جائے۔ (قاموس) امام راغب نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ صدقہ کو صدقہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا دینے والا گویا یہ دعوٰی کرتا ہے کہ میں اپنے قول و فعل میں صادق ہوں۔ اس کے خرچ کرنے کی کوئی غرض دنیوی نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضا کے لیے خرچ کر رہا ہوں۔ اس لیے جس صدقہ میں کوئی نام و نمود یا دنیوی غرض شامل ہو جائے قرآن کریم نے اس کو کالعدم قرار دیا ہے

اب ہم بالترتیب مصارفِ صدقات کو بیان کرتے ہیں۔ یہ تعداد میں آٹھ ہیں۔

### 1- فقراء

فقیر سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اپنی معیشت کے لیے دوسرے کی مدد کا محتاج ہو یہ لفظ تمام حاجت مندوں کے لیے عام ہے خواہ وہ جسمانی نقص یا بڑھاپے کی وجہ سے مستقل طور پر محتاجِ اعانت ہو گئے ہوں یا کسی عارضی سبب سے سردست مدد کے محتاج ہوں اور اگر انہیں سہارا مل جائے تو آگے چل کر خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً" یتیم بچے' بیوہ عورتیں' بے روزگار لوگ' اور وہ لوگ جو وقتی حوادث کے شکار ہو گئے ہوں۔

### 2- مساکین

مسکنت کے لفظ میں عاجزی' درماندگی' بے چارگی اور ذلت کے مفہومات شامل ہیں اس اعتبار سے مساکین وہ لوگ ہیں جو عام حاجت مندوں کی بہ نسبت زیادہ خستہ حال ہوں۔ نبی ﷺ نے اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ ایسے لوگوں کو مستحقِ امداد ٹھہرایا ہے جو اپنی ضروریات کے مطابق ذرائع نہ پا رہے ہوں اور سخت تنگ حال ہوں۔ مگر نہ تو ان کی خودداری

کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی اجازت دیتی ہو اور نہ ان کی ظاہری پوزیشن ایسی ہو کہ کوئی انہیں حاجت مند سمجھ کر ان کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ چنانچہ حدیث میں اس کی تشریح یوں آئی ہے کہ "المسکین الذی لا یَجد غِنیً یُغنیه ولا یفطن له فیتصدّق علیه ولا یقوم فیسألَ الناس" مسکین وہ ہے جو اپنی حاجت بھر مال نہیں پاتا اور نہ پہچانا جاتا ہے کہ اس کی مدد کی جائے اور نہ کھڑا ہو کر لوگوں سے مانگتا ہے۔ گویا وہ ایک ایسا شریف آدمی ہے جو غریب ہو۔

## 3- عمال حکومت

یعنی وہ لوگ جو صدقات وصول کرنے اور وصول شدہ مال کی حفاظت کرنے اور ان کا حساب کتاب لکھنے اور انہیں تقسیم کرنے میں حکومت کی طرف سے استعمال کئے جائیں۔ ایسے لوگ خواہ فقیر و مسکین نہ ہوں، ان کی تنخواہیں بہرحال صدقات ہی کی مد سے دی جائیں گی۔ یہ الفاظ اور اسی سورہ کی آیت 103 کے الفاظ خذ من اموالھم صدقہ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی ذات اور اپنے خاندان (یعنی بنی ہاشم) پر زکوٰۃ کا مال حرام قرار دیا تھا۔ چنانچہ آپ نے خود بھی صدقات کی تحصیل و تقسیم کا کام ہمیشہ بلا معاوضہ کیا اور دوسرے بنی ہاشم کے لیے بھی یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ اگر وہ اس خدمت کو بلا معاوضہ انجام دیں تو جائز ہے لیکن معاوضہ لے کر اس شعبے کی کوئی خدمت کرنا ان کے لیے جائز نہیں ہے۔ آپ کے خاندان کے لوگ اگر صاحب نصاب ہوں تو زکوٰۃ دینا ان پر فرض ہے، لیکن اگر وہ غریب و محتاج یا قرض دار یا مسافر ہوں تو زکوٰۃ لینا ان کے لیے حرام ہے البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ خود بنی ہاشم کی زکوٰۃ بھی بنی ہاشم لے سکتے ہیں یا نہیں۔ امام ابو یوسف کی رائے یہ ہے کہ لے سکتے ہیں لیکن اکثر فقہا اس کو بھی جائز نہیں رکھتے۔

## 4- مؤلفتہ القلوب

تالیف قلب کے معنی ہیں دل موہنا۔ اس حکم سے مقصود یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت میں سرگرم ہوں اور مال دے کر ان کے جوشِ عداوت کو ٹھنڈا کیا جاسکتا ہو' یا جو لوگ کفار کے کیمپ میں ایسے ہوں کہ اگر مال سے انہیں توڑا جائے تو ٹوٹ کر مسلمانوں کے مددگار بن سکتے ہوں' یا جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہوں اور ان کی سابقہ عداوت یا ان کی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے اندیشہ ہو کہ اگر مال سے ان کی استمالت نہ کی گئی تو پھر کفر کی طرف پلٹ جائیں گے' ایسے لوگوں کو مستقل وظائف یا وقتی عطیے دے کر اسلام کا حامی و مددگار یا مطیع و فرمان بردار' یا کم از کم بے ضرر دشمن بنالیا جائے۔ اس مد پر غنائم اور دوسرے ذرائع آمدنی سے بھی مال خرچ کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر ضرورت ہو تو زکوٰۃ کی مد سے بھی اور ایسے لوگوں کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ فقیر و مسکین یا مسافر ہوں تب ہی ان کی مدد زکوٰۃ سے کی جاسکتی ہے بلکہ وہ مالدار اور رئیس ہونے پر بھی زکوٰۃ دیئے جانے کے مستحق ہیں۔

یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ نبی ﷺ کے زمانے میں بہت سے لوگوں کو تالیف قلب کے لیے وظیفے اور عطیے دیئے جاتے تھے لیکن اس امر میں اختلاف ہوگیا ہے کہ آیا آپ کے بعد بھی یہ مد باقی رہی یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کی رائے یہ ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے زمانے سے یہ مد ساقط ہوگئی ہے اور اب مولفتہ القلوب کو کچھ دینا جائز نہیں۔ امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ فاسق مسلمانوں کو تالیف قلب کے لیے زکوٰۃ کی مد سے دیا جاسکتا ہے مگر کفار کو نہیں اور بعض دوسرے فقہا کے نزدیک مولفتہ القلوب کا حصہ اب بھی باقی ہے اگر اس کی ضرورت ہو۔

ہمارے نزدیک حق یہ ہے کہ مولفتہ القلوب کا حصہ قیامت تک کے لیے ساقط ہو جانے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلاشبہ حضرت عمر نے جو کچھ کہا وہ بالکل صحیح تھا۔ اگر اسلامی حکومت تالیف قلب کے لیے مال صرف کرنے کی

ضرورت نہ سمجھتی ہو تو کسی نے اس پر فرض نہیں کیا ہے کہ ضرور ہی اس مد میں کچھ نہ کچھ صرف کرے۔ لیکن اگر کسی وقت اسکی ضرورت محسوس ہو تو اللہ نے اس کے لیے جو گنجائش رکھی ہے اسے باقی رہنا چاہیے حضرت عمر اور صحابہ کرام کا اجماع جس امر پر ہوا تھا کہ ان کے زمانہ میں جو حالات تھے ان میں تالیف قلب کے لیے کسی کو کچھ دینے کی وہ حضرات ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ صحابہ کے اجماع نے اس مد کو قیامت تک کے لیے ساقط کر دیا جو قرآن میں بعض اہم مصالحِ دینی کے لیے رکھی گئی تھی۔

## 5- الرقاب

گردنیں چھڑانے سے مراد یہ ہے کہ غلاموں کی آزادی میں زکوٰۃ کا مال صرف کیا جائے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس غلام نے اپنے مالک سے یہ معاہدہ کیا ہو کہ اگر میں اتنی رقم تمہیں ادا کر دوں تو تم مجھے آزاد کر دو، اسے آزادی کی قیمت ادا کرنے میں مدد دی جائے۔ دوسرے یہ کہ خود زکوٰۃ کی مد سے غلام خرید کر آزاد کئے جائیں۔ ان میں سے پہلی صورت پر تو سب فقہاء متفق ہیں لیکن دوسری صورت کو حضرت علی، سعید بن جبیر، ثوری، ابراہیم النخعی، شعبی محمد بن سیرین، حنفیہ اور شافعیہ ناجائز کہتے ہیں اور ابن عباس، حسن بصری، مالک، احمد اور ابو ثور جائز قرار دیتے ہیں۔

## 6- قرض دار

یعنی ایسے قرضدار جو اگر اپنے مال سے اپنا پورا قرض چکا دیں تو ان کے پاس قدرِ نصاب سے کم مال بچ سکتا ہو۔ وہ خواہ کمانے والے ہوں یا بے روزگار اور خواہ عرف عام میں فقیر سمجھے جاتے ہوں یا غنی، دونوں صورتوں میں ان کی اعانت زکوٰۃ کی مد سے کی جا سکتی ہے۔ مگر متعدد فقہا کی رائے یہ ہے کہ جس شخص نے بداعمالیوں اور فضول خرچیوں میں اپنا مال اڑا کر اپنے آپ کو قرضہ داری میں مبتلا کیا ہو اس کی مدد نہ کی جائے جب تک وہ توبہ نہ کر لے۔

## 7- راہِ خدا میں

راہ خدا کا لفظ عام ہے۔ تمام وہ نیکی کے کام جن میں اللہ کی رضا ہو اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس حکم کی رو سے زکوٰۃ کا مال ہر قسم کے نیک کاموں میں صرف کیا جاسکتا ہے لیکن حق یہ ہے اور آئمہ و سلف کی بڑی اکثریت اسی کی قائل ہے کہ یہاں فی سبیل اللہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے یعنی وہ جدوجہد جس سے مقصود نظامِ کفر کو مٹانا اور اس کی جگہ نظام اسلامی کو قائم کرنا ہو۔ اس جدوجہد میں جو لوگ کام کریں ان کو سفر خرچ کے لیے سواری کے لیے آلات و اسلحہ اور سرو سامان کی فراہمی کے لیے زکوٰۃ سے مدد دی جاسکتی ہے خواہ وہ بجائے خود کھاتے پیتے لوگ ہوں اور اپنی ذاتی ضروریات کے لیے ان کو مدد کی ضرورت نہ ہو۔ اسی طرح جو لوگ رضاکارانہ اپنی تمام خدمات اور اپنا تمام وقت' عارضی طور پر یا مستقل طور پر اس کام کے لیے دے دیں ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی زکوٰۃ سے وقتی یا استمراری اعانتیں دی جاسکتی ہیں۔

یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ آئمۂ سلف کے کلام میں بالعموم اس موقع پر غزوہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو قتال کا ہم معنی ہے۔ اس لیے لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ زکوٰۃ کے مصارف میں فی سبیل اللہ کی جو مدد رکھی گئی ہے وہ صرف قتال کے لیے مخصوص ہے لیکن درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ' قتال سے وسیع تر چیز کا نام ہے اور اس کا اطلاق ان تمام کوششوں پر ہوتا ہے جو کلمۂ کفر کو پست اور کلمۂ خدا کو بلند کرنے اور اللہ کے دین کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے قائم کرنے کے لیے کی جائیں خواہ وہ دعوت و تبلیغ کے ابتدائی مرحلے میں ہوں یا قتال کے آخری مرحلے میں۔

## 8- مسافر

مسافر خواہ اپنے گھر میں غنی ہو' لیکن حالتِ سفر میں اگر وہ مدد کا محتاج

ہو جائے تو اس کی مدد زکوٰۃ کی مد سے کی جائے گی۔ یہاں بعض فقہا نے یہ شرط لگائی ہے کہ جس شخص کا سفر معصیت کے لیے نہ ہو صرف وہ اس آیت کی رو سے مدد کا مستحق ہے۔ مگر قرآن و حدیث میں ایسی کوئی شرط موجود نہیں ہے اور دین کی اصولی تعلیمات سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص مدد کا محتاج ہو اس کی دستگیری کرنے میں اس کی گناہ گاری مانع نہ ہونی چاہیے۔ بلکہ فی الواقع گناہ گاروں اور اخلاقی پستی میں گرے ہوئے لوگوں کی اصلاح کا بہت بڑا ذریعہ یہ ہے کہ مصیبت کے وقت ان کو سہارا دیا جائے اور حسنِ سلوک سے ان کے نفس کو پاک کرنے کی کوشش کی جائے۔

# مقاصدِ تخلیق کی بجا آوری میں روزہ کا کردار

معزز خواتین و حضرات!

انسان کے مقصد تخلیق کے حوالے سے قرآن کریم میں تین باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا:

”وما خلقت الجن والانس الالیعبدون“

یعنی میں نے انسان اور جن کو اس لیے پیدا کیا تاکہ وہ میری عبادت کریں۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

”اناّ عَرَضنا الاَمانۃَ علیَ السّمٰوٰتِ والارضِ والجبالِ فَاَبَینَ ان یّحمِلنَھا واشفَقنَ منھا وحَمَلَھَا الاِنسان انہ کان ظَلوماً جھولاً“

ہم نے یہ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی سو ان سب نے انکار کیا اس سے کہ اسے اٹھائیں اور وہ اس سے ڈرے اور اسے انسان نے اپنے ذمہ لے لیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم ہے بڑا جاہل ہے۔

اور تیسری جگہ ارشاد فرمایا:

"وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ"

اور وہ وقت یاد کرو جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا میں زمین پر اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں وہ بولے کیا تو اس میں ایسے کو اپنا نائب بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا۔ حالانکہ ہم تیری حمد کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور تیری پاکی پکارتے رہتے ہیں (تو) اللہ نے فرمایا یقیناً میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

ان تین آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا مقصد تخلیق تین چیزیں ہیں۔ 1- عبادت 2- ادائے امانت 3- خلافت۔

اب ہم تینوں کی وضاحت کرتے ہیں:

## (عبادت)

عبادت سے مراد یہ ہے کہ کائنات کی باقی مخلوق کی طرح انسان بھی اللہ کا بندہ اور اس کا غلام ہے۔ اس کی اصل حیثیت عبد یعنی بندہ ہونا ہے۔ بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملہ میں خود سپردگی اختیار کرے۔ جس طرح باقی مخلوقات کا طریقہ ہے۔ کائنات میں کوئی مخلوق ایسی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی زندگی کے جو فرائض مقرر کر دیئے ہیں اور ان کے لیے جو طریقہ وضع کر دیا گیا ہے اس سے وہ کبھی انحراف کرے پہاڑ ایستادہ ہیں۔ پانی بہہ رہا ہے۔ سورج چمک رہا ہے۔ چاند دمک رہا ہے۔ سبزہ لہلہا رہا ہے پرندے چہچہا رہے ہیں۔ غرضیکہ حیوانات، نباتات، جمادات، چرند، پرند، ہر کوئی اپنے اپنے طریقے اور ڈیوٹی کے مطابق زندگی کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ اور یہ سب کچھ وہ اس لیے کرنے پر مجبور ہیں کہ وہ اللہ کے عباد ہیں اور عبد کو یہ بات زیب

نہیں دیتی کہ وہ اپنے آقا کے بنائے ہوئے طریقے یا اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے یہی حال انسان کا بھی ہے۔ اس کی زندگی کا اصل رویہ عبادت ہے۔ اسے باقی مخلوقات کی طرح سرتاپا اطاعت اور فروتنی ہونا چاہیے۔ وہ زندگی کا کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے سوچے کہ فیصلہ کرتے ہوئے آزادی من مرضی یا عدم اطاعت کا رویہ میری حقیقت عبدیت کے خلاف ہے۔ کیونکہ میں اول و آخر عبد ہوں اور میرا مقصد تخلیق عبادت ہے

**(امانت)**

دوسری آیت سے ہمیں انسان کا مقصد تخلیق امانت معلوم ہوا۔ امانت کا مفہوم سمجھنے سے پہلے ایک بات سمجھ لی جائے کہ انسانوں اور جنوں میں اور باقی مخلوقات میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ اس کائنات میں بڑی بڑی مخلوقات بھی ہیں جو اپنے جسم کی عظمت اور اپنے زور و قوت کی ہیبت‘ اپنی سرعتِ رفتار کی جولانی‘ اپنی عمروں کی طولانی اور اپنی وسعت کار کی فروانوی میں انسان سے بے حد ممتاز ہیں۔ پہاڑوں کو بے پناہ جسامت دی گئی ہے۔ حیوانات کو سرعت رفتار بخشی گئی۔ مچھلیاں سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی زمین کے عمق کی خبرلاتی ہیں۔ پرندے ہوا میں بے سہارا اڑتے پھر رہے ہیں۔ بجلیاں چمکتی کہیں اور ہیں اور گرتی کہیں اور ہیں۔ پانی‘ ہوا‘ اور آگ کا مقابلہ کرنا کسی کے بس میں نہیں۔ فرشتے اپنی قوت اور ہیبت کی بے پناہی کے ساتھ ساتھ پاکیزگی اور تقدس کا شرف بھی رکھتے ہیں لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود وہ ایک چیز سے محروم ہیں جسے حضرت انسان کو عطا کیا گیا ہے۔ یعنی ان میں یہ صلاحیت اور یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنی زندگی کے رویے اور زندگی کا مقصد اور نصب العین اور زندگی کے فرائض از خود متعین کر سکیں۔ سورج چمکتا ہے تو وہ چمکنے پر مجبور ہے۔ چاند دمکتا ہے تو ایسا کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔ پہاڑ استادہ ہیں تو یہی استادگی ان کی زندگی ہے۔ ہر مخلوق جس کام پر لگا دی گئی ہے وہ کام کرنا ان کی ایک مجبوری ہے۔ قدرت کا ایک جبر ہے جس سے وہ کبھی انکار نہیں کر

سکتے۔ فرشتے اپنے تمام تقدس اور ہیبت کے باوجود جس کام پر لگا دیئے گئے ہیں اور جو عظیم اور پاکیزہ ذمہ داریاں ان کے حوالے کی گئی ہیں وہ کبھی ان سے انحراف نہیں کر سکتے۔ آنحضرت ﷺ نے شبِ معراج میں فرشتوں کو عبادت کی مختلف حالتوں میں پایا۔ کسی کو قعود میں دیکھا، کسی کو سجود میں، کسی کو قیام میں، کسی کو رکوع میں اور کسی کو طواف کرتے ہوئے دیکھا۔ حضرت جبریل علیہ السلام بتا رہے تھے کہ حضور ان کو ایسی ہی حالت پر پیدا کیا گیا ہے اور یہ اسی حالت پر باقی رہیں گے۔ حاملین عرش اپنی ڈیوٹی پر ہیں۔ زندگی اور موت کے فرشتے اپنے اپنے کام پر لگے ہوئے ہیں۔ کاتبِ تقدیر اور کاتبِ اعمال اپنے اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں۔ غرضیکہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو کبھی انحراف سرتابی، عدم اطاعت یا ترمیم و تحریف کے بارے میں سوچ بھی سکے۔ یہ صلاحیت صرف انسانوں اور جنوں کو عطا کی گئی ہے اور انہیں اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار دیا ہے کہ تم چاہو تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور چاہو تو معصیت کا راستہ اختیار کرو۔ تم چاہو تو اس کے بندے بن کر رہو اور چاہو تو شیطان اور اپنے نفس کے بندے بن جاؤ۔ یہ اطاعت اور معصیت کی آزادی یہ وہ چیز ہے جس کو یہاں امانت سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ اسی حقیقت کو اس آیت کریمہ میں نہایت خوبصورتی سے اور حکیمانہ انداز میں اس طرح ذکر فرمایا گیا ہے جس سے انسان کی عظمت بھی ظاہر ہوتی ہے اور اس امانت کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔ یعنی اندازہ کیجئے کہ یہ امانت کتنی اہم اور گراں بار ہے کہ آسمان و زمین اپنی ساری عظمت کے باوجود اور پہاڑ اپنی زبردست جسامت اور متانت کے باوجود اس کو اٹھانے کی طاقت اور ہمت نہیں رکھتے تھے۔ مگر انسان نے باوجود کمزور ہونے کے اس بھاری بوجھ کو اپنی جان پر اٹھا لیا۔ اس آیت میں یہ جو کہا گیا کہ اس بارِ امانت کو پہاڑوں اور زمین و آسمان کے سامنے پیش کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ اس پیش کرنے سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ پیش کیا جانا واقعتہً ایک حقیقت ہے یا محض ایک تمثیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زمین و آسمان کے سامنے اس بار

امانت کو پیش کیا جانا لغوی معنی میں ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بات، استعارے کی زبان میں ارشاد ہوئی ہو اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کے ساتھ جو تعلق ہے اسے ہم نہ جان سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ زمین، سورج، چاند اور پہاڑ جس طرح ہمارے سامنے گونگے، بہرے اور بے جان ہیں ضروری نہیں کہ اللہ کے لیے بھی وہ ایسے ہوں۔ اللہ اپنی ہر مخلوق سے بات کر سکتا ہے وہ اس کا جواب بھی دے سکتی ہے۔ اس کی کیفیت کو سمجھنا ہمارے فہم و ادراک سے بالا تر ہے۔ اس لیے بالکل ممکن ہے کہ فی الواقع اللہ نے ان کے سامنے یہ بارِ گراں پیش کیا ہو اور وہ اسے دیکھ کر کانپ اٹھے ہوں۔ اور انہوں نے اپنے مالک و خالق سے یہ عرض کیا ہو کہ ہم تو سرکار کے بے اختیار خادم ہی بن کر رہنے میں اپنی خیر پاتے ہیں۔ ہماری یہ ہمت نہیں ہے کہ نافرمانی کی آزادی لے کر اس کا حق ادا کر سکیں۔ اور حق ادا نہ کرنے کی صورت میں حضور کی سزا برداشت کر سکیں۔ اسی طرح یہ بھی بالکل ممکن ہے کہ ہماری موجودہ زندگی سے پہلے پوری نوع انسانی کو اللہ تعالیٰ نے کسی اور نوعیت کا وجود بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا ہو اور اس نے یہ اختیارات سنبھالنے پر خود آمادگی ظاہر کی ہو۔ اس بات کو ناممکن قرار دینے کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کو دائرۂ امکان سے خارج قرار دینے کا فیصلہ تو وہی شخص کر سکتا ہے جو اپنے ذہن و فکر کی استعداد کا غلط اندازہ لگا بیٹھا ہو۔

البتہ یہ امر بھی اتنا ہی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات محض تمثیلی انداز میں فرمائی ہو اور صورتِ معاملہ کی غیر معمولی اہمیت کا تصور دلانے کے لیے اس طرح کا نقشہ پیش کیا گیا ہو کہ گویا ایک طرف زمین و آسمان اور ہمالہ جیسے پہاڑ کھڑے ہیں اور دوسری طرف 5 - 6 فیٹ کا آدمی کھڑا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ:

> ”میں اپنی ساری مخلوقات میں سے کسی ایک کو یہ طاقت بخشنا چاہتا ہوں کہ وہ میری خدائی میں رہتے ہوئے خود اپنی رضا و رغبت سے میری بالاتری کا اقرار اور میرے احکام کی

اطاعت کرنا چاہے تو کرے ورنہ وہ میرا انکار بھی کر سکے گا اور میرے خلاف بغاوت کا جھنڈا بھی لے کر اٹھ سکے گا۔ یہ آزادی دے کر میں اس سے اس طرح چھپ جاؤں گا کہ گویا میں کہیں موجود نہیں ہوں اور اس آزادی کو عمل میں لانے کے لیے میں اس کو وسیع اختیارات دوں گا بڑی قابلیتیں عطا کروں گا اور اپنی بے شمار مخلوقات پر اس کو بالادستی بخش دوں گا تاکہ وہ کائنات میں جو ہنگامہ بھی برپا کرنا چاہے کر سکے اس کے بعد میں ایک وقت خاص پر اس کا حساب لوں گا جس نے میری بخشی ہوئی آزادی کو غلط استعمال کیا ہو گا اسے وہ سزا دوں گا جو میں نے کبھی اپنی کسی مخلوق کو نہیں دی ہے اور جس نے نافرمانی کے سارے مواقع پا کر بھی میری فرمانبرداری ہی اختیار کی ہو گی اسے وہ بلند رتبے عطا کروں گا جو میری کسی مخلوق کو نصیب نہیں ہوئے ہیں۔ اب بتاؤ تم میں سے کون اس امتحان گاہ میں اترنے کو تیار ہے؟"

یہ تقریر سن کر پہلے تو ساری کائنات میں سناٹا چھا جاتا ہے پھر ایک سے ایک بڑھ کر گراں ڈیل مخلوق گھٹنے ٹیک کر التجا کرتی چلی جاتی ہے کہ اسے اس کڑے امتحان سے معاف رکھا جائے۔ آخر کار یہ مشتِ استخوان اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے رب' میں یہ امتحان دینے کیلئے تیار ہوں۔ اس امتحان کو پاس کر کے تیری سلطنت کا سب سے اونچا عہدہ مل جانے کی جو امید ہے اس کی بنا پر میں ان سب خطرات کو انگیز کر جاؤں گا جو اس آزادی و خود مختاری میں پوشیدہ ہیں۔

یہ نقشہ اپنی چشم تصور کے سامنے لا کر ہی آدمی اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کائنات میں کس نازک مقام پر کھڑا ہوا ہے۔ اب جو شخص اس امتحان گاہ میں بے فکرا بن کر رہتا ہے اور کوئی احساس نہیں رکھتا کہ وہ کتنی بڑی

ذمہ داری کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے اور دنیا کی زندگی میں پانے لیے کوئی رویہ انتخاب کرتے وقت جو فیصلے وہ کرتا ہے ان کے صحیح یا غلط ہونے سے کیا نتائج نکلنے والے ہیں، اسی کو اللہ تعالیٰ اس آیت میں ظلوم و جہول قرار دے رہا ہے۔ وہ جہول ہے، کیونکہ اس احمق نے اپنے آپ کو غیر ذمہ دار سمجھ لیا ہے اور وہ ظلوم ہے کیونکہ وہ خود اپنی تباہی کا سامان کر رہا ہے اور اپنے ساتھ نہ معلوم کتنے اور لوگوں کو لے ڈوبنا چاہتا ہے۔

چنانچہ یہ ہے وہ قوتِ اختیار اور اطاعت و معصیت کی آزادی جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنوں سے اپنی اطاعت و بندگی کا عہد لیا اور اس عہد کی وجہ سے انسان پابند ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ کی اطاعت کرے۔ مگر ہم ایک عجیب بات یہ دیکھتے ہی کہ اس اختیار و آزادی کے دینے کے ساتھ ساتھ انسان کو اللہ تعالیٰ نے دو قسم کی قوتیں بھی عطا فرمائیں۔

-1 اس کو جوہرِ عقل، دانش و بصیرت، ایجاد و اکتشاف کی وہ قوت و دیعت فرمائی ہے جس کے نتیجے میں باوجود کمزور ہونے کے اس نے وہ کارنامے انجام دیئے ہیں کہ بڑی بڑی جسامتیں اور وسعتیں رکھنے والی مخلوق بھی اسکے سامنے عاجز ہے۔ اس نے لوہے میں قوت پرواز پیدا کی ہے۔ اس نے سواریوں کو سرعتِ رفتار بخشی ہے۔ اس نے سمندر کے اندر جھانکنے اور سفر کرنے کی صلاحیت حاصل کی ہے۔ اس نے لوہے میں انسانی دماغ کی طرح حساب کتاب کی دانش پیدا کر دی ہے۔

اور دوسری یہ بات کہ ایک طرف اس کے اندر تسخیرِ عناصر کا بے پناہ جذبہ پیدا کر دیا گیا ہے جس کے نتیجے میں یہ خلا پر کمندیں ڈال رہا ہے اور دوسری طرف عناصرِ قدرت کو اس کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے اور اس کو یہ حق دے دیا گیا ہے کہ تم اپنی خداداد صلاحیت کو کام میں لا کر عناصر قدرت سے بلکہ کائنات کی ہر مخلوق سے حق خدمت لے سکتے ہو اور اپنی زندگی کے فرائض کی ادائیگی

میں ان کو استعمال کر سکتے ہو۔ چنانچہ یہ دونوں صلاحیتیں دے کر اس کے لیے پوری طرح آزمائش کا سامان مہیا کر دیا گیا ہے۔ یعنی ایک طرف اسے کیسی حیرت انگیز صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے کہ اس کی فطرت کے اسرار و عجائبات کائنات کے اسرار و عجائب سے زیادہ حیران کن ہیں۔ ایسی کئی دنیائیں اس کے قلب کی وسعتوں میں اور یہ سارے سمندر اس کے دل کی گہرائیوں میں گم ہو جائیں پہاڑ اس کے یقین کا، آگ اس کی محبت کے سوز کا، سمندر اس کے قطرۂ اشک کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہیں۔ اس کے دماغ کی بلند پروازیاں اس کی روح کی بے تابیاں اور گرم جوشیاں، اس کی غیر مختتم تمنائیں اور ناآسودہ حوصلے اللہ تعالیٰ کا انمول عطیہ ہیں اور دوسری طرف اسے اپنے فیصلوں اور اعمال میں اطاعت اور معصیت کی آزادی عطا کر دی گئی ہے۔ اس صورت حال میں انسان کے لیے جہاں اس بات کا امکان ہے کہ وہ اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے کام لے کر اپنے مالک کے حضور وہ مقام حاصل کر لے جو اس کے اشرف المخلوقات ہونے اور مسجود ملائک ہونے کا تقاضہ ہے وہاں اس بات کا بھی ہر وقت اندیشہ ہے کہ وہ اپنی آزادی اور اختیار کا غلط استعمال کر کے بندگی کی بجائے وہ رویہ اختیار کرے جو طاغوت اور شیطان کا رویہ ہے اور اس کے نتیجے میں خود بھی تباہی کا شکار ہو اور زمین کو بھی فتنہ و فساد سے بھر دے یہ اندیشہ اس وقت زیادہ ہولناک اور تباہ کن ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت انسان کو صرف عبادت اور امانت کے منصب پر ہی فائز نہیں کیا گیا بلکہ خلافت کا تاج بھی اس کے سر پر سجایا گیا ہے۔ یعنی اس کی مندرجہ بالا صلاحیتیں اور آزادی جہاں اس کے لیے آزمائش ہے وہیں اس کے منصبِ خلافت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے ضرورت بھی ہے۔ اسے جہاں خود صراطِ مستقیم پر چلنا ہے وہیں اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ اللہ کی زمین پر شیطان اور طاغوت کی بندگی نہ ہونے دے۔ یہاں ظلم کے راستے بند کر کے عدل و احسان کو اہلِ زمین کا مقدر بنا دے تاکہ دھرتی کی ہر مخلوق کو اس کا حق ملے اور فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا ہو تو انسانوں کے امیر کو رات چین کی نیند نہ آئے۔ کوئی قلب و جگر رکھنے

والی مخلوق بے اطمینان اور دکھ میں مبتلا نہ ہو۔ کھیتیاں نہ اجڑنے پائیں۔ راستے بند نہ ہونے پائیں۔ زمین اپنے باسیوں کے لیے گہوارۂ امن اور ماں کی آغوش بن جائے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان کی دو بنیادی ضرورتیں پوری کی جائیں۔

1- انسان کو خود شناس بنایا جائے۔ یعنی اسے اپنی حقیقتِ عبدیت کا علم اور احساس ہو۔ اسے حقوقِ عبدیت اور فرائضِ عبدیت کا علم ہو۔ اسے اپنی حدود اور اختیارات کا گہرا شعور ہو۔ وہ اپنی آزادی اور اختیار کا مفہوم بھی سمجھتا ہو اور ان کی حدود سے بھی واقف ہو۔

2- انسان علم کے ساتھ ساتھ عدل کی حقیقت سے بھی آگاہ ہو۔ وہ زندگی میں توازن اور اعتدال کی اہمیت کو سمجھتا ہو اسے یہ علم ہو کہ اختیار کے صحیح استعمال کا طریقہ کیا ہے وہ یہ بھی سمجھتا ہو کہ فرد اور اجتماع میں کیا رشتہ ہے اور معاشرتی روابط کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اسے اس بات کا احساس ہو کہ ظلم کی فصل کبھی سرسبز نہیں ہوتی۔ ظلم کے جواب میں ہمیشہ ظلم ہی وجود میں آتا ہے۔ ایک کلمۂ ناروا ہمیشہ ایک تیر بن کر پلٹتا ہے اور دلوں کو زخمی کر دیتا ہے۔ سچ کہا کسی نے:

ے دلوں کو زخم نہ دو حرفِ نا ملائم سے
یہ تیر وہ ہے جو پھر لوٹ کر بھی آتا ہے

مختصر یہ کہ انسان کی تین حیثیتیں ہیں۔ وہ عبادت کا حامل ہے اس لیے اطاعت اس کا رویہ ہونا چاہیے۔ وہ امانت کا پیکر ہے اس لئے اسے ارادہ و اختیار کی امانت میں خیانت کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔ وہ زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے اس لیے زمین پر عدل قائم رکھنا اور ظلم و جبر سے محفوظ رکھنا اس کی ذمہ داری ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ تینوں ذمہ داریاں کس طرح ادا ہو سکتی ہیں۔ یہ بجا ہے کہ یہ سہ گونہ ہمارا مقصدِ تخلیق ہمیں پکار رہا ہے کہ ہم اپنی زندگی کو

عبادت اور امانت کے نور سے بہرہ ور کر کے خلافت کے منصب کے خود کو قابل بنائیں۔ مگر یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ عبادت اور بندگی کی حدود کیا ہیں زندگی کے ہر شعبے میں اس کے تقاضے کیا ہیں۔ پروردگار کے حوالے سے اس کے آداب کیا ہیں اور کائنات کی مخلوقات کے حوالے سے بالعموم اور خود حضرت انسان کیساتھ بالخصوص اس کے آداب کی نوعیت کیا ہے۔ ارادہ و اختیار کی امانت ایک بڑی نعمت سہی لیکن اگر اس کی حدود کا علم نہ ہو یا اس کے لیے طبیعت میں آمادگی نہ ہو۔ تو یہی نعمت ایک بڑی تباہی کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ اس لئے یہ بات از بس ضروری ہے کہ انسان کو اپنے اختیار اور آزادی کا ادراک بھی ہونا چاہیے اور ساتھ ہی اس کی حدود کا علم اور اس کے استعمال کا صحیح طریقہ بھی معلوم ہونا چاہیے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے اگر قوت گویائی بخشی ہے تو اس کی نزاکتوں اور اس پر مسئولیت کا بھی اسے احساس ہونا چاہیے۔ اسے خوب اندازہ ہونا چاہیے کہ اللہ کی یہ عظیم نعمت کتنی بڑی آزمائش ہے۔ یہ پھول بھی بکھیر سکتی ہے اور کانٹے بھی اُگا سکتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ذہن کو علم و دانش کا خزینہ بنا کر انسان کے حوالے کیا ہے جس سے ایجاد و اکتشاف کا ایک جہاں آباد ہو سکتا ہے اب اگر اس پر صحیح علم و آگہی کی نگرانی قائم نہیں کی جائے گی تو یہی علم و دانش کا ذریعہ انسانیت کے لیے ظلم جبر ہلاکت اور تباہی کا ذریعہ بن سکتا ہے مختصر یہ کہ جب تک عبادت و امانت کا صحیح تصور اور علم مہیا نہیں ہو گا اس وقت تک انسان ایک کار آمد انسان بھی نہیں بن سکتا چہ جائیکہ اسے خلافت ارضی کے منصب پر فائز کر دیا جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے انسان پر یہ احسان عظیم فرمایا کہ صرف اس کی جسمانی ضرورتوں کی کفالت کا انتظام ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کی معنوی اور روحانی ضرورتوں کا بھی اس طرح انتظام فرمایا کہ جس ذات گرامی کو نوع انسانی کا جد امجد بنایا اسے ساتھ ہی نبی بنا کر اور اس پر اپنی ہدایت اتار کر اس ضرورت کا انتظام بھی کر دیا اور پھر جیسے جیسے قافلۂ انسانیت آگے بڑھتا گیا ویسے ویسے نبوت کا کاروان بھی ہدایت و رہنمائی کے لیے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہا تا آنکہ سرکارِ

دو عالم ﷺ نے نزولِ اجلال فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ کتابِ ہدایت عطا فرمائی جس نے اس ذرۂ بے مقدار یعنی انسان کو آفتاب اور اس مشتِ خاک کو ہمدوشِ ثریا بنا دیا۔ اس طرح نوع انسانی کی پوری تاریخ علم و معرفت اور بصیرت و آگہی کی تاریخ ہے جس میں انسان کو اپنے مقصد تخلیق کے حوالے سے کبھی اندھیروں میں سفر کرنا نہیں پڑا۔ قرآن کہتا ہے کہ (لکل قوم ھاد) یعنی ہر قوم کے لیے ہادی بھیجا گیا۔ ان پر کتابیں اور صحیفے اتارے گئے۔ تورات زبور انجیل اور قرآن مجید تو مشہور کتابیں ہیں ان کے علاوہ بھی بہت سے صحیفے نازل کئے گئے جن میں سے بعض کا ذکر قرآن پاک میں ہے اور بعض کا آج جدید تحقیقات میں کچھ سراغ ملا ہے مثلاً" بحر مردار کے بعض غاروں میں کچھ ایسے ہی نوشتے ملے ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہم جن مشہور صاحب کتاب پیغمبروں کو جانتے ہیں ان کے بارہ میں میں یہ بھی معلوم ہے کہ ان پر کتابوں کے نزول سے پہلے انہیں روزے رکھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی جو کمالِ انسانیت کے منصب پر تو پہلے ہی فائز ہوتا ہے اب ضرورت ہوتی ہے کہ فیضانِ نبوت کے قبول اور اس کے تحمل کی استعداد اس کے اندر پیدا کی جائے چنانچہ وہ ایک مدت تک کے لیے عالمِ انسانی سے الگ ہو کر ملکوتی خصائص میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس وقت سے اس کے دل و دماغ میں وحیِ الٰہی کا سرچشمہ موجیں مارنے لگتا ہے۔ کوہ سینا کا پر جلال پیغمبر (حضرت موسیٰ علیہ السلام) جب تورات لینے جاتا ہے تو چالیس شبانہ روز بھوکا اور پیاسا رہتا ہے یعنی روزہ رکھتا اور اعتکاف کی حالت میں رہتا ہے اور کوہ سعیر کا مقدس آنے والا (حضرت عیسیٰؑ) اس سے پہلے کہ اس کے منہ میں انجیل کی زبان گویا ہو وہ چالیس روز و شب بھوکا اور پیاسا رہتا ہے۔ اسی طرح فاران کا آتشیں شریعت والا پیغمبر (آنحضرت ﷺ) نزول قرآن سے پہلے پورے ایک مہینہ غار حرا میں ہر قسم کی عبادتوں میں مصروف رہتا ہے۔ یعنی آپ حالت تحنث میں رہتے ہیں۔ اللہ کے قرب کے جویا ہیں، لوگوں کی حالت پر بے چین و مضطرب ہیں غور و فکر میں سر بہ زانو محو حیرت ہیں جو سر کسی کے سامنے نہیں جھکا اس کی پیشانی میں سجدے مچل رہے

ہیں۔ دن روزے میں یعنی بھوکا پیاسا رہ کر گزرتا ہے اور راتیں ذِکرِ الٰہی میں گویا ایک حالتِ اعتکاف طاری ہے۔ بالآخر اسی اثنا میں ناموس اکبر "اقرأ باسمِ رَبِّکَ الَّذی خَلَقَ" کا مژدہ جانفزا لے کر نمودار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ واقعہ رمضان المبارک کا ہے۔ "شہر رمضان الذی انزل فیہ القران" اور یہ داستان شب قدر کی ہے "انا انزلناہ فی لیلۃ القدر"

حاصل کلام یہ کہ انسان کا مقصدِ تخلیق عبادت امانت اور خلافت ہے یہی اس کے وجود کا جواز اور یہی اس کی شناخت ہے۔

لیکن وہ اس آزمائش اور امتحان میں پورا نہیں اتر سکتا تاوقتیکہ اسے صحیح رہنمائی میسر نہ آئے۔ چنانچہ پروردگار نے ہر دور میں یہ رہنمائی انبیائے کرام کی معرفت عطا فرمائی کتابیں اتاریں صحیفے بھیجے تاکہ انسان اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے ٹھوکریں نہ کھائیں لیکن جن عظیم شخصیتوں پر کتابیں اور صحیفے نازل کئے گئے ان میں ان کا تحمل اور استعداد پیدا کرنے کے لیے مسلسل روزے رکھوائے گئے۔ انہیں عالم انسانی سے الگ کر کے عالمِ ملکوت کی کیفیتوں میں رکھا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کلامِ خداوندی سے صحیح تعلق پیدا کرنے اور اس سے حقیقی استفادہ کے لیے ضروری ہے کہ مسلسل روزے رکھے جائیں۔ قرآن کریم چونکہ رمضان المبارک میں نازل ہوا یہ ایک طرح سے اس کی سالگرہ ہے اور پھر رمضان المبارک میں ایسے فیوض و برکات رکھے گئے ہیں جس کا ہزارواں حصہ بھی دوسرے مہینوں میں ممکن نہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں "اس مہینہ کو قرآن مجید کے ساتھ بہت خاص مناسبت ہے اور اسی مناسبت کی وجہ سے قرآن مجید اس مہینہ میں نازل کیا گیا۔ یہ مہینہ ہر قسم کی خیر و برکت کا جامع ہے۔ آدمی کو سال بھر میں مجموعی طور پر جتنی برکتیں حاصل ہوتی ہیں وہ اس مہینہ کے سامنے اس طرح ہیں جس طرح سمندر کے مقابلہ میں ایک قطرہ اس مہینہ میں جمعیت باطنی کا حصول پورے سال جمعیت باطنی کے لیے کافی ہوتا ہے اور اس میں انتظار اور پریشانی خاطری بقیہ تمام دنوں بلکہ پورے سال کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ قابل مبارکباد ہیں وہ

لوگ جن سے یہ مہینہ راضی ہو کر گیا اور ناکام و بدنصیب ہیں وہ جو اس کو ناراض کر کے ہر قسم کی خیر و برکت سے محروم ہو گئے۔

ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں اگر اس مہینہ میں کسی آدمی کو اعمال صالحہ کی توفیق مل جائے تو پورے سال یہ توفیق اس کے شامل حال رہے گی اور اگر یہ مہینہ بے دلی فکر و تردد اور انتشار کے ساتھ گذرے تو پورا سال اسی حال میں گذرنے کا اندیشہ ہے۔

قرآن کریم کے نزول اور رمضان کی نسبت باطنی کے باعث مسلمانوں پر اس مہینے کے روزے فرض کیۓ گئے تاکہ وہ روزوں کے ذریعے اپنے آپ کو قرآن کریم سے استفادہ کے لائق بنا سکیں اور پھر اس استفادہ کے نتیجے میں اپنے مقاصدِ تخلیق کو روبعمل لا سکیں۔

اگر ایک اور پہلو سے اس صورت حال پر غور کیا جائے تو اس میں عاشقانِ رسولؐ کے قلب و جگر کی آسودگی کا سامان بھی ہے دل کی تڑپ اور درد بھی ہے۔ وہ یہ کہ رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں حاملِ قرآن اور مہبطِ قرآن یعنی آنحضرت ﷺ یکہ و تنہا عالم انسانی سے الگ بھوکے پیاسے عالم انسانیت کے حال پر دردمند اور کچھ کر گذرنے کے جذبہ بیتاب سے مضطرب اور سوز و ساز اور پیچ و تاب میں غلطاں و پیچاں شب و روز گذار رہے ہیں۔ تب فیضانِ الٰہی کا نور اس غار کے دھانہ سے طلوع ہوتا ہے۔ ہم رمضان کے روزے رکھ کر درحقیقت آنحضرت ﷺ کی اسی بھوک اور پیاس کی، اور تراویح اور قیام لیل سے آپ کے درد و سوز آرزو مندی، اور اعتکاف کر کے آپ کے عالم انسانی سے الگ تھلگ رہنے کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اے کاش ہم آنحضرت کے سوز و ساز اور درد و اضطراب کا بھی کوئی شمہ اپنے اندر پیدا کر سکتے۔ اس میں بھی آپ کے اتباع و تقلید سے بہرہ ور ہو سکتے۔ کیونکہ محبت و عشق کا تقاضاہ صرف روزے رکھنا ہی نہیں بلکہ ان کیفیات کو اپنے اوپر طاری کرنا بھی ہے جس میں آنحضرت متکیف رہتے تھے۔

اس تمام بحث اور طویل گوئی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان

کے لیے اپنے مقاصدِ تخلیق کی بجا آوری کے لیے اللہ کی کتاب سے رشتہ و اتصال پیدا کرنا ازبس ضروری ہے اور اس ربط و اتصال کے لیے روزے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ بات کچھ ایسی حقیقت ثابتہ و مسلمہ اور نسخہ مجربہ و شافیۂ کا درجہ رکھتی ہے کہ کسی قوم کو بھی اس سے رستگاری نہیں رہی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں مسلمانوں کو روزوں کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا "یاایھاالذین آمنو کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم" اے مسلمانو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے۔ یعنی اللہ کی ہدایت سے مستفیض و مستنیر ہونے کے لیے روزے ایک ایسا لازمی علاج ہیں جسے ہر امت پر لازم کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم جب گذشتہ مذاہب کی تاریخ دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مذہب ایسا نہیں رہا جس میں روزے فرض نہ کئے گئے ہوں۔ ہندوؤں کو بہت قدامت کا دعویٰ ہے ان میں بھی ہر ہندی مہینے کی گیارہ بارہ تاریخ کو برہمن اکاوشی کا روزہ رکھتے تھے۔ اس حساب سے سال میں چوبیس روزے ہوئے۔ بعض برہمن کاتک کے مہینے میں ہر دو شنبہ کو روزہ رکھتے تھے۔ جینی دھرم میں تو بڑی کڑی شرائط کے ساتھ روزہ موجود ہے۔ قدیم مصریوں میں بھی روزہ موجود رہا ہے۔ جس کا شمار تہواروں میں ہوتا تھا۔ یونان میں صرف عورتیں تھسوفریا کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی تھیں۔ پارسی مذہب میں گو عام پیروؤں پر روزہ فرض نہیں لیکن ان کی الہامی کتاب کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم ان کے ہاں موجود تھا۔ خصوصا" مذہبی پیشواؤں کے لیے تو پنجسالہ روزہ ضروری تھا۔

یہودیوں میں بھی روزہ ایک فریضۂ الٰہی کے طور پر موجود رہا ہے۔ اگرچہ اس میں بہت کچھ ترمیم و تحریف کر ڈالی گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے (جیسا کہ گذر چکا) کوہ طور پر چالیس دن روزہ رکھا۔ چنانچہ یہود عام طور پر حضرت موسیٰ کے پیروی میں چالیس دن روزہ رکھنا بہتر سمجھتے تھے لیکن چالیسویں دن کے روزے کو فرض سمجھتے تھے جو ان کے ساتویں مہینے (تشرین) کی دسویں تاریخ کو پڑتا ہے اور اسی لیے اس کو عاشورا کہا جاتا ہے۔ اسی دن حضرت موسیٰ

علیہ السلام کو تورات کے دس احکام ملے تھے۔ اس لیے تورات میں اس دن کے روزہ کی نہایت تاکید آئی ہے۔ اس کے علاوہ یہودی صحیفوں میں اور روزوں کی بھی تصریح آئی ہے جن میں سے کچھ علاقائی اور مقامی کہے جاسکتے ہیں۔ کچھ انفرادی روزے بھی ہیں۔ جنہیں ہر شخص اپنے حالات کے مطابق رکھ سکتا ہے۔ کچھ گناہوں کے کفارہ کے لیے کچھ کسی مصیبت اور افتاد کے وقت رحمتِ خداوندی کے حصول کے لیے رکھے جاتے ہیں۔

عیسائی مذہب میں اگرچہ شرعی احکام ترتیب و تدوین کے مختلف مراحل سے گذرتے رہے ہیں اور شریعت کے بارہ ان کا تصور بھی بہت مختلف رہا ہے۔ تاہم یہ بات ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن تک جنگل میں روزہ رکھا۔ حضرت یحییٰ جو حضرت عیسیٰ کے گویا پیشرو تھے وہ بھی روزہ رکھتے تھے اور ان کی امت بھی روزہ دار تھی۔ مکہ کے قریش جاہلیت کے دنوں میں عاشورا یعنی دسویں محرم کو روزہ رکھتے تھے کیونکہ اس دن خانہ کعبہ پر نیا غلاف ڈالا جاتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ کوئی مذہب بھی روزہ کے تصور سے خالی نہیں رہا۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا مقصدِ تخلیق عبادت، ادائے امانت اور خلافت ہے۔ ان تینوں مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے انکی حقیقتوں، ان کو ادا کرنے کا طریقہ اور ان سے متعلق آداب کا علم ازبس ضروری ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک مختلف زمانوں اور مختلف وقتوں میں ہدایت اور راہنمائی کے لیے صحیفے اور کتابیں اتاریں۔ تاکہ انسان ان کے دیئے ہوئے علم کی روشنی میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکے۔

لیکن کسی مقصد کی ادائیگی کے لیے صرف علم کافی نہیں ہوتا بلکہ اس علم اور ان ذمہ داریوں کے حوالے سے بنیادی صفات اور مطلوب استعداد کا بہم پہنچانا بھی ضروری ہوتا ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزہ فرض فرمایا۔ اور رمضان کا مہینہ اس کے لیے مخصوص کر دیا گیا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ

اس امت کے لیے قرآن کریم جو انسانی زندگی کے لیے ایک مکمل راہنما کتاب ہے اس کا رمضان سے کوئی گہرا رشتہ ہے۔ جیسا کہ اوپر اس کی تفصیل گذر چکی ہے چنانچہ اس امت کو اس رمضان کے مہینے میں فرضیت صیام سے اور قیام لیل کی مشروعیت سے اس قابل بنانے کا اہتمام کیا گیا کہ وہ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے زیادہ سے زیادہ قابل ہو سکے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم رمضاں کے مہینے میں روزہ رکھ کر اور رات کا قیام کر کے اپنے اندر وہ استعداد پیدا کر سکیں جو قرآن کریم سے استفادہ کے لیے ضروری ہے تاکہ ہم اپنی زندگی کے مقاصد کو پورا کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

# فرضیت صوم کے دو مقاصد اللہ کی کبریائی اور اس کے شکر کا قلب و نظر میں بس جانا

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
"لِتُکَبِّرُوا اللہ علیٰ ما ھَدٰاکم ولَعَلَّکُم تَشکُرُون"

معزز خواتین و حضرات!

گذشتہ تقریروں میں، میں نے جو کچھ عرض کیا وہ اگر پیش نظر رہے تو سلسلۂ کلام آگے بڑھے۔

سیاق کلام کے لیے عرض کرتا ہوں کہ قرآن کریم نے انسان کی حقیقت "عبدیت" ذکر فرمائی ہے اور اس کی زندگی کا مقصد عبادت ادائے امانت اور خلافت ٹھہرایا ہے۔ یعنی انسان فی الحقیقت اپنی ذات میں بندہ اور غلام ہے۔ وہ کسی خود رو پودے کی طرح از خود وجود میں نہیں آیا اور نہ اسے چرند، پرند اور دوسرے حیوانات کی طرح جبلت اور حواس کے تحت زندگی گذارنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ حیوانات کی طرح کھائے پیئے تاکہ زندہ رہے اور زندہ رہے تاکہ کھائے پیئے یعنی اس کی زندگی کا مقصد صرف کھانا پینا نہیں اور نہ صرف کھانے پینے کے لیے زندہ رہنا ہے بلکہ اس کا تشخص اور شناخت بندگی ہے۔ اس لیے یہ بات از بس ضروری ہے کہ بندگی کا احساس اس کے دل و دماغ میں راسخ کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ کیونکہ اگر اسے بندگی کا احساس نہیں

ہو گا تو نہ وہ بندگی کے تقاضوں کو بروئے کار لا سکے گا اور نہ اس کی شناخت اس کے تشخص کو مستحکم کر سکے گی۔ ویسے بھی بندگی ایک لگے بندھے طریقے سے زندگی گذارنے اور آزاد روی چھوڑ کر ایک پابند زندگی اختیار کرنے کا نام ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ایک بندہ کہلانے والے کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا آقا کون ہے؟ اس لیے کہ آقائی کے تصور سے ہی بندگی کا تصور جنم لیتا ہے اور بندگی کسی نہ کسی آقا کی متلاشی رہتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایسی لازم و ملزوم ہیں کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے انسان اگر بندہ ہے اور یقیناً بندہ ہے تو ضروری ہے کہ کوئی نہ کوئی اس کا آقا ہو۔ کیونکہ اس کا آقا ہی اس کو بتائے گا کہ اسے زندگی کس طرح گذارنی ہے۔ وہی اس کے لیے زندگی کا رویہ مقرر کرے گا وہی اس کے اعمال کی حدود کا تعین کرے گا۔ وہی اس کے مقصد حیات کو متعین کرے گا۔ وہی اس کے حسن و قبح کا فیصلہ کرے گا۔ کیونکہ ایک بندہ از خود یہ کام کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان کا آقا کون ہے؟ کہ جس کی خوشنودی اس کی زندگی کا اصل ہدف ہونا چاہیے۔ اس لحاظ سے جب ہم غور کرتے ہیں تو بعض چیزیں پیش پا افتادہ حقیقت کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ مثلاً" انسان از خود پیدا نہیں ہوا اس کا کوئی نہ کوئی خالق ہے۔ اس کے لیے کسی نہ کسی نے زندگی کا ساز و سامان مہیا کیا ہے۔ کوئی اس کی ضروریات فراہم کر رہا ہے۔ کوئی تو ہے جس نے اس کو زندگی دی ہے اور پھر زندگی کی بقا کے لیے کفالت کا سامان کیا ہے۔ پھر کوئی تو ہے جو اسے بیماریوں سے شفا دیتا اور دکھوں سے نجات دیتا ہے۔ کوئی تو ہے جس نے اسے چلنے کے لیے زمین دی ہے اور سر پر آسمان کی چھت تانی ہے۔ کوئی تو ہے جس نے اسے درختوں کا ٹھنڈا سایہ دیا ہے اور اس کو ماں باپ جیسی نعمتیں عطا کی ہیں اور اسے محبت و پیار کا احساس دیا ہے۔ کوئی تو ہے جس نے اس کے دل کو دھڑکنا اور دماغ کو سوچنا سکھایا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس نے یہ سب کچھ عطا کیا ہے کیا اس کے سوا کوئی اور بھی اس کا آقا ہو سکتا ہے؟ کیا ایسی بے عقلی کی بات سوچی بھی جا سکتی ہے کہ زندگی دینے والا کوئی

اور ہو اور حکم دینے والا کوئی اور ضروریات زندگی کوئی اور فراہم کر رہا ہو اور اطاعت کسی اور کی کی جائے۔ زندگی کے امکانات کوئی اور مہیا کر رہا ہو اور بندگی کسی اور کی کی جائے۔ ظاہر ہے اس میں کھلا تضاد ہے۔ انسان کی فطرت اسے قبول کرنے سے انکار کرتی ہے۔ احسان شناسی، انسان کا فطری جوہر ہے۔ وہ جس کا کھاتا ہے اسی کا گاتا ہے۔ جس کو اپنے سے برتر جانتا ہے اسی کے سامنے جھکتا ہے۔ جس کے پاس زندگی کے امکانات کی فروانی دیکھتا ہے اسی کے سامنے وہ دست سوال دراز کرتا ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ جب وہ اپنے آقا کی تلاش میں نکلے تو جس خداوند ذوالجلال نے اسے یہ سب کچھ عطا کیا ہے وہ اس کے سوا کسی اور کو اپنا آقا بنائے اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ذات میں اگر ایک بندہ ہے تو اس کا آقا یقیناً وہ پروردگار عالم ہے جس نے اسے زندگی دی ہے اور اس کے کھانے پینے کا سامان کیا ہے اور جس نے اس کی ایک ایک ضرورت کا لحاظ کیا اور پھر نہایت وسعت سے اسے مہیا فرمایا ہے۔ وہی ہے جو انسان کے قلب و نگاہ کا مرکز اولین و آخرین ہے۔ اسی کے سامنے وہ اپنا سر جھکانا چاہتا ہے اور اسی سے اپنی امیدوں کے لیے دعائیں مانگتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہی اس کا آقا ہے تو اس کے آقا ہونے کے کیا معنی ہیں؟ کیا صرف یہ معنی ہے کہ وہ خالق ہے وہ رازق ہے، وہ محی ہے، وہ ممیت ہے، وہ شافی ہے، وہ اولاد دینے والا ہے، وہ دکھوں کو دور کرنے والا ہے یا اس کا کوئی اور مفہوم بھی ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو صرف ان حیثیتوں سے ماننا یہ کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ ان حیثیتوں کو قبول کرنے کا جو لازمی نتیجہ ہونا چاہیے اسے بھی قبول کیا جائے۔ اس لیے قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

”الا له الخلق والامر

خبردار جس کے لیے خلق ہے اسی کے لیے امر ہے۔ یعنی جو خالق ہے اس کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہی حکمران بھی ہو مخلوق پر صرف اس کے خالق کا حکم چلنا چاہیے۔ دوسرے کسی کا حکم عقل کے بھی خلاف ہے اور فطرت کے بھی

خلاف ہے اور ویسے بھی محض عقل سے اگر سوچا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب آدمی کسی کو اپنا بڑا سمجھتا ہے تو اس کو بڑا سمجھنے کا صرف یہی معنی نہیں ہوتا کہ وہ زبانی حد تک اسے بڑا سمجھ لے بلکہ بڑا ہونے کا یہ مفہوم ہمیشہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ جس کو بڑا سمجھا جائے۔ اسی کے سامنے سر جھکایا جائے، اسی کی بندگی کی جائے، اسی کی اول و آخر اطاعت کی جائے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن کریم بار بار کہتا ہے۔ ”الا لِلّٰہِ الدِّینُ الخالص“

خبردار اے انسانو خالص بندگی صرف اللہ کے لیے ہے یعنی بندگی صرف اللہ کا حق ہے۔ اس کے سوا کسی اور کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ لوگوں سے اپنی بندگی کرائے اور نہ لوگوں کو یہ بات سزاوار ہے کہ وہ کسی اور کی بندگی کریں۔ کیونکہ وہ جس کے بندے ہیں بندگی اسی کی ہونی چاہیے اور وہی ذات ہے جس کو سروری زیب دیتی ہے۔ بقول اقبال:

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

اور پھر مزید ارشاد فرماتا ہے:

”وما اُمِرُوا الّا لیعبدُو اللہَ مُخلصینَ لہُ الدین“

اور لوگوں کو اس کے سوا کسی اور بات کا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ ہی کی بندگی کریں۔ اسی کے لیے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے یعنی صرف یہی نہیں کہ اس کی بندگی کی جائے بلکہ اس کی بندگی میں کسی اور کو شریک بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی زندگی کے جتنے شعبے اور جتنے دوائر ہیں ان تمام شعبوں اور تمام دوائر میں بندگی صرف اسی ایک ذات بے ہمتا کی ہوگی۔ اس میں کسی اور کو شریک کرنا یہ اللہ کی کبریائی اور انسان کی بندگی کے خلاف ہے۔ جس طرح نماز کسی اور کے لیے نہیں پڑھی جاسکتی، زکوٰۃ کسی اور کے لیے نہیں دی جاسکتی، روزہ کسی اور کے لیے نہیں رکھا جاسکتا، حج کسی اور کے لیے نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح معاشرت کے اصول، معیشت کے قواعد، سیاست کے اسالیب، حکومت کے طریقے، قومی اور بین الاقوامی آداب اور اخلاقی اصول کبھی اللہ اور

اس کے رسول کی ہدایت سے ہٹ کر متعین نہیں کیے جاسکتے۔ انسانی زندگی ایک اکائی ہے۔ اس میں دو آقاؤں کی آقائی نہیں چل سکتی۔ اسے تقسیم کر کے مختلف آقاؤں کے حوالے نہیں جاسکتا۔ جس طرح ایک ‘گھڑی’ صرف اپنے پرزوں سے چلتی ہے اگر اس میں سلائی مشین‘ کے پرزے لگا دیئے جائیں تو نہ وہ وقت دے گی نہ کپڑے سیئے گی۔ اس طرح انسان صرف ایک اللہ کی ‘بندگی سے ہی وہ اسلامی زندگی اختیار کر سکتا ہے جو ایک مسلمان کا مطلوب و مقصود ہے۔ اگر اس میں دوئی کو داخل کر دیا جائے گا اور اس میں پیوند کاری کی جائے گی کہ عبادت اللہ کی ہو اور معیشت غیر اللہ کی ہو، دعائیں اللہ سے مانگی جائیں اور معاشرت کے اصول کسی اور کے اختیار کیے جائیں، شادی بیاہ اور مرنے جینے کی رسمیں اللہ کے دین سے لے لی جائیں اور آئین اور قانون کی ساری دفعات کہیں اور سے مستعار لی جائیں تو اس سے ایک عملی نفاق پر مبنی زندگی تو پیدا کی جاسکتی ہے اس زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا جس کے لیے دنیا میں اللہ کے رسول تشریف لائے تھے۔ جس طرح ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنے ملکی قانون کو چیلنج نہیں کر سکتے۔ ہم ضروری سمجھتے ہوئے بھی ملکی قانون کی کسی دفعہ کو توڑنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ بالکل اسی طرح بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر اللہ کا قانون اور اللہ کی آقائی اس بات کا حق رکھتی ہے کہ ہم کسی صورت بھی اسے توڑنے اور چیلنج کرنے کا تصور بھی نہ کر سکیں۔ یہ دو چیزیں ہیں جو انسان کی خود شناسی کا تقاضا ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ اول و آخر ایک بندہ ہے اور دوسری یہ کہ اس کی بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ آقا کو پہچانے اور پھر اپنے اس حقیقی آقا کی پوری طرح اطاعت کرے بلکہ اگر ہم فہم قرآن میں ایک قدم آگے بڑھیں تو قرآن کریم یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ تمہاری بندگی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اگر کہیں تم دیکھو کہ غیر خدا کی بندگی ہو رہی ہے یا اللہ کی بندگی میں آمیزش کی جارہی ہے تو تمہارا یہ فرض ہے کہ تم قوت سے کام لے کر ہر غیر خدا کی بندگی کو ختم کر دو اور تم اس وقت تک لڑائی جاری رکھو جب تک اس زمین پر صرف اللہ کی بندگی قائم نہ ہو جائے۔ فرمایا "قَاتِلُوھُم حتیٰ لَاتَکُونَ فِتنَۃٌ"

وَیَکُونَ الدِّینَ کُلَّہٗ لِلّٰہ"

کہ تم لڑو ان لوگوں سے تاکہ دنیا میں سے فتنہ مٹ جائے اور اطاعت صرف اللہ کی ہو کر رہ جائے۔ مزید فرمایا "ھو الذی ارسل رسولہ بالھدے و دین الحق لیظھوہ علی الدین کلہ"

کہ اللہ وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت دے کر اور دین حق دے کر بھیجا۔ تاکہ وہ اللہ کی اطاعت کو تمام دوسری اطاعتوں پر غالب کر دے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کی بعثت مبارکہ کا مقصد یہ تھا کہ دنیا میں کسی اور کی اطاعت باقی نہ رہے اور اللہ کی اطاعت خالص ہو کر رہ جائے۔ یہ ہے انسان کا وہ حقیقی مقصد جو اسے دنیا میں حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ اسی کو پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے عبادات کو مقرر فرمایا۔ نماز اس لیے فرض کی گئی تاکہ وہ دن کے مختلف اوقات میں انسان کو اللہ سے تجدید عہد اور بندگی کے اقرار پر آمادہ کرتی رہے۔ چنانچہ دن میں پانچ دفعہ نماز ایک بندے کو اس کی مصروفیات سے نکال کر مسجد میں لاتی ہے اور بار بار اس کو یہ احساس دلاتی ہے کہ دیکھو تم اللہ کے بندے ہو اپنے مالک کو بھول نہ جانا اور اپنی بندگی کو نظروں سے کبھی اوجھل نہ ہونے دینا۔ لیکن یہ یاددہانی چونکہ ایک محدود وقت کے لیے ہوتی ہے اس لیے اس بات کا اندیشہ ہو سکتا ہے کہ شاید دل و دماغ میں پوری طرح جگہ نہ بنا سکے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے پورے ایک مہینے کے روزے فرض فرمائے اور ان روزوں کے ذریعے اپنے بندے سے مسلسل 720 گھنٹے تک ایک ایکسرسائز اور قوائد کرائی گئی تاکہ اس طریقے سے اس کی بندگی کا اور اللہ کی اطاعت کا تصور پوری طرح اس کے دل و دماغ میں راسخ ہو جائے۔ اندازہ فرمائیے کہ وہ اشیائے خورد و نوش اور میاں بیوی کا جائز تعلق جو سال کے گیارہ مہینوں میں ہر طرح اس کے لیے حلال اور مباح ہے۔ رمضان المبارک کے مہینے میں آکر اس کے لیے حرام ہو جاتا ہے۔ جیسے ہی فجر طلوع ہوتی ہے اس وقت سے لے کر غروب آفتاب تک اس کے سامنے نعمتوں کے ڈھیر لگے رہتے ہیں، مگر کبھی اس کا ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھتا، پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ جاتے ہیں مگر وہ

پانی کا ایک گھونٹ گلے سے نیچے نہیں اتارتا اور پھر کوئی اسے دیکھنے والا نہیں ہوتا وہ تنہائی میں ممنوعہ چیزوں میں سے جس چیز سے چاہے تمتع کر سکتا ہے۔ کوئی نگاہ اسے دیکھنے والی نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود وہ کوئی ایسا کام کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتا جس سے اس کا روزہ ٹوٹ سکتا ہو۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ اگر ایک آدمی نے محض عادت کے تحت بلا سوچے سمجھے روزہ نہیں رکھا بلکہ پورے شعور کے ساتھ اللہ کی اطاعت کا حق ادا کرنے کے لیے روزہ رکھا ہے اور وہ اس طرح پورا ایک مہینہ اس اطاعت کی مشق جاری رکھتا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کے دل و دماغ میں بلکہ اس کی ہر رگ و ریشہ میں اللہ کی اطاعت سما نہ جائے۔ وہ باقی گیارہ مہینوں میں بھی جب کسی غلط کام کی طرف ہاتھ بڑھائے گا یا قدم اٹھائے گا یا دل میں خیال بھی لائے گا تو اللہ کی اطاعت کا یہ تصور اور خدا کی برتری اور کبریائی کا یہ عقیدہ اسے بار بار روکے گا کہ دیکھو تم غلط کام کر رہے ہو اور پھر صرف یہی نہیں کہ ایک روزہ دار کو کھانے پینے اور مباشرت سے روکا گیا ہے اور اسی کی پورا مہینہ مشق کرائی ہے بلکہ قرآن کریم اور آنحضرت ﷺ نے بھی واضح طور پر پوری زندگی کو اللہ کی معصیت سے پاک کر دینا روزے کا مقصد ٹھہرایا ہے۔ اور جو آدمی صرف کھانے پینے اور مباشرت سے پرہیز کرتا ہے لیکن باقی زندگی کے معاملات میں خلاف شریعت امور سے اجتناب نہیں کرتا۔ تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس نے ناحق بھوک پیاس کی تکلیف برداشت کی۔ اللہ کو ایسے روزے دار کے روزے کی ضرورت نہیں۔ فرمایا "مَن لَّم یَدَع قَولَ الزُّورِ والعَمَلَ بِہٖ فَلَیسَ لِلّٰہِ حَاجَۃٌ فِی اَن یَّدَعَ طَعَامَہٗ و شرابَہٗ"

کہ جس آدمی نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا اللہ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔ یہاں جھوٹ پر عمل کرنا) یہ قابل توجہ ہے۔ اس سے مراد ہے زندگی کے کسی مرحلے میں بھی خلاف شریعت امور پر عمل کرنا چاہے وہ مرحلہ ملازمت سے تعلق رکھتا ہو یا تجارت سے وہ انفرادی ہو یا اجتماعی اس کا تعلق سیاست سے ہو یا عدالت سے

محکومیت سے ہو یا حاکمیت سے جہاں بھی وہ خلاف شریعت امور کو اختیار کرے گا اس نے گویا جھوٹی زندگی کو اختیار کرلیا۔ اس سے اجتناب کرنا روزے کا اصل مقصد ہے۔ آنحضرت ﷺ نے مزید فرمایا ”کم مِنْ صَائِمٍ فَلَیسَ له مِن صیامِه الا الظَمَأَ وکم من قَائِم فلیسَ لَه من قِیامه السَّهر“

کہ کتنے ایسے روزے دار ہیں جن کو روزے سے سوائے بھوک پیاس کے اور کچھ نہیں ملتا اور کتنے ایسے شب زندہ دار ہیں جن کو رتجگے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اس طرح جب ایک روزہ دار اپنی پوری زندگی کو اللہ کی اطاعت و حاکمیت میں دے دیتا ہے کہ طلوع سحر سے غروب آفتاب تک باوجود یکہ اس کے سامنے متنوع اور مرغن نعمتیں موجود ہیں لیکن صرف اس لیے اس کا ہاتھ ان کی طرف نہیں بڑھتا کیونکہ اس کے مالک نے اسے ان نعمتوں کی طرف ہاتھ بڑھانے سے روک دیا ہے۔ اس کی نوجوان اور خوبصورت بیوی اس کے پاس موجود ہے لیکن وہ اسے چھونا تو درکنار اپنے دل و دماغ کو بھی جنسی جذبات سے صرف اس لیے محفوظ رکھتا ہے کیونکہ اس کا آقا اس کے سینے کے جذبات سے واقف ہے اور آج اس نے ان جائز جذبات پر بھی قدغن عائد کر دی ہے۔ اس کی زبان ہر قسم کی بدگوئی دل آزاری اور غیبت سے مجتنب ہے کیونکہ وہ روزے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور پھر جیسے ہی غروب آفتاب کا اعلان ہوتا ہے تو یہ بند قفل کھل جاتا ہے اب یہ روزہ دار نیکی کے جذبے سے بھی اگر چاہے تو کھانے پینے سے نہیں رکتا کیونکہ اب اس کے مالک نے افطار کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ گویا یہ ایک کٹ پتلی یا مشین ہے جسے حرکت دینے والی تار اس کے اللہ کے ہاتھ میں ہے یہ اس کے ہلانے سے حرکت میں آتا ہے اور روکنے سے رک جاتا ہے۔ اس طرح مسلسل 720 گھنٹے ایک روزہ دار اپنی عبدیت و عبادت اور اللہ کی حاکمیت و اطاعت کی مشق کرتا ہے تاکہ وہ اس احساس بندگی سے سرشار ہو کر اپنے ارادہ و اختیار کو لگام دینے اور زندگی کے ہر معاملے کو اللہ کے سپرد کرنے اور اسی کی اطاعت میں بسر کرنے کے قابل ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ عبادت و اطاعت کی اس مشق کے بعد (جو مکمل

ایک ماہ جاری رہتی ہے) جب وہ چاند دیکھتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان پر ایک ترانہ جاری ہو جاتا ہے اور جب صبح کو وہ نماز عید کے لیے عید گاہ کی طرف بڑھتا ہے تب بھی یہی ترانہ اس کے لبوں پر ہوتا ہے پھر جب اپنے گھر کو لوٹتا ہے تو راستہ بدل کر یہی نغمہ الاپتا ہوا جاتا ہے گلی کوچے اس نغمے سے گونج اٹھتے ہیں اور سینے حوصلوں اور ولولوں سے معمور ہو جاتے ہیں۔ وہ نغمہ اور ترانہ کیا ہے وہ ہے اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر لا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر وللّٰہ الحمد اللہ سب سے بڑا ہے اللہ سب سے بڑا ہے اللہ کے سوا کوئی معبود برحق اور حاکم حقیقی نہیں اللہ سب سے بڑا ہے اور ہر طرح کی تعریف اللہ ہی کو زیب دیتی ہے۔ یہ ہے مفہوم "لتکبر اللّٰہ علی ما ھداکم" کا یعنی ہم نے روزہ اس لیے فرض کیا تاکہ تم اللہ کو ہی کو بڑا سمجھو اور اسی کی بڑائی کرو جس طرح اس نے (اپنی کتاب کے ذریعہ) تمہیں رہنمائی فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی عظمت اور کبریائی کے استحضار سے ایک روزہ دار کے اندر بالآخر ایک صلاحیت پیدا ہونے کی امید کی جاسکتی ہے جس کے بارہ یہاں ارشاد فرمایا گیا "لعلکم تشکرون" شاید تم شکر گذار بن جاؤ یعنی امید کی جاسکتی ہے کہ اس مسلسل محنت اور مداومت سے تمہارے اندر شکر کی صفت پیدا ہو جائے۔

شکر وہ بلند ترین صفت ہے جس کا پیدا کیا جانا اسلامی عبادات کے مقاصد میں سے ایک بلند تر مقصد ہے اسی کی ضد کفر ہے جو ایک انسان کے لیے قبیح ترین اور عند اللہ مبغوض و مردود صفت ہے۔ یہ دونوں صفات دراصل انسان کے دو بنیادی رویے ہیں۔ جو اس کی فطرت کا تقاضہ بھی ہیں اور اس کی طبیعت کا خاصہ بھی۔ اسی لیے ارشاد فرمایا گیا "انا ھدیناہ السبیل اما شاکرا واما کفورا ہم نے انسان کو راستہ بتا دیا (اب وہ) شکر گذار ہے یا ناشکر گذار (کافر) شکر گذاری کا رویہ ایک مومن کی حقیقی منزل ہے۔

شکر کا معنی لغت میں یہ ہیں کہ جانور میں تھوڑا سا چارہ ملنے پر تروتازگی پوری ہو اور دودھ زیادہ دے۔ اس سے انسانوں کے محاورہ میں یہ معنی پیدا

ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کر دے تو دوسرا اس کی پوری قدر کرے۔ اس مفہوم پر غور کرنے سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں 1- شکر ایک ایسا رویہ ہے جس میں ضروریات زندگی کی تقلیل اور مقاصد کی تکمیل پیش نظر ہوتی ہے امیدیں قلیل ہوتی ہیں اور مقاصد جلیل ہوتے ہیں۔ آدمی خواہشات کا پتلا نہیں بلکہ اولوالعزمیوں کا پیکر ہوتا ہے۔ صحابہ کرام جس کی عملی تصویر تھے۔ بقول اقبال:

؎ ان کی امیدیں قلیل ان کے مقاصد جلیل
ان کی ادا دلفریب ان کی نگہ دلنواز

اسے ناآسودہ آرزوئیں پریشان نہیں کرتیں بلکہ حرص و طمع سے دور وہ ایک سمٹ کر رہنے والا انسان ہوتا ہے۔ اسے اپنے دل کی خواہشات اور اپنے دماغ کی اڑان گھاٹیوں پر اس طرح قابو ہوتا ہے کہ یہ عوامل اس سے غلط کام کروانے پر قادر نہیں ہوتے۔ وہ اپنے نفسانی تقاضوں اور جسمانی قوتوں پر اس طرح حاوی ہوتا ہے کہ ان سے اپنے مطلوبہ مقاصد میں حسب ارادہ کام لینے کی قدرت رکھتا ہے جسم اس سے اپنی ضروریات کے لیے درخواست کرتا ہے حکم نہیں دے سکتا۔ یہ شخص اپنی مرضی سے جس درخواست کو چاہتا ہے قبول کرلیتا ہے جسے چاہتا ہے رد کر دیتا ہے۔ عام مروج اسلوب میں کہہ لیجئے کہ اسے ضبط نفس حاصل ہوتا ہے لیکن یہ ضبط نفس ایسا نہیں جو اسے فرعون یا ہٹلر بنا دے۔ کیونکہ شکر کے تصور میں ایک دوسری حقیقت بھی شامل ہے وہ یہ ہے کہ ایسا شخص اپنے منعم حقیقی اور اپنے محسن اصلی کو پہچانتا ہے وہ اس کے احسانات و انعامات کی قدر و قیمت سے بھی آگاہ ہے وہ اپنی جان لڑا کر اور اپنی توانائیاں کھپا کر ان احسانات و انعامات کا حق ادا کرنا چاہتا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا انعام و احسان بھی اپنی قدر و منزلت میں بے مثال و بے پناہ ہے اور وہ خود اپنی ساری توانائیوں اور وجاہتوں سمیت ایک ذرۂ بے مقدار ہے۔ وہ ضبط نفس کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی ضروریات کو کفایت و تقلیل کی زنجیر پہناتا اور اپنی خواہشات کو حدود اللہ میں محدود کر دیتا ہے لیکن ساتھ ہی

اپنے منعم حقیقی کو پہچانتے ہوئے اپنی تمام صلاحیتوں کو احسان شناسی اور قدر شناسی میں صرف کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ ایک عابد و شاکر بندہ بننے کی کوشش کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تین عظیم نعمتوں سے نوازا ہے۔ 1 دل 2- زبان 3- اعضاء و جوارح۔ وہ ان تینوں کو اس کی قدر شناسی یعنی شکر گزاری میں استعمال کرتا ہے۔ دل میں اسی کی قدر شناسی کا جذبہ موجزن ہے۔ زبان اسی کے احسانات کے اقرار و اعتراف اور اسی منعم کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہے اور اعضاء و جوارح اسی کے نام کی سربلندی اسی کے پیغام کی نشر و اشاعت اور اسی کے بندوں کی خدمت میں مصروف ہیں۔ روزے کی مسلسل مشق اس کے اندر اسی کے شکر کے جذبے کو ابھارتی ہے۔ اس کے اندر ایک طرف ضبط نفس کو پیدا کر کے جسمانی تقاضوں اور نفسانی خواہشات کو کمزور کرتی ہے۔ دوسری طرف منعم حقیقی سے گہرا تعلق اور وارفتگی پیدا کر کے مقاصد حیات کو سہل کر دیتی ہے۔ ممکن ہے یہ خیال پیدا ہو کہ روزہ نے صرف طلوع فجر سے غروب آفتاب تک صرف کھانے پینے اور مباشرت سے روکا ہے حالانکہ ضروریات صرف یہیں تک تو محدود نہیں اور اتنی سی پابندی سے ضبط نفس کہاں پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ جسم کے بنیادی تقاضے تین ہی ہیں۔

1- غذا جو زندہ رہنے اور بقائے جسم کے لیے ضروری ہے۔ 2- جنسی طلب جو بقائے نوع کے لیے ضروری ہے۔ 3- آرام جو قوت کارکردگی کی بحالی کے لیے ضروری ہے۔ روزے نے انہیں تینوں کو کمزور بلکہ حدود میں محدود کرنے کا کام کیا ہے۔ وہ دن کو کھانے پینے اور مباشرت پر پابندی لگا کر ان پر قابو پانا سکھاتا ہے اور رات کو قیام لیل کا حکم دے کر آرام و راحت کی طلب کو محدود کرتا ہے۔ کیونکہ درحقیقت یہی تینوں بنیادی مطالبے ہیں جو بڑھ کر اور اپنی حدود سے نکل کر خواہشات و مرغوبات کا ایک جہان پیدا کر دیتے ہیں۔ زمام اقتدار پھر انسان کے اپنے ہاتھ میں نہیں رہتی بلکہ جسم اور اس کے بہیمانہ

تقاضوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے اور انسان بالکل بے قابو ہو کر خواہش نفس اور لذت پسندی کے دھارے میں بہتا چلا جاتا ہے۔ وہ آوارہ مویشیوں کی طرح ہر جگہ منہ مارتا ہے اس کو کھانے پینے اور خواہشات نفس پوری کرنے کا جنون ہو جاتا ہے وہ اس لیے نہیں کھاتا پیتا تاکہ زندہ رہے بلکہ وہ زندہ اس لیے ہے تاکہ کھاتا پیتا رہے بقول شیخ سعدی:

؎ خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است
تو معتقد کہ زیستن از بہرِ خوردن است

وہ اپنی ذہانت و فطانت بھی اسی خدمت میں لگا دیتا ہے تاکہ آئے روز اشیائے خورد و نوش میں نئی سے نئی اختراع کی جا سکے۔ اس کی تمام تر صلاحیت کھانوں کو زیادہ سے زیادہ لذیذ پر تکلف اور متنوع بنانے میں صرف ہونے لگتی ہے۔ وہ ہاضم دواؤں اور بھوک کھولنے والے مشروبات ایجاد کرتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ کھانے اور جلد سے جلد ہضم کرنے کا موقع مل سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی ساری ترقی و توانائی کے باوجود اور مادی خوشحالی کی اس بلند ترین سطح پر ہوتے ہوئے بھی کولہو کے بیل اور زمین جوتنے والے جانور کی طرح ہو جاتا ہے اور اس کا دائرہ عمل صرف دو چیزوں کے درمیان محدود ہو کر رہ جاتا ہے یعنی کھانے کے کمرے (ڈائننگ ہال) اور بیت الخلاء۔ وہ ان دونوں کے سوا کسی اور مبداء و معاد سے ناواقف اور اس طواف کے سوا کسی اور طواف و سعی سے ناآشنا رہتا ہے کھانے پینے کی خواہش کے سوا اس میں ہر چیز کی خواہش مر جاتی ہے اور آرام طلبی اور عیش پرستی کی حس کے سوا ہر حس کند ہو جاتی ہے اس کی تمام فکریں صرف اسی ایک فکر میں ڈھل جاتی ہیں۔ قرآن مجید نے انسانوں کے اس طبقہ یا انسان نما جانوروں کے اس ریوڑ کی جو معجزانہ تصویر کھینچی ہے اس سے سچی اور نادر تصویر ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ کہتا ہے ”وَالَّذِین کَفَرُوا یَتَمَتَّعُونَ وَیَاکُلُونَ کَمَا تَاکُلُ الانعامُ وَالنَّار مثویً لھم“ جو کافر ہیں وہ عیش کر رہے ہیں اور کھا پی رہے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے پیتے ہیں آگ ہی ان کا ٹھکانہ ہے۔ یہ صورت حال یقیناً ایک کافر کو ہی زیب دیتی ہے جو

صرف دنیا اور دنیوی عیش و عشرت کے سوا کسی بلند تر زندگی کا تصور نہیں کر سکتا۔ مگر وہ قوم جو دنیا کو ایک دارالعمل اور یہاں کی زندگی کو ایک مہلت عمل سمجھتی ہو جو صرف ضروریات کے لیے نہیں بلکہ ارفع و اعلیٰ مقاصد حیات کے لیے زندہ ہو جسکی تگ و تاز کے لیے دنیا ایک تنگنائے سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی ہو جو آخرت کے لیے اور اسی کے تصور میں جیتی اور مرتی ہو اور جو صرف اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے اٹھائی گئی ہو اور جس کی پوری تاریخ اولو العزمیوں جفاکوشیوں وفا شعاریوں اور جانسپاریوں سے عبارت ہو۔ وہ یقیناً ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اس لیے روزہ کے ذریعے ایسی چیزوں پر پابندی لگا کر جو انجام کار دل کی موت اور شکم و معدہ کی لامحدود سلطنت پر منتج ہوتی ہیں ایک ایسی زندگی کی تعمیر کا سامان کیا جو عبادت و عبدیت کے تصور سے بہرہ ور اللہ کی کبریائی کی حقیقت سے آشنا اور ادائے شکر پر مستعد ہو یعنی جس قوم کا ہر فرد عبادت کے واسطے سے اپنی عبدیت سے آگاہ ہو۔ "لتکبرو اللہ علی ما ھداکم" کی حقیقت سے واقف ہو اور لعلکم تشکرون" پر عمل کے نتیجے میں ضبط نفس کی صلاحیت پیدا کر کے اللہ ہی کی اطاعت و بندگی کا خوگر ہو۔

# روزہ کا ایک مقصد تقویٰ بھی ہے

”یاایھاالذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون“

بزرگو بھائیو اور عزیزو!

گزشتہ دو تقریروں میں مقاصد تخلیق کو بروئے کار لانے میں روزہ کا کردار اور خود شناسی اور خدا شناسی کی صفات پیدا کرنے کے ضمن میں اللہ کی کبریائی اور اس کے شکر کی تفصیل آپ نے سماعت فرمائی۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک مومن اور مسلم کے لیے تین چیزیں درکار ہیں۔

1- دل میں صرف اللہ کا خوف اور اسی کی محبت 2- صرف اسی کی اطاعت 3- اس کی خلافت کا حق ادا کرنے کے لیے اسی کے نام و پیغام کی بالادستی نشرو اشاعت اور اجتماعی زندگی میں اس کے نفاذ کا احساس۔

عبادت سے خود شناسی اور خدا شناسی کا تصور دیا گیا۔ روزہ سے انہیں احساسات کو توانائی فراہم کرنے کے لیے تکبیر و شکر کے ذریعے قلب انسانی کو اس کا مرکز بنا دیا گیا۔ اب ضرورت تھی کہ روزہ کے حوالے سے ایک ایسی حکمت واشگاف کی جاتی جو ان تینوں ضرورتوں کی جامع ہوتی۔ چنانچہ اس کے لیے تقویٰ کو ذکر فرمایا گیا۔ ارشاد ہوا ”یاایھاالذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون“ مسلمانو! تم پر روزے فرض کئے گئے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے۔ توقع ہے کہ تم تقویٰ اختیار کرو گے۔ تقویٰ اصل میں وقویٰ ہے عربی زبان میں اس

کے لغوی معنی بچنے' پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح شریعت میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیرو شکر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بناء پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بات کہ تقویٰ اصل میں دل کی اس کیفیت کا نام ہے۔ قرآن پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے۔ "ومن یّعظّم شعائر اللّٰہ فانہا مِن تَقوی القلوب" اور جو شعائر الٰہی کی تعظیم کرتا ہے تو وہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔ اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کا اصل تعلق دل سے ہے۔ یعنی یہ ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جو دلوں میں امور خیر کی تحریک پیدا کرتی اور شعائر الٰہی کی تعظیم سے ان کو معمور کرتی ہے۔

تقویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ دل کی خاص کیفیت کا نام ہے ایک صحیح حدیث سے تصریحاً ثابت ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "التقویٰ ھھنا" اور یہ کہہ کر دل کی طرف اشارہ فرمایا۔ اس سے یقیناً یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ دل کی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے جو تمام نیکیوں کی محرک ہے۔ اس کی بہترین تفسیر وہ ہے جو حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا تقویٰ کسے کہتے ہیں۔ انہوں نے عرض کیا۔ امیرالمومنین آپ کو کبھی ایسے راستے سے گذرنے کا اتفاق ہوا ہے جس کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں اور راستہ تنگ ہو؟ حضرت عمر نے فرمایا۔ بارہا انہوں نے پوچھا تو ایسے موقع پر آپ کیا کرتے ہیں؟ حضرت عمر نے جواب دیا۔ میں دامن سمیٹ لیتا ہوں اور بچتا ہوا چلتا ہوں کہ کانٹے دامن میں الجھ کر اسے تار تار نہ کر دیں۔ حضرت ابی نے کہا "بس اسی کا نام تقویٰ ہے۔" زندگی کا یہ راستہ جس پر انسان سفر کر رہا ہے دونوں طرف افراط و تفریط خواہشات اور میلانات نفس' وساوس اور ترغیبات

گمراہیوں اور نافرمانیوں کی خاردار جھاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس راستہ پر کانٹوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے چلنا اور اطاعت حق کی راہ سے ہٹ کر بد اندیشی و بد کرداری کی جھاڑیوں میں نہ الجھنا۔ یہی تقویٰ ہے اور یہی تقویٰ پیدا کرنے کے لیے روزہ فرض کیا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باقی عبادات بھی تو قرآن کریم کی تصریح کے مطابق تقویٰ پیدا کرنے کے لیے ہی فرض کی گئی ہیں۔ پھر روزہ کی اس حوالے سے کیا خصوصیت ہے۔ اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہیں۔ پہلی یہ کہ ابھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ انسان زندگی کی جس شاہراہ پر سفر کر رہا ہے وہ قدم قدم پر خواہشات و ترغیبات اور افراط و تفریط کے وساوس کے کانٹوں سے اٹا پڑا ہے۔ اپنے دل و دماغ اور دامن اطاعت کو ان کانٹوں سے بچا کر نکلنا کس قدر مشکل کام ہے اس لیے ضروری ہے کہ دل یعنی ضمیر کی بیداری کے لیے تمام ممکن عوامل سے کام لیا جائے اس لیے تمام عبادات سمیت روزے کو بھی اسی قلبی بیداری یعنی تقویٰ پیدا کرنے کے لیے لگا دیا۔ دوسری بات یہ سامنے رہنی چاہیے کہ اگرچہ دوسری عبادات کا منتہائے مقصود بھی یہی تقویٰ ہے بلکہ پورے دین و شریعت کی روح بھی یہی ہے مگر روزہ اپنی اثر اندازی اور نتیجہ خیزی میں ان سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اسی لیے شاید پروردگار نے روزہ کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے۔ فرمایا' الصوم لی و انا اجزی بہ روزہ خاص میرے لیے ہے۔ حالانکہ نماز زکوٰۃ حج قربانی بلکہ ہر نیکی جس کا پروردگار نے حکم دیا ہے سب اسی کے لیے ہے۔ اسی کی اطاعت میں اور اسی کی رضا و خوشنودی کے لیے اسے روبعمل لایا جاتا ہے لیکن کسی نیکی کی نسبت پروردگار نے اس طرح اپنی طرف نہیں فرمائی۔ وجہ ظاہر ہے کہ باقی تمام عبادات اور تمام نیک اعمال یقیناً تقویٰ ہی پیدا کرتے ہیں مگر روزہ اس معاملے میں ان سے بدرجہا فائق ہے کیونکہ تمام عبادات اپنے اندر ایک اجتماعی صورت رکھتی ہیں۔ نماز جماعت کی پابندی کا تقاضا کرتی ہے اموال ظاہرہ میں زکوٰۃ کی مسنون صورت بیت المال کی پابندی کے ساتھ اجتماعی ہے اور اموال باطنہ میں بھی زکوٰۃ وصول کرنے والا تو بہرحال جانتا ہے حج تو ایک شہرت عام اور ابتلائے

ہمام والی عبادت ہے اس لیے ان تمام عبادات میں بندے کی اپنے رب سے خصوصی تعلق کی حالت میں شکست و ریخت کے پیدا ہو جانے کا ہر وقت اندیشہ ہے اور اس بات کا ہر وقت امکان ہے کہ دکھاوے اور ریاکاری کے چھینٹے صفائے قلب کو گدلا کر دیں۔ ایک عابد و زاہد اپنی قلبی حالت پر مطمئن ہوتا ہے مگر اچانک خبر ہوتی ہے کہ اندر ہی اندر نیکی کی شہرت کی حرص اور حصول منفعت کی ہوس اپنا کام دکھا چکی ہے۔ کیونکہ:

براہمی نظر پیدا بڑی مشکل سے ہوتی ہے
ہوس سینے میں چھپ چھپ کر بنا لیتی ہے تصویریں

مگر روزہ اس لحاظ سے ایک منفرد عبادت ہے کہ اس میں دکھاوے ریاکاری اور ظاہر داری کا امکان بہت کم ہے۔ ایک آدمی کے روزے دار ہونے یا نہ ہونے کی بظاہر کوئی علامت نہیں ہوتی۔ اس کے ایسے کوئی ظاہری اعمال نہیں جس سے دیکھنے والے کو ایک روزے دار کے روزے کا احساس ہو۔ یہ خالصتا بندے اور اس کے رب کا معاملہ ہے روزہ دار اپنے مالک کی رضا کے لیے بھوکا پیاسا رہتا ہے اور دل ہی دل میں اس سے لو لگائے کاروبار زندگی میں مصروف رہتا ہے اور صرف اس کا مالک اس کے دل کی کیفیت سے واقف اور اس کے روزے سے آگاہ ہے۔ اس لیے جس قدر صفائے دل بیداری قلب اور تعلق باللہ کے امکانات یہاں ہیں وہ دوسری عبادات میں نہیں ہو سکتے۔ اس لیے روزے کی نسبت بطور خاص اپنی طرف فرمائی اور خصوصی اجر و ثواب کی امید بھی دلائی۔ فرمایا وانا اجزی بہ اور میں خود اس کا بدلہ دوں گا۔ حالانکہ ہر نیکی کا بدلہ اللہ تعالیٰ خود ہی دیتے ہیں۔ لیکن یہاں بطور خاص اپنی طرف نسبت فرما کر اجر و ثواب میں افزونی اور اظہار خوشنودی کا سامان بھی کر دیا۔

اسی حدیث کو اگر ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو روزے کی اہمیت و عظمت اور اس کی صفت تقویٰ میں ہزار در ہزار چند اضافہ ہو جاتا ہے وہ پہلو یہ ہے کہ متذکرہ حدیث کو اس طرح پڑھا جائے اور الفاظ میں اس کی گنجائش بھی

ہے۔ اَلصَّوم لی "و انا اَجزی بہ" روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں خود اس کی جزا ہوں۔ یعنی ایک روزہ دار روزہ اجر و ثواب کے لیے نہیں بلکہ اللہ کے لیے رکھتا ہے یعنی اس کا مطلوب و مقصود اس کا رب ہے جبکہ باقی تمام اعمال اجر و ثواب کی امید میں کئے جاتے ہیں اور حصول جنت کو منتہائے مقصود بنالیا جاتا ہے اور وہ صحیح بھی ہے کیونکہ خود پروردگار کا ارشاد ہے "وسارعوا الی مغفرۃٍ من ربّکم وجنّۃٍ عرضہا السّمٰوٰت والارض" اور تیزی سے بڑھو اپنے رب کی مغفرت اور بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کا عرض آسمان اور زمین ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ جنت اسی کو ملے گی جس سے اللہ راضی ہوگا۔ لیکن یہاں سوال ہدف کی بلندی اور منتہائے مقصود کے ارفع و اعلیٰ ہونے کا ہے۔ روزہ اپنے رکھنے والے کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ تمہارا دل اپنے آقا و مالک کی محبت سے اس طرح لبریز ہو جانا چاہیے کہ کسی اور کے لیے اس میں گنجائش نہ رہے۔ حتی کہ جنت کے لیے بھی نہیں۔ یا یہ کہ تمہارا دل اپنے رب کے لیے ہر چیز بلکہ ہر تمنا سے بھی خالی ہو جائے اور اس کا دروازہ ہر خواہش کے لیے بند ہو جائے۔ اور پھر تم کہہ سکو:

؎ ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ایسی صورت میں میں خود اس کی جزاء ہوں یعنی جو میری طلب میں دو عالم سے بیگانہ ہو کر میرے آستانے پر آپڑا ہے میں اسے اپنا لیتا ہوں اسے اس حد تک نواز دیتا ہوں کہ اس کی محبت کا صلہ محبت سے دیتا ہوں۔ "واللہ یحب المتقین" وہ صرف مجھ ہی سے محبت کرتا ہے تو میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ ظاہر ہے اس کے بعد اور کیا رہ جاتا ہے جس کی ایک آدمی تمنا کرے۔"

؎ سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

اس طرح روزہ روزے دار کو صفائے دل اور قلبی بیداری کے اس

مقام پر فائز کر دیتا ہے جس میں کسی اور کے لیے گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس کا وجود اللہ کی محبت، ہیبت اور عظمت میں اس حد تک ڈوب جاتا ہے کہ اس کے لیے مرغوبات نفس میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی۔ اس کی بھوک کی بڑھتی ہوئی آنچ اور پیاس سے حلق میں اُگتے ہوئے کانٹے اور خواہش نفس کی سلگتی ہوئی آگ کے شعلے بجائے اس پر غالب آنے کے محبت خداوندی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں اس کے اندر ایک مضبوط کردار جنم لیتا ہے۔ جس کے اہداف واضح منزل متعین اور راہ سفر معلوم ہے۔ وہ اس دنیا کو منزل نہیں گزرگاہ سمجھتا ہے وہ اسے مطلوب و مقصود نہیں مہلت عمل خیال کرتا ہے۔ وہ دولت دنیا کو مقصد نہیں ضرورت سمجھ کر بقدر ضرورت اور بوقت ضرورت استعمال کرتا ہے مال و دولت کو امانت سمجھ کر اس کے صحیح مصارف میں خرچ کرتا ہے۔ اپنے آپ کو مادر پدر آزاد نہیں بلکہ ایک بالا تر حکمران کا تابع اور اس کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے جو عالم الغیب والشہادہ ہے۔ وہ اپنے اعمال کو لا حاصل نہیں بلکہ آخرت کا سرمایہ جانتا ہے۔ وہ مادی فائدوں کے مقابلہ میں اخلاقی و روحانی فضائل کو زیادہ قیمتی سمجھتا ہے اور مادی نقصانات کی بہ نسبت اخلاقی و روحانی نقصانات کو شدید تر خیال کرتا ہے مختصر یہ کہ روزہ کے نتیجے میں انسان کے اندر ایک نیا انسان وجود میں آتا ہے۔ جس کا ایک مخصوص طرز خیال طرز عمل اور ایک مخصوص رویہ سامنے آتا ہے جسے قرآن کریم نے اپنی معجزانہ شان کے ساتھ نہایت اختصار کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور اس کے حاملین کو متقی کے نام سے موسوم فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "لیس البرّ ان تولّوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولٰکنّ البرّ من آمن باللہ والیوم الاخر والملائکۃ والکتاب والنبین وآتی المال علی حبّہ ذوی القربٰی والیتامٰی والمساکین و ابن السبیل والسائلین و فی الرقاب و اقام الصلوٰۃ و آتی الزکوٰۃ والموفون بعھدھم ازا عاھدوا والصابرین فی الباساء والضراء و حین الباس اولٰئک الذین صدقوا و اولٰئک ھم المتقون

ترجمہ : خدا کے ساتھ وفاداری محض یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف رخ کرلو بلکہ وفاداری ان کی وفاداری ہے جو اللہ پر یوم آخرت پر فرشتوں پر کتاب پر اور نبیوں پر صدق دل سے ایمان لائیں اور اپنے مال' اس کی محبت کے باوجود' قرابت داروں' یتیموں' مسکینوں' مسافروں' سائلوں اور گردنیں چھڑانے پر خرچ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ جب معاہدہ کر بیٹھیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہوں خاص کر وہ لوگ جو فقرو فاقہ تکالیف جسمانی اور جنگ کے اوقات میں ثابت قدم رہنے والے ہوں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے راست بازی دکھائی اور یہی لوگ ہیں جو سچے متقی ہیں۔

یہاں غور فرمائیں متقی کن لوگوں کو کہا گیا ہے وہ لوگ جو زبانی حد تک نہیں بلکہ قلب و ضمیر کی پوری آمادگی اور یقین و ایقان کی پوری قوت کے ساتھ اللہ پر یوم آخرت پر فرشتوں پر کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لائیں اور پھر عبادات بطور خاص روزہ کے ذریعہ قلب و ضمیر میں ان حقائق اور صداقتوں کو اس طرح اتار چکے ہوں کہ وہ ان کی شناخت اور عنوان بن جائیں۔ ان کی زندگی کے تمام معاملات اور فیصلوں پر یہ چھاپ اس قدر گہری ہو کہ اس سے ایک مضبوط کردار اور سیرت بلکہ زندگی کا رویہ وجود میں آئے جس کے عنوانات تعلق باللہ آخرت میں جواب دہی کا احساس فرشتوں اور کتاب کی صداقت کا یقین اور نبی کی زندگی اسوۂ حسنہ اور واجب الاطاعت ہو۔ متذکرہ آیت کریمہ کی روشنی میں نہایت اجمال کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اللہ کے ساتھ حقیقی تعلق اور اس سے وفاداری محض چند ظاہری علامات اختیار کرنے کا نام نہیں اور نہ محض چند صداقتوں کے برائے نام اقرار کا نام ہے۔ کیونکہ محض زبانی جمع خرچ کسی مضبوط سیرت و کردار کی بنیاد نہیں بن سکتا اور اگر ایسی ناپختہ بنیاد یعنی محض زبانی اقرار و اعتراف (جس میں دل و دماغ کی تائید و اطمینان اور جذبہ راسخہ شامل نہ ہو) پر کوئی عمارت اٹھادی جائے تو وہ کبھی دیرپا اور پائیدار نہیں ہوسکتی۔ بقول اکبر مرحوم:

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

اس لیے اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ سے وفاداری اور حقیقی تعلق کے لیے سب سے پہلے ایمانیات کو ذکر فرمایا گیا۔ جن کی تفصیل و ترتیب اختصار کے ساتھ یہ ہے۔

1- اللہ پر ایمان۔ یعنی اللہ کے ایک ہونے اور اس کے ذات و صفات اور حقوق میں ہر طرح کے شرک یا شائبہ شرک سے بھی پاک ہونے پر ایمان اور اس بات پر ایمان کہ اس کی اطاعت سب پر غالب اور اس کا دیا ہوا ضابطہ حیات سب پر بالا اور سب کے لیے لازم ہے۔

2- آخرت پر ایمان۔ یعنی اس بات کا یقین کہ مرنے کے بعد جی کے اٹھنا ہے اپنے ہر قول و فعل کی اللہ کے سامنے جوابدہی کرنا ہے اور آخرت ہی کی کامیابی اصل کامیابی ہے۔ دنیا دارالعمل اور مہلت عمل ہے اور آخرت دارالجزاء اور تا ابد قرار گاہ ہے۔

3- فرشتوں پر ایمان۔ یعنی فرشتے اللہ کی مخلوق ہیں وہ اپنی ایک ہستی رکھتے ہیں اللہ نے ان کو معصوم اور قدسی صفت بنایا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے ہدایت لانے والے امین اور معتمد ہیں۔ قضاء و قدر کے فیصلوں کی تنفیذ انہی کے واسطے سے ہوتی ہے۔

4- ایمان بالکتاب۔ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ اللہ کا اتارا ہوا صحیفہ ہدایت ہے جو حق و باطل کی کسوٹی ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں اس کی رہنمائی حجت اور سند کی حیثیت رکھتی ہے۔

5- نبیوں پر ایمان۔ یعنی خدا کی طرف سے مامور اور واجب الاطاعت ہوتے ہیں وہ ہدایت دینے کے لیے بھیجے جاتے ہیں ان کا علم نسیان و خطا سے پاک ہوتا ہے ان کا عمل انسانی زندگی کے لے اسوہ حسنہ و کاملہ ہوتا ہے ان کی اطاعت اتباع اور محبت ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔

ایمانیات کو بنیادی اور اساسی تصورات کے طور پر ذکر کیا۔ کیونکہ یہی اساسی خیالات اور عقائد ہیں جن پر صالح سیرت و کردار کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ پھر

سیرت و کردار کے حوالے سے انفاق ایفائے عہد استقلال ثابت قدمی اور صبر کو ایسے لاحقوں سمیت ذکر فرمایا کہ زندگی کا کوئی گوشہ باہر نہیں رہا۔ انفاق کا ذکر سب سے پہلے اس لئے فرمایا کہ انسانی زندگی میں سب سے مشکل مسئلہ اپنے مرغوبات مشتہیات پسندیدہ خیالات اور خواہشات سے دستبرداری ہے۔ ایمان کے ذریعہ موہوم مزعوم اور غلط موروثی خیالات سے نکال کر ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دی۔ انفاق کے ذریعہ مرغوبات و خواہشات پر غلبے کا سامان کر دیا۔ اسی لیے شاید علی حبہ کی قید لگائی کہ اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا دم بھرنے والے مال و دولت سے دوسرے لوگوں کی طرح یقیناً ایک تعلق رکھتے ہیں کیونکہ یہ فطری تعلق ہے اور اسلام فطری علائق کا لحاظ رکھتا ہے لیکن وہ اس فطری تعلق کو اللہ کی محبت کی نذر کرکے اپنے مال کو وہاں خرچ کرتے ہیں جہاں وہ پسند فرماتا ہے۔ اور یا دوسری صورت یہ ہے کہ حبہ کی ضمیر مال کی طرف لوٹتی ہے تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ باوجود اس کے کہ انہیں مال کی ضرورت ہوتی ہے لیکن وہ اپنی ضرورت پر دیگر ضرورت مندوں کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی تائید آنحضرت کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے آپ سے سوال کیا گیا سب سے افضل صدقہ کون سا ہے آپ نے فرمایا کہ جو ایک بے مایہ اپنی محنت کی کمائی میں سے اپنے کسی ایسے عزیز پر خرچ کرتا ہے جو اس کے خلاف اپنے دل میں عداوت رکھتا ہے۔ قرآن کریم میں بھی ایسے ہی اہل ایمان کی تعریف کی گئی۔ یوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انہیں خود احتیاج ہو یعنی وہ آنحضرت کے سچے پیرو کار ہیں۔ جن کا اسوہ یہ تھا:

ے قدموں میں ڈھیر اشرفیوں کا لگا ہوا
اور تین دن سے پیٹ پہ پتھر بندھا ہوا
ہیں دوسروں کے واسطے سیم و زر و گہر
اپنا یہ حال ہے کہ ہے چولہا بجھا ہوا

پھر دیکھئے انفاق کے مصارف میں سب سے پہلے قرابت داروں کو رکھا

ہے۔ اس سے معلوم ہوا آدمی کے اعزا و اقربا اگر وہ ضرورت مند ہیں تو اس کی اعانت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں یہاں تک کہ اگر وہ دل میں عداوت بھی چھپائے ہوئے ہوں جب بھی سب سے افضل انفاق وہی ہے جو ان کے لیے کیا جائے۔

قرابت مندوں کے بعد معا یتامی کا ذکر اسلامی معاشرہ میں ان کے درجہ و مرتبہ کو واضح کرتا ہے کہ اپنے عزیزوں کے بعد پہلی نظر آدمی کی ان بچوں پر پڑنی چاہیے جو سایہ پدری سے محروم ہو چکے ہیں جن کی کفالت و تربیت کی ساری ذمہ داری معاشرہ کی طرف منتقل ہوچکی ہے۔ ابن السبیل سے مراد مسافر ہے جسے حالت سفر نے یا سفر میں کسی افتاد نے محتاج بنا دیا ہے۔ سائلین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اعانت کے لیے سوال کر بیٹھیں۔ و فی الرقاب میں رقاب رقبہ کی جمع ہے۔ جس کے معنی گردن کے ہیں۔ اس سے مراد ایسے لوگوں کی مدد کرنا ہے جن کی گردنیں عام قرضوں سودی قرضوں یا معاشی مجبوریوں میں جکڑی ہوئی ہیں ان کے رہن شدہ مکانوں اور کھیتیوں کو چھڑانا بھی انشاء اللہ اس میں شامل ہے۔

ایمان و انفاق کے ذکر کے بعد نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ان دونوں کے قانونی اور عملی مظاہر کی حیثیت سے ہوا ہے۔ ایمان کی عظیم حقیقت کا مظہر عملی نماز ہے اور انفاق کی وسیع حقیقت کا مظہر قانونی زکوٰۃ یہاں زکوٰۃ کا علیحدہ ذکر کرنے سے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ اوپر جس انفاق کا ذکر ہے اور جو اللہ سے وفاداری کا تقاضا ہے وہ اس قانونی مطالبہ سے الگ چیز ہے۔ بر و تقویٰ کا درجہ صرف ادائے زکوٰۃ سے نہیں بلکہ سرا و علانیہ فیاضانہ" خرچ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

اس کے بعد والموفون بعھدھم سے ایفائے عہد کی صفت کو ذکر کیا جارہا ہے۔ لیکن اسلوب کلام بدل گیا ہے اوپر ایمان انفاق نماز اور زکوٰۃ کا ذکر فعل کی شکل میں آیا ہے لیکن یہ اسم فاعل اور صفت کی صورت میں ہے۔ عربی میں فعل کے صیغے صرف کسی فعل کے وقوع کو ظاہر کرتے ہیں لیکن صفت کے

صیغے کسی مستقل صفت کسی خصلت اور کسی کردار کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ ان کے اندر ایک عزم و جزم کی روح بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ سے بر و تقویٰ کا تعلق رکھنے والے اہل ایمان ایسے نہیں کہ ایفائے عہد ان کے لیے کسی وقت وقوع پذیر ہونے والا کوئی واقعہ ہو بلکہ جس طرح سورج سے روشنی آگ سے تپش موتی سے آب اور دریا سے بہاؤ الگ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ان اہل ایمان کے لیے ایفائے عہد ایک خصلت اور ایک کردار ہے جو ان سے منفک نہیں ہو سکتا۔ یہ ان کی پہچان اور شناخت ہے جو ان سے الگ نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد صبر و استقلال کو الصابرین کے لفظ سے ذکر فرمایا اور اس میں لفظی طور پر دو نزاکتیں رکھیں۔ ایک تو یہ کہ الصابرین بھی الموفون کی طرح صفت کی صورت میں ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ صبر و استقلال بھی ایفائے عہد کی طرح ان کی لازمی خصلت ہے اور دوسری یہ بات کہ الصابرین کو بغیر کسی ظاہری سبب کے حالت نصب مین لایا گیا۔ یہ وہ چیز ہے جسے اہل علم نحو کی اصطلاح میں علی سبیل المدح یا علی سبیل الاختصاص سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اہل ایمان جو بر و تقویٰ کے راستے کے مسافر ہیں ان میں بطور خاص دیکھو گے کہ صبر و استقلال اور استقامت ان کا ایک ایسا نمایاں جوہر ہے جو زندگی کے کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی ان سے جدا نہیں ہوتا۔ چاہے وہ حالت فقر و فاقہ کی ہو چاہے جسمانی عوارض سے پیش آنیوالی تکالیف کی اور چاہے وہ حالت جنگ کی شدت اور ہولناکی کی ہو تم کبھی ان کے عزم کو شکست ہوتا کبھی ان کے حوصلوں کو پست ہوتا نہیں دیکھو گے۔

پھر فرمایا۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ یہی لوگ ہیں جو اپنے دعوائے وفاداری میں سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں متقی ہیں۔ اس طرح پروردگار نے ایک سراپا تشکیل فرما کر اور اس کے خدوخال متعین فرما کر دکھا دیا۔ کہ تم اسے دیکھ کر جان سکتے ہو کہ تقویٰ کوئی مبہم اصطلاح یا کسی موہوم آورش کا نام نہیں۔ بلکہ وہ ایک سیرت و کردار کا نام ہے جس کے حامل کو متقی کہا گیا ہے۔ روزہ سے مقصود ایسے ہی متقی فرد اور متقی قوم

کو تیار کرنا ہے۔ اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ آپ نے ایمانی قوت سے ایک مومن کے دل کی بیداری اور آبادی کا سامان کیا پھر اس مضبوط اساس پر ایک بلند و ارفع سیرت و کردار کی عمارت تعمیر کی اس طرح یقیناً ایک صاحب تقویٰ فرد تیار ہو گیا مگر اس تعمیر و تشکیل اور اس محنت و مشقت کا مصرف و مقصد کیا ہے؟ کیا خود ایسے فرد کی ایسی صورت میں تشکیل و تعمیر ہی بجائے خود مقصد تھا یا اس سے زائد بھی کوئی چیز ہے اسے مثال سے یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ کس قدر تکلیف دہ کورسز اور پر مشقت مشقوں کے ذریعے ایک سپاہی تیار کیا جاتا ہے مگر سپاہی کی تیاری تو بجائے خود مقصد نہیں ہوتی بلکہ اس کی اس تمام تر تیاری کا مقصد ملک و قوم کی حفاظت سرحدوں کی نگرانی ارضی و سماوی آفات میں خلق خدا کی خدمت اور جنگ کی ہولناکیوں میں سرفروشی و جانسپاری ہوتا ہے۔

بالکل اسی طرح ایک متقی کا اصل کام تقویٰ کے حصول پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی یہ ساری تیاری اس لیے ہے تاکہ وہ اللہ کا سپاہی اور خدائی فوجدار بنے جب وہ ایک سپاہی کی طرح اپنے فرائض ادا کرتا ہوا ان تمام جانگسل مراحل سے گذرے گا جن سے ایک سپاہی کو گذرنا پڑتا ہے تو تب وہ حقیقت میں متقی کہلانے کا مستحق ہوگا اور ان تمام دنیوی اور اخروی انعامات کا مستحق ہوگا جن کا اس کے پروردگار نے اس کے لیے وعدہ کر رکھا ہے۔ آیئے قرآن کریم سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کے اس سپاہی کی ذمہ داریاں اور فرائض کیا ہیں؟ قرآن کریم میں سورہ الزمر میں ارشاد فرمایا ہے والذی جاء بالصدق و صدق بہ اولئک ھم المتقون اور جو شخص سچائی لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی اور اسے مانا۔ یہی لوگ ہیں متقی۔ اس آیت کریمہ میں گذشتہ سورہ بقرہ کی آیت سے ایک قدم آگے بڑھ کر متقین کا پہلے سے ایک مختلف تعارف کرایا گیا ہے۔ اس آیت کریمہ میں غور کریں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بات ان متقین کی ہو رہی ہے جو سورہ بقرہ میں بیان کردہ مرحلے سے گذر چکے ہیں۔ وہاں ان کے بارہ فرمایا گیا تھا۔ اولئک الذین صدقوا یہی لوگ ہیں سچے اور یہاں فرمایا گیا ہے جو شخص سچائی لے کر آیا یعنی سچائی لے کر اٹھا اور اس کا علمبردار بنا۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اس سچائی اور اس کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال چکا ہے اور وہ اپنے اندر مقدور بھر وہ صفات پیدا کر چکا ہے جو اس آیت کریمہ میں بیان ہوئی ہیں۔ اب اسے قدم آگے بڑھانا ہے گویا کہ اس کے اندر تقویٰ کا شعلہ بھڑک چکا ہے اب ضرورت ہے کہ وہ خاشاک غیر اللہ کو پھونک ڈالے۔ وہ سیرت و کردار کا گھنا درخت بن چکا ہے اب ضرورت ہے کہ وہ دوسروں کو ٹھنڈا سایہ مہیا کرے۔ اس کے اندر ایک شمع روشن ہو چکی ہے ضرورت ہے کہ وہ اندھیرے راستوں میں روشنی کا سامان کرے اس کے قلب و جگر میں ایمان و ایقان کی ٹھنڈک اتر چکی ہے اب ضرورت ہے کہ وہ جھلستے اور جلتے دلوں پر آسودگی و اطمینان کی شبنم بکھیرے۔ یعنی جس سچائی کے سرچشمہ سے وہ فیضیاب ہوا ہے ضروری ہے کہ اس سرچشمہ سے دوسروں کی سیرابی کی بھی فکر کرے بلکہ وہ اس کی سربلندی نشر و اشاعت اور نفوذ کے لیے اس کی علمبرداری کا فرض انجام دے وہ بالکل وہی کام کرنے کی کوشش کرے جو والذی جاء بالصدق کے پہلے مصداق اور اس صداقت و حقیقت کے پہلے علمبردار یعنی سید الاولین والآخرین محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا اور اس فریضہ کی انجام دہی میں اسی طرح تن من دھن کھپانے اور قربان کرنے کی کوشش کرے۔ جیسے آنحضرت نے کیا تھا۔ غار حراء کی تنہائی میں جب فیضان الٰہی کا نور آپ پر طلوع ہوا اور آپ (ﷺ) نسخہ کیمیا لے کر مکہ معظمہ تشریف لائے جس میں انسانیت کے مس خام کو کندن بنانے کی صلاحیت تھی۔ تو تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ آپ نے اس صداقت کی علمبرداری کا کس طرح حق ادا کیا اور کس استقامت، عزم و ارادہ کی پختگی اور بلند حوصلگی کے ساتھ مخالفتوں اور مقاومتوں کا مقابلہ کیا۔ آپ بالکل تنہا اس میدان میں نکلے اور پرعزم اعتماد کے ساتھ اپنی شخصیت کا پورا اثاثہ اس میدان میں جھونک دیا۔ ہر کٹھن سے کٹھن مرحلے سے گذرے ہر بڑی سے بڑی رکاوٹ کا سامنا کیا۔ زندگی کا کوئی ایسا دکھ نہیں جو اس راستے میں آپ نے برداشت نہ کیا ہو۔ آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے آپ نے انہیں پھولوں کی سیج جانا۔ آپ کے سر مبارک پر راکھ ڈالی

گئی آپ نے ایک زہر خند سے زیادہ اسے اہمیت نہ دی۔ آپ نے اپنے چچا اور چچی کی جانب سے جو آپ کے سب سے قریبی ہمسائے بھی تھے اور آپ کی بیٹیاں بھی ان کے بیٹوں سے منسوب تھیں۔) ہر طلوع ہونے والے دن نئی سے نئی اذیت کا سامنا کیا اور نئے سے نئے کلمات ناروا کے زخم سے مگر بجز ایک جملے کے آپ نے کبھی کوئی شکایت نہ کی۔ کہ اے آل غالب' کیا یہی حق ہمسائیگی ہے جو تم ادا کر رہے ہو۔ آپ کی وہ قوم جو اس صداقت کی علمبرداری سے پہلے آپ کو الصادق و الامین کہہ کر پکارتی تھی بڑی بوڑھیاں آپ کی بلائیں لیتی نہ تھکتی تھیں۔ بزرگوں کی آنکھوں کا آپ تارا تھے۔ نوجوانوں کے لیے آپ باعث صد ہزار رشک اور خواتین کے لیے باعث صد افتخار بھائی تھے۔ اب ان میں کون تھا جو ہر کلمہ نصیحت کے مقابلہ میں گالی نہ دیتا تھا جو ہر فہمائش اور انذار کے جواب میں پتھر نہ مارتا تھا۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں۔ اس میں شعب ابی طالب کی جان لیوا تنہائیاں بھی ہیں صحن حرم کے روح فرسا حملے بھی ہیں، بلال و عمار کو دی جانے والی ناقابل برداشت اذیتیں بھی ہیں بیٹیوں کو گھائل کر دینے والے زخم بھی ہیں پورا مکہ ایک آتش فشاں کی طرح ابل رہا ہے اور آنحضرتؐ اس کی زد میں ہیں۔ یہ سب کچھ ہے مگر آپ نہایت اطمینان لیکن دلسوزی و خیر خواہی کے ساتھ حق کی علمبرداری کا فرض انجام دے رہے ہیں پھر جب آپ دیکھتے ہیں کہ اہل مکہ نے اپنے دماغ اور دل اس دعوت کی طرف سے بند کر لیے ہیں تو آپ فرض کی ادائیگی کے لیے طائف تشریف لے جاتے ہیں تو وہاں آپ کا استقبال پتھروں سے کیا جاتا ہے اور آپ کو دعوتی زندگی کے سب سے کٹھن مرحلے سے گذرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ علمبرداری اور تبلیغ حق کا سفر پھر بھی جاری رہتا ہے تاآنکہ آپ کو ہجرت کرنا پڑتی ہے۔ گھر چھوٹ رہا ہے وطن روٹھ رہا ہے اہل وطن تعاقب میں ہیں۔ مدینہ منورہ میں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ اب رحمتہ اللعالمین کو غزوہ و قتال کے مراحل درپیش ہیں۔ عزیزوں کی قربانیوں اور سرفروشیوں کے زخم ہر روز لگ رہے ہیں۔ شہیدوں کی ایک فصل کٹ رہی ہے حتی کہ میدان احد میں وہ سر مبارک پھٹ رہا ہے جس کی نظیر پوری کائنات

میں نہیں۔ دانت مبارک شہید ہو رہے ہیں۔ جس کی مثال ملا اعلی میں بھی نہیں۔ وہ خون بہہ رہا ہے جس کی پاکیزگی و طہارت کا جواب کوثر و تسنیم میں بھی نہیں مگر یہ سب کیوں ہو رہا ہے اسلئے کہ حق کی علمبرداری اور صدق و امانت کی سرفرازی ہو سکے۔ یہ ہے متقی کا سب سے اعلیٰ مقام جس کا مصداق اول و اعلیٰ آنحضرت ﷺ ہیں اور جس کے نقوش سیرت طیبہ میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ جس سے ہم باسانی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک متقی کی اصل منزل اسی مقام ارفع کی طرف پیش قدمی ہے۔

متذکرہ بالا آیت میں متقین کے لیے ایک دوسرے مقام کی بھی خبر دی گئی ہے یعنی اگر تم یہ پہلا مقام حاصل کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے یا پہلے مقام کے حاملین موجود ہیں اور ضرورت دوسرے درجے کے حاملین کی ہے تو پھر تمہیں اس کی طرف لپکنا چاہیے۔ وہ مقام ہے (وصدق بہٖ) جس نے اس سچائی یعنی اسلام جو آنحضرت لے کر آئے اس کی تصدیق کی یعنی اس سچائی کے علمبردار کو ہر ممکن طریق سے سپورٹ کیا اپنا وزن اس سچائی کے پلڑے میں ڈالا۔ اس کے لیے مال کی ضرورت ہوئی تو مال دیا۔ وقت کی طلب ہوئی تو وقت دیا۔ پسینہ بہانے کی نوبت آئی تو پسینہ بہایا اور اگر جہاد و قتال کا معرکہ درپیش ہوا تو خون دیا۔ غرضیکہ اپنا سب کچھ اس کی تائید و حمایت میں جھونک دیا۔ عہد نبوی علی صاحبہ التحیۃ والسلام میں سارے صحابہ ہی اس کی تصویر اور اس کے مصداق ہیں کہ انہوں نے ہر موقعہ پر حسب ضرورت اور بقدر ضرورت تائید و نصرت سے کما حقہ اپنا فرض انجام دیا۔ لیکن سب سے پہلے مصداق جنہوں نے اس راستے میں بلند ترین مثال قائم کی وہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ مردوں میں سب سے پہلے اسلام لائے اور اسلام لانے کے بعد پوچھا حضور اب میرے لیے کیا حکم ہے فرمایا کل تک جو کام میں تنہا کرتا تھا اب دونوں مل کر کریں گے۔ یعنی تم میری تائید نصرت اور حمایت کرو گے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ لوگوں کے پاس دعوت لے کر جاتے تو صدیق اکبر تعارف کراتے لوگوں سے راہ رسم پیدا کرتے جویائے حق کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے کمزور اور غریب صحابہ کی

پشت پناہی کرتے اپنے مال و دولت سے آنحضرت اور تحریک اسلامی کی ضرورتوں کو پورا کرتے تا آنکہ اپنا کثیر سرمایہ بلکہ تمام تجارتی مال اور جمع پونجی اس راستے میں جھونک دی اور لباس کی جگہ پھٹے ہوئے کمبل میں کانٹے اٹکا کر تن پوشی کی ضرورت پوری کی صلہ میں عرش سے جبریل امین اللہ تعالیٰ کا سلام لے کر آئے۔ اس تائید و حمایت میں صرف مال و دولت ہی نہیں اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو بھی صرف کر ڈالا آپ سائے کی طرح آنحضرت کے ساتھ رہتے دشمنوں کے حملے میں آپ ڈھال بن جاتے اور ہر وار کو اپنے نحیف جسم پر برداشت کرتے۔ چنانچہ صحن حرم میں جب اشرار قریش نے آنحضرت پر حملہ کیا تو آپ نے اسلام کی تاریخ میں آنحضرت کی حفاظت کرتے ہوئے سب سے پہلی مار کھائی اور اس قدر زخمی ہوئے کہ تین روز تک بیہوش رہے۔ ہوش آیا تو زبان پر اسی کا نام اور دل میں اسی کی خیریت کی فکر تھی جس کے لیے یہ ساری مار کھائی تھی اور زخم سہے تھے۔ آپ کی ذات علمبردار اول یعنی آنحضرت اور اسلام کی تائید و حمایت کا ایک استعارہ بن گئی ہے۔ اقبال مرحوم نے ٹھیک کہا:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

چنانچہ تقویٰ کا دوسرا مقام وہ ہے جو ہم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی زندگی کے آئینہ میں بتمام و کمال دیکھ سکتے ہیں اور یہی وہ تقویٰ کے دو مقام ہیں جو تمام عبادات سے بالعموم اور روزہ سے بالخصوص پیدا کرنا مقصود ہیں۔ کیونکہ:

مری زندگی کا مقصد ترے دین کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی

یہی وہ تقویٰ ہے جو اسلامی اعمال کی اصل روح اور اسلامی تعلیمات کا ست اور نچوڑ ہے۔ اور اسی پر اللہ تعالیٰ نے بیش بہا انعامات اور دنیوی و اخروی کامرانیوں کا وعدہ فرمایا ہے۔ ان میں سے چند ایک کا ہم ذکر کرتے ہیں۔

1- اسلام اور دیگر مذاہب میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ اسلام کا اصل دعوی فرد اور معاشرہ کی انفرادی اور اجتماعی زندگی اور اس کے باہمی

تعلقات کو ایسے اصولوں پر استوار کرنا اور ایسے آداب سے آراستہ کرنا ہے جس سے ہماری دنیوی زندگی ایسے اسلوب پر رواں دواں اور جاری و ساری ہو کہ یہی دنیوی زندگی اخروی زندگی کا پیش خیمہ اور تمہید بن جائے۔ اس لیے اسلام صرف اخروی کامیابیوں اور کامرانیوں یا صرف جنت کی نعمتوں کی بات نہیں کرتا جو تقویٰ کے نتیجہ میں ہمیں دینے کا وعدہ کیا گیا ہے بلکہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ تقویٰ جیسا کہ آپ نے دیکھا وہ صفائے قلب' سیرت و کردار کی بلندی اور اعلائے کلمتہ الحق پر مبنی عزم بالجزم کا نام ہے یہ جس طرح اخروی زندگی کی سرخروئی کے لیے ضروری ہے اسی طرح دنیوی زندگی کی ہمواری استواری اور کامرانی کے لیے بھی ضروری ہے۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ دنیوی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ زندگی کے لاینحل مسائل اور معاشی و اقتصادی الجھنیں ہیں۔ پروردگار نے فرمایا کہ اگر تم تقویٰ کی زندگی اختیار کرلو تو اللہ تعالیٰ اس کے نتیجہ میں تمہیں بند راستوں اور اقتصادی الجھنوں سے اس طرح نجات دے دے گا جس کا تمہیں سان گمان بھی نہیں ہوگا۔ ارشاد ہوتا ہے ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے بند گلی سے نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے اور ایسی جگہ سے اسے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ اس کی بہترین تشریح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں رفع حاجت کے لیے کھجوروں کے ایک جھنڈ میں داخل ہوا میں نے دیکھا ایک چوہا بل سے نکلا اور اس کے منہ میں ایک اشرفی تھی وہ دوبارہ بل میں داخل ہوا پھر نکلا تو پھر اس کے منہ میں اشرفی تھی۔ اس طرح اس نے اٹھارہ پھیروں میں اٹھارہ اشرفیاں لاکر باہر رکھ دیں۔ اور خود پاس بیٹھ گیا میں حاجت سے فارغ ہو کر اس کی طرف بڑھا تو وہ بل میں داخل ہو گیا میں نے وہ اشرفیاں اپنے دامن میں ڈالیں اور آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ سنایا تو آنحضرت سن کر مسکرائے اور پھر فرمایا عبداللہ یہ حلال اور طیب رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے بھیجا ہے (اور وہ بھی ایسے جانور

کے واسطے سے جو باہر کی چیزیں بل میں لے جانے کی شہرت رکھتا ہے) پھر آپ نے مذکورہ بالا آیت تلاوت فرمائی۔

2- ایسا نہیں کہ تقویٰ کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ صرف ایک متقی فرد کی مدد فرماتا ہے بلکہ اگر پوری امت یا افراد کا کوئی بڑا گروہ یا کوئی آبادی اس تقویٰ کی زندگی کو اختیار کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے بھی وسائل رزق میں فراوانی پیدا فرما دیتا ہے۔ بلکہ غیر معمولی طریقوں سے وسائل رزق مہیا فرماتا ہے۔ ارشاد ہے ولو انّ اھلَ القریٰ آمنوا واتّقوا لَفتحنا علیھم بَرکات من السّماء والارض اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ کی زندگی اُختیار کرتے تو ہم آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے ان پر کھول دیتے۔ دوسری جگہ فرمایا لَاکلوا من فوقِھم ومِن تحت اَرجلھم وہ اوپر سے بھی کھاتے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے بھی یعنی اوپر سے بھی رزق ان پر برستا اور زمین سے بھی ابلتا۔

3- پاکستان آج کل سیاسی حالات کی گرفت میں ہے۔ قومی معاملات کے الجھاؤ کا حال یہ ہے کہ ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں۔ ایسے حالات کے لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یاایھا الذین آمنوا ان تتّقوا اللہ یجعل لکم فرقاناً ویکفّر عنکم سیاتکم ویغفر لکم واللہ ذوالفضل العظیم اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارے لیے ایک قول فیصل ایک کسوٹی اور ایک قوت تمیز مہیا کرے گا۔ (جس سے تم معاملات کی الجھنوں کو حل کر سکو گے۔) اور تم سے تمہاری برائیاں دور کر دے گا اور تمہاری مغفرت فرمائے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

جہاں تک عمومی عنایات و نوازشات کا تعلق ہے جن کی اہلِ تقویٰ کو نوید سنائی گئی ہے اسے آپ مندرجہ ذیل قرآنی آیات کے آئینہ میں دیکھ سکتے ہیں۔

1- والعاقبۃ لِلمتّقین اور آخری انجام تقویٰ والوں کے لیے ہے۔
2- والاٰخرۃ عندَ ربّک لِلمتّقین اور آخرت تیرے پروردگار کے

نزدیک تقویٰ والوں کے لیے ہے۔

3- اِنْ اَولیاؤُہ الا المَتّقوَن تقویٰ والے ہی خدا کے دوست ہیں۔

4- اِنّ اللّٰہ یَحبّ المَتّقین اللہ بلاشبہ تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

5- واعلموا انّ اللّٰہ مَعَ المتقین اور جان لو کہ بے شبہ اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے۔

6- اِنّ المتقین فی مَقام اَمین بے شبہ تقویٰ والے امن و امان کی جگہ میں ہوں گے۔

7- ان المتقین فی جَنّات وّ نعیم بے شک تقویٰ والے باغوں میں اور نعمت میں ہوں گے۔

8- ان لِلمتّقین مَفازاً بے شبہ تقویٰ والوں کے لیے کامیابی ہے۔

9- ان للمتقین لَحُسنَ مآب لاریب تقویٰ والوں کے لیے بازگشت کی اچھائی ہے۔

10- اِنّ اَکرَمکم عِندللّٰہ اتقاکم بے شک تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔

# رمضان اور قرآن

محترم خواتین و حضرات!

شَہرُ رمضانَ الّذی اُنزِلَ فیہِ القرَآن ھُدًی لِّلنّاس وَ بیّنات مین الھدٰی وَالفرقان

رمضان المبارک کی برکتوں اور عظمتوں کی کوئی انتہا نہیں اس میں کیا ہوا عمل صالح اپنی تاثیر نتیجہ خیزی اور اجر و ثواب کے اعتبار سے بے مثال و بے نظیر ہے۔ اس کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ کی عطاء و بخشش کا ایسا بے بہا خزینہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں لَو یعلمَ العبادَ ما فی رَمضانَ لتمنّتْ اُمّتی اَن تکونَ السّنۃ کلّھا رمضان اگر بندے جان لیں کہ رمضان میں کیا ملتا ہے تو میری امت تمنا کرے کہ اے کاش سارا سال رمضان ہی رہے اور اس رمضان کے ذریعے سیرت و کردار کی تعمیر کا ایسا پروگرام دیا گیا ہے اور ایمان اور یقین کا ایسا سامان کیا گیا ہے کہ آنحضرت فرماتے ہیں الصوم جنۃ و حصن حصین من النار۔ روزہ (گناہوں اور برائیوں کے سامنے) ڈھال ہے اور جہنم کی آگ سے بچاؤ کے لیے مضبوط قلعہ ہے۔ یعنی روزہ انسان کے اندر ایک ایسا نیکی کا شعور اور احساس پیدا کر دیتا ہے جو گناہ اور معصیت کی ہر ترغیب اور خواہش نفس کے ہر حملے کے سامنے ڈھال اور رکاوٹ بن جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں آدمی صالح سیرت و کردار اور اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے ایک ایسے قلعے میں محفوظ ہو جاتا ہے جہاں جہنم کی آگ نہیں پہنچ سکتی۔

سوال یہ ہے کہ رمضان کی یہ تمام تر خیر و برکت اور انسانی سیرت و

کردار کی تعمیر میں اس کی اثر اندازی کا سبب کیا ہے؟ قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ رمضان المبارک کی ساری سعادتوں اور فضیلتوں کی وجہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم اس مہینہ میں نازل فرمایا اگر یہ کتاب مطہرو محترم کسی اور مہینہ میں نازل ہوتی تو بلاشبہ وہ مہینہ ایسی ہی عظمتوں کا حامل ہو جاتا۔ یہی کتاب ہے جس کی وجہ سے یہ امت خیر الامم بنی ہے اور رمضان خیر الشہور ٹھہرا ہے۔ آنحضرت ﷺ جو وجہ تخلیق کائنات خاتم الانبیاء والرسل اور سید الاولین والاخرین ہیں جہاں ان کے افضل و اشرف ہونے کے اور بہت سے اسباب ہیں ان میں سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ آپ پر قرآن کریم جیسی کتاب نازل کی گئی یہی وہ کتاب ہے جس کے حق امانت کی ادائیگی نے آپ کو حرا کی تنہائیوں سے اترنے پر مجبور کیا۔ آپ جو انتہائی کم آمیز واقع ہوئے تھے اور عزلت نشینی اور گوشتہ گیری آپ کے سکون و اطمینان کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اس کتاب کی گراں باریوں نے اختلاط و معاشرت ہی نہیں ایک ایک دروازے پر آپ کو دستک دینے پر مجبور کر دیا۔ آپ جو انتہائی کم گو دیکھے جاتے تھے اور کبھی کسی نے آپ سے خطبہ و تقریر تو دور کی بات ہے ایک کلمۂ نصیحت بھی نہیں سنا تھا۔ اب آپ کی زبان سے حکمت و نصیحت کا چشمہ ابلنے لگا۔ اسی کتاب عزیز کی تلاوت اسی کی تعلیم اسی کی حکمت و دانش اسی کے تبشیر و انذار اسی کے وعد و مواعید اور اسی کی تبلیغ و دعوت آپ کی زندگی کا معمول بن گئی۔ پھر اس کے نتیجے میں آپ کی ذات جو ہر طرح کی تعریف و تحسین اور اعزاز و اکرام کی مستحق سمجھی جاتی تھی۔ اب تنقید ہی نہیں ہر طرح کے الزام و دشنام اور ہر طرح کی ایذا کا ہدف بن گئی اور زندگی کا ہر زخم اور ہر دکھ آپ نے اس بار امانت کی ادائیگی کے سلسلے میں نہایت صبر و سکون سے برداشت فرمایا۔ یہ ذات عزیز و گرامی جس کے پاؤں کی دھول بھی ساری کائنات سے افضل ہے اس کے سر مبارک پر راکھ پھینکی گئی۔ آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے۔ آپ کی جان لینے کی تدبیریں کی گئیں۔ طائف میں آپ پر پتھروں کی بارش کی گئی آپ کو وطن سے بے وطن کیا گیا۔ جان و تن کی آزمائشوں سے گذرنے پر آپ کو مجبور

کیا گیا تا آنکہ اسی نسخہ کیمیا سے آپ نے عرب کی مس خام کو کندن بنا دیا اور ایک ایسا انقلاب برپا کیا جس کے نتیجہ میں:

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

المختصر قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فضیلتیں تقسیم فرمائیں۔ جس کی نشر و اشاعت جس کے حقوق کی ادائیگی جس کے پیغام کی تبلیغ و دعوت اور جس کے احکام کے نفاذ اور غلبے کے لیے سردار دو عالم اور حبیب رب العالمین کا انتخاب کیا گیا اور جس کی تاثیر اور ہمہ گیری نے عرب کے بادیہ نشینوں اور عجم کے مادہ گزیدوں کو انسانیت کے لیے باعث شرف اور اخلاق و فضائل اور تہذیب و تمدن کا رہنما بنا دیا اور جس کے پیش کردہ حقوق و فرائض نظام اخلاق آداب زندگی اور اصول جہانبانی سے دنیا آج بھی ہزار مخالفت کے باوجود دانستہ یا نادانستہ فیض پا رہی ہے اور فائدہ اٹھا رہی ہے اور پھر یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جو زندگی کے کسی ایک گوشے یا علم کے کسی ایک شعبے کے ساتھ مخصوص نہیں جبکہ دنیا کی تمام قابل ذکر کتابوں کی یہی خصوصیت رہی ہے کہ وہ زندگی کے کسی ایک گوشے یا علم و فن کے کسی ایک شعبے سے بحث کرتی ہیں۔ یہ کتاب علم کے ہر شعبے اور زندگی کے ہر گوشے سے متعلق ہدایات دیتی اور اپنی رائے کا اظہار کرتی ہے مگر وہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ مخصوص نہیں۔ وہ انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ اور اس کے اصول پر بحث کرتی ہے وہ اخلاق اور تہذیب اخلاق کی بات کرتی ہے وہ قوموں کے عروج و زوال کا ذکر کرتی ہے وہ طبیعات اور حیاتیات اور نفسیات کی طرف اشارے کرتی ہے وہ مابعد الطبیعات اور الہیات کے تصورات پر تنقید اور محاکمہ بھی کرتی ہے۔ بااین ہمہ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی اس کا موضوع نہیں۔ اس کتاب کا موضوع خود حضرت انسان ہے۔ موضوع ہونے کا یہ معنی نہیں کہ وہ اس کی فعلی اور انفعالی قوتوں اس کے اجزائے ترکیبی اس کے موثر اور متاثر ہونے کے عوامل اور اس کی جسمانی ضرورتوں پر بحث کرے۔ بلکہ اس کا مطلب

یہ ہے کہ وہ انسان اور کائنات، انسان اور انسان، انسان اور دیگر مخلوقات اور انسان اور اس کے خالق و مالک کے باہمی تعلقات اور اس کے حوالے سے حقوق و فرائض پر بحث کرتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ انسانیت کس طرح زندہ رہتی اور کس طرح مرجاتی ہے۔ وہ انسان کے مقصد حیات اور اسے بروئے کار لانے کے طریقے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو غایت الغایات بنانے اور اس کے مطابق اعمال کو بیان کرتی ہے اور پھر دنیا کو ضرورت اور آخرت کو منزل ٹھہرا کر دونوں کا باہمی ربط واضح کرتی ہے۔ اس طرح زندگی کو ایک اکائی بنا کر وحدت مقصد کے شیرازے میں پرو کر تمام علوم و فنون کو اس کی چاکری میں لگا کر انسانی قافلے کو درست سمت میں جہد و عمل کا پیغام دے کر دنیوی اور اخروی کامیابیوں کو آسان بنا دیتی ہے۔ وہ اپنے قارئین کو اس بات کا شعور دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں حواس اور عقل کی صورت میں زندگی کے مسائل حل کرنے کا ذریعہ عطا کیا ہے تم ان کے دائرہ کار میں ان سے کام لو۔ البتہ ان کے دائرہ کار اور ان کی بساط سے متعلق تمہیں غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ ان پر وہ بوجھ نہ ڈالو جن کے تحمل کی ان میں طاقت نہیں۔ ان سے محسوسات اور معقولات میں خوب کام لو مگر الٰہیات مابعد الطبیعات اخلاقی مسلمات اجتماعی اقدار خلق اور خالق کے تعلقات اور ان پر مبنی منصوصات عالم برزخ، عالم آخرت، بعث بعد الموت اور اعمال کے غیر مرئی نتائج وغیرہا کا محاکمہ اپنی عقل و خرد سے نہ کرو یہ اس کے دائرہ کار سے باہر کا میدان ہے۔ ان سے صرف وہ کتاب بحث کر سکتی ہے جن میں غیر معمولی اور متنوع خصوصیات ہوں۔ مثلاً اس کتاب کا منصف اپنے علم و بصیرت اور اطلاع و آگہی میں ناقص اور محدود نہ ہو۔ جس کا دائرۂ علم محسوسات اور معقولات پر ہی مشتمل نہ ہو کہ زندگی کا ہر گوشہ اور علم کا ہر شعبہ اس کے سامنے روز روشن کی طرح آشکارا ہو۔ وہ جس طرح حال کو جانتا ہو اسی طرح ماضی سے بھی باخبر اور مستقبل سے بھی آگاہ ہو۔ اس کے سامنے جدید و قدیم کی تقسیم کوئی تقسیم نہ ہو۔ اس کے نتائج علم اس کے احکام کی افادیت اور اس کی حکمتوں کی قطعیت مرور ایام سے کہنہ ہو سکے نہ اسے

چیلنج کیا جاسکے۔ زمانے کا عروج و زوال اس کی دی ہوئی رہنمائی کو کبھی غیر مفید ناقابل عمل اور ازکار رفتہ قرار نہ دے سکے۔

آپ اگر خالی الذہن ہو کر اور غیر جانبدار رہ کر غور فرمائیں گے تو آپ تسلیم کریں گے کہ ایسا مصنف بجز پروردگار کے اور کون ہو سکتا ہے اور ایسی صفات پر مشتمل کتاب صرف اسی کی ہو سکتی ہے اس لحاظ سے تمام آسمانی کتابیں انہیں صفات کی حامل ہیں۔ لیکن قرآن کریم کے علاوہ باقی کتب سماویہ محفوظ نہ رہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہی تھی کہ وہ محفوظ نہ رہیں اسی لیے ان کی حفاظت کا وعدہ نہیں فرمایا وہ ایک خاص وقت کے لیے رہنمائی دینے کے لیے آئیں جب وہ وقت گذر گیا تو نئی کتاب آگئی تا آنکہ دنیا جب اپنے بلوغ کی عمر کو پہنچ گئی تو قرآن کریم جیسی کتاب آئی۔ جس کے ذریعہ تکمیل دین کا اعلان کیا گیا اور خالق کائنات نے اس کی حفاظت کا وعدہ فرما کر اس کو ابدیت عطا کر دی یہی وجہ ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال ہونے کو آئے۔ اس کتاب کے احکام میں تو کیا تبدیلی آتی اس کا کوئی محاورہ کوئی روزمرہ کوئی ضرب المثل کوئی تلمیح کوئی اسلوب حتی کہ کوئی لفظ بھی آج تک متروک نہ ہو سکا۔ زبانیں چند صدیوں میں کیا سے کیا ہو جاتی ہیں۔ مگر عربی زبان صرف قرآن کریم کی وجہ سے اسی طرح آراستہ پیراستہ اور شگفتہ ہے جیسے اس کے نزول کے وقت تھی اور اس میں بیان کردہ تاریخی واقعات اور پیشگوئیاں پوری قطعیت کے ساتھ آج بھی زندہ ہیں اور اپنی صداقت اور حقانیت کا لوہا منوا چکی ہیں۔ اس میں مذکور علمی اشارات آج کے مسلمات قرار پاچکے ہیں اس کا بے مثل ہونے اور انسانی دسترس سے ماوراء ہونے کا چیلنج آج بھی اپنی جگہ قائم ہے۔ اس کتاب کے خالق کائنات کا کلام ہونے کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب آدمی زندگی کے بعض مسائل پر لائبریاں کھنگال ڈالتا ہے لیکن اسے قول فیصل نہیں ملتا۔ پھر وہ قرآن کریم دیکھتا ہے تو وہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ قرآن کریم نے کس طرح ان گتھیوں کو سلجھایا ہے اور کس قطعیت کے ساتھ اپنی ہر بات کو پیش کیا ہے۔ چنانچہ اسی قطعیت اور شک و شبہے سے بالا ہونے اور انسانی زندگی کی

بھلائی بقا اور کامیابی و کامرانی کے لیے واحد راستہ اور طرز زندگی ہونے کی وجہ سے قرآن کریم بطور خاص بعض اپنی مخصوص صفات کا ذکر کرتا ہے جن میں سے ہم چند ایک کا ذکر کرتے ہیں۔

-1 قرآن کریم کا تعارف کراتے ہوئے ہمیشہ پروردگار یہ ضرور کہتا ہے کہ ہم نے اسے نازل کیا ہے۔ ظاہر ہے جس کتاب کو خالق کائنات نازل فرمائے گا اس کے مندرجات اور تعلیمات میں شک و ارتیاب یا خطاء و نسیان کا کیا امکان ہو سکتا ہے؟ وہ کسی زمانے میں ناقابل عمل کیسے ہو سکتی ہے؟ انسانی زندگی کی مصلحتوں کی رعایت رکھنے والی اس سے بڑھ کر کوئی اور کتاب کیسے ہو سکتی ہے کیونکہ اس کا نازل کرنے والا انسانی فطرت اور طبیعت کا خالق ہے۔ کیا خلق اور خالق کے علم میں کوئی نسبت ہو سکتی ہے؟

-2 قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مختلف مواقع پر قرآن کریم کا ذکر فرما کر اپنی صفات کا ذکر فرمایا ہے اور صفات کے ذکر میں بالعموم اللہ کو سب پر مقدم رکھا ہے مثلاً" ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو الم اللہ لا الہ الا ھو یعنی قرآن کریم وہ کتاب ہے جس کا نازل کرنے والا الہ ہے اور اس کے علاوہ کوئی الہ نہیں یعنی وہ معبود مسجود، مقصود، محبوب اور حاکم حقیقی ہے۔ تو اس کی کتاب اسی کی بندگی اسی کی عبادت اسی کی صراط مستقیم کا راستہ بتاتی اور اسی کے احکام کا مجموعہ ہے۔ تم اسے چھوڑ کر کسی اور کتاب کو رہنما کیسے بنا سکتے ہو؟ سورہ الحشر میں قرآن کریم کا ذکر فرما کر کہ اگر ہم اسے کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو وہ بھی اللہ سے ڈر کر ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ مسلسل اپنی صفات کا ذکر فرمایا ہے۔ یعنی پہاڑ کے ریزہ ریزہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس کی فطرت میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کا تصور مستحضر رہتا ہے۔ اس لیے پتھر اس کی ہیبت سے شق ہو جاتے اور اپنی جگہ سے لڑھک جاتے ہیں۔ لیکن انسان اپنی غفلت و جحود سے اللہ تعالیٰ کے عظمت و جلال سے بیگانہ

اور بے خبر رہتا ہے اس لیے قرآن کریم بھی اس کی طبیعت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ کیونکہ بڑی سے بڑی صداقت اور بڑے سے بڑا بول بھی اپنے عظیم و جلیل حوالے سے عظیم اور معتبر ٹھہرتا ہے۔ تخت پر فائز فرعون کی خرافات کو وزن دیا جاتا اور کٹھرے میں کھڑے بے نوا موسی علیہ السلام کی دعوت کو خندۂ استہزا میں اڑا دیا جاتا ہے کیونکہ ایک کے پیچھے اقتدار کی طاقت ہے اور دوسرے کے پیچھے نہیں۔ عام آدمی فائر فائر کہتا ہے مکھی نہیں مرتی مگر ایک جرنیل کے منہ سے جب یہ لفظ نکلتا ہے تو نہ جانے کتنی زندگیاں موت کا شکار ہوتی اور کتنے جسم خاک و خون میں لوٹتے ہیں۔ جب تک قرآن پڑھنے والوں کے دلوں میں یہ بات نہیں اترے گی کہ جس نے یہ کتاب اتاری ہے وہ ساری عظمتوں اور بلندیوں کا خالق و مالک ہے اور جس کے ایک اشارے سے کائنات کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور اسی کی اطاعت و بندگی ہماری دنیوی اور اخروی فلاح کی ضامن ہے۔ اس وقت تک قرآن کریم کی اطاعت و عظمت کا صحیح شعور پیدا نہیں ہوگا۔

-3 پروردگار نے اپنی کتاب کا آغاز ذلک الکتاب لاریب فیہ سے فرمایا ہے یعنی یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے منزل من اللہ ہونے اور محفوظ ہونے میں کوئی شبہ نہیں نیز اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اور جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بہتری کے لیے احکام دیئے گئے ہیں اس کے زندگی کے ہر شعبے میں اور زمانے کے ہر دور میں قابل عمل بلکہ واجب العمل ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ دنیا کی کوئی کتاب یہ دعوی نہیں کرسکتی کیونکہ کسی کتاب کا مصنف جو اپنے علم کی حدود کو جانتا ہو بقائمی ہوش و حواس ایسا دعوی نہیں کر سکتا وہ خوب سمجھتا ہے کہ انسانی علم وقت گذرنے کے ساتھ تغیرات کا شکار ہوتا ہے اس کا کوئی نظریہ ابدی نہیں ہوتا کیونکہ انسانی ذرائع علم محدود ہیں وہ اپنے دور سے آگے نہیں دیکھ سکتے لیکن یہ کتاب چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہے اس

لیے یہ ایسی تمام محدودات اور نارسائیوں سے پاک ہے۔

-4 قرآن کریم کی ایک صفت الھدیٰ ہے۔ ہدایت کے مختلف معانی ہیں۔ 1- فعل ہدایت۔ لیس علیک ہداھم 2- صراط مستقیم انک لعلی ھدی مستقیم آپ یقیناً سیدھے راستے پر ہیں۔ 3(- نشان راہ۔ او اجد علی النار ھدی 4- قلبی نور و بصیرت والذین اھتدوا زاد ہم ھدی جو لوگ راہ پاجاتے ہیں ہم ان کے قلبی نور و بصیرت میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ یہ فعل ہدایت کبھی صرف اراء الطریق یعنی راستہ دکھانا ہوتا ہے اور کبھی ایصال الی المطلوب یعنی منزل مقصود تک پہنچانا ہوتا ہے قرآن کریم ان تمام معنوں میں ہدایت ہے۔ یہ محض کتاب نہیں بلکہ یہ کتاب نصیحت بھی ہے۔ کتاب زندگی بھی ہے کتاب قانون بھی ہے اور فلسفہ قانون بھی ہے۔ یہ کتاب اخلاق بھی ہے۔ یہ تاریخ اسباب تاریخ اور نتائج تاریخ سے بھی بحث کرتی ہے۔ یہ آداب زندگی اور اسلوب زندگی کی تعلیم بھی ہے۔ مختصر یہ کہ زندگی کے جتنے شعبے ہیں یہ کتاب ان تمام سے متعلق رہنمائی دیتی ہے اور پھر اس پر اصرار کرتی ہے کہ یہی صحیح ہے جس میں غلطی کا امکان نہیں ہو سکتا۔

-5 یہ کتاب صرف ہدایت ہی نہیں بلکہ اس میں ہدایت کے بینات بھی انتہائی ہیں۔ یعنی یہ زندگی کے بارہ میں جو ہدایات دیتی اور زندگی کے جس اسلوب کا حکم دیتی ہے اس پر دلائل بھی فراہم کرتی ہے۔ یہ صرف عمل کا سامان نہیں کرتی بلکہ عقل و دانش کو بھی غذا فراہم کرتی اور اس کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتی ہے اور اس کے یہ بینات عقلی بھی ہیں اور فطری بھی۔ استخراجی بھی ہیں استنتاجی بھی۔ یعنی دلائل و براہین کے تمام اسالیب ہمیں اس کتاب میں ملتے ہیں لیکن بینات کی ایک خاص صورت جو اس کتاب کی خصوصیت ہے۔ وہ یہ کہ اس کے بینات تاریخی اور انسانی پیکر بھی ہیں۔ وہ جب یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے اپنے پیغمبروں کی معرفت جو ہدایت بھیجی ہے اسے قبول کرو اسی میں تمہاری دنیوی اور اخروی بھلائی ہے تو پھر اس پر صرف عقلی و نقلی دلائل ہی پیش نہیں کرتا بلکہ عملی شواہد بھی پیش کرتا ہے۔ وہ ان افراد اور قوموں کی تاریخ بیان کرتا ہے جو اس ہدایت کو قبول کرنے کے نتیجے میں کامیاب و کامران ٹھہریں اور ان قوموں کا بھی ذکر کرتا ہے جو اس کا انکار کرکے تباہی و نامرادی کا شکار ہوئیں۔ وہ انبیاء و رسل اور ان کی زندگی کو بطور عملی دلیل و برہان کے پیش کرتا ہے کہ دیکھو ان لوگوں نے کس طرح ناموافق و نامساعد حالات میں اللہ کی دعوت کو پیش کیا اور تن تنہا وقت کی قوتوں سے ٹکراتے ہوئے زندگی گزاری۔ کبھی وقت کا دھارا بدلنے میں کامیاب ہوگئے اور کبھی اس راہ میں کام آکر استقامت اور اپنے موقف کی حقانیت کا چراغ روشن کر گئے بعد میں آنے والی نسلوں نے جس سے روشنی پائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کس بیچارگی اور بے کسی کے ماحول سے اٹھے لیکن محض اپنے موقف کی حقانیت اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اور اپنی بے پناہ استقامت سے تاریخ کا رخ بدل کر رکھ دیا اور فرعون اپنی تمام تر قوت و حشمت اور اقتدار و طاقت کے باوجود محض اپنے کفرو جحود اور ناشکری کے باعث تاریخ میں عبرت کا نشان بن گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بظاہر اپنے مقصد کو نہ پاسکے لیکن اپنے ایثار قربانی اور جانفروشی و جانسپاری سے ایک ایسا منارۂ نور بن گئے کہ مہ و سال کی گردشوں کے ساتھ ساتھ ان سے فیض پانے والوں کا سلسلہ دراز تر ہوتا گیا۔

اسی طرح قرآن کریم جب اخلاقی اقدار کو بیان کرتا ہے تو اس کے ساتھ عملی بینات کو بھی پیش کرتا ہے مثلاً" جب وہ صبر کی تلقین کرتا ہے تو صبر ایوب کا بھی ذکر کرتا ہے۔ راہ حق میں استقامت اور قربانی کی ترغیب دیتا ہے تو حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کی قربانیوں کو بطور شواہد پیش کرتا ہے اللہ کی دین کی سربلندی اور نشرو

اشاعت کا جب حوالہ آتا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی بھر اس راہ میں صحرا نوردی بادیہ پیمائی مختلف ممالک کا سفر اس راہ میں پیش آنے والے مصائب گھر وطن اعزا و اقربا کی مفارقت و مہاجرت اور پھر اس راستے میں جسم و جان کی آزمائشیں سب کو نہایت تفصیل سے بیان کرتا ہے غرضیکہ حضرت نوح علیہ السلام کا جوش تبلیغ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی راہ حق میں بے خوفی اور غیرت حق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خلق و خالق کے لیے بے پناہ محبت حضرت یحییٰ علیہ السلام کی مسکینی و غربت اوز راہ حق میں سرفروشی حضرت ایوب علیہ السلام کا مصائب پر بے مثال صبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی محض اپنے مالک و آقا سے محبت و خلت اور اس راستے میں ایثار و قربانی کی بے نظیر اور درخشاں مثالیں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی خود سپردگی اور تسلیم و رضا یہ سب ہدایت کے بینات ہیں جنہیں قرآن پیش کرتا ہے۔

6- اس کتاب کی ایک اور صفت اور خصوصیت اس کا الفرقان ہونا ہے۔ یعنی یہ کتاب حق کی علامت اور شناخت ہے جس طرح نور کے آجانے سے تاریکی کافور ہو جاتی ہے یہ ممکن نہیں کہ طلوع آفتاب کے بعد اندھیرے کا وجود باقی رہے۔ اسی طرح قرآن حکیم ایک نور بلکہ منارۂ نور ہے یہ کتاب منیر ہے یہ روشن آفتاب ہے اس کی ہر بات واضح اس کا ہر حرف حرف آخر اور اس کا ہر قول قول فیصل ہے۔ پروردگار ارشاد فرماتا ہے تبارک الذی نزل القران علی عبدہ بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا۔ فرقان ہونے کا معنی کیا ہے۔ ارشاد فرمایا انہ لقول فصل وما ھو بالھزل یہ قول فیصل ہے کوئی مذاق نہیں۔ اس کی ہر بال اپنی صحت حفاظت حقانیت اور قابل عمل ہونے میں ہر شک و شبہ سے بالا ہے۔ مزید یہ کہ یہی حق کی کسوٹی اور پہچان ہے یہ نہ خود کسی ملاوٹ کو برداشت

کرتی اور نہ باطل اس کو برداشت کرسکتا ہے۔ اس کا رویہ اکل کھرا اور اس کی ہدایت بالکل واضح ہے۔ لکم دینکم ولی دین۔ اس کا مزاج ہے۔ ہوا کے رخ پر اڑنا پانی کے بہاؤ کے سہارے بہنا اس کے مزاج کے خلاف ہے۔ یہ کمپرومائز کرنا نہیں جانتا۔ جس طرح نور و ظلمت اکھٹے نہیں ہوسکتے۔ آگ اور پانی بہم نہیں رہ سکتے۔ ندی کے دو کنارے آپس میں نہیں مل سکتے۔ تاریخ کے دو باب اکھٹے نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح قرآن کا پیش کردہ حق کسی باطل کے ساتھ مفاہمت نہیں کرسکتا۔ جس طرح ہمارا پروردگار وحدہ لاشریک ہے اسی طرح اس کے احکام اس کی شریعت اس کی ہدایت بھی لاشریک ہے اس کے مقابل اور متصادم ہر چیز باطل ہے حق و باطل میں اشتراک مفاہمت یا اخذ و رد کا رویہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے توحید و شرک میں اشتراک اور مفاہمت اقبال نے ٹھیک کہا۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

شاید اسی الفرقان ہونے کی وجہ سے ہم قرآن کریم کی یہ خصوصیت دیکھتے ہیں کہ وہ حق و باطل سچ اور جھوٹ صحیح اور غلط کامیابی و نامرادی جیسے حقائق کو پہلو بہ پہلو اور ایک دوسرے کے بالمقابل پیش کرتا ہے۔ فرعون کے مقابلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نمرود کے بالمقابل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ قوم عاد کو اور حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ قوم ثمود اور ان کے انجام کو ضرور ذکر کرتا ہے جنت اور جہنم کا ذکر آپ ساتھ ساتھ دیکھیں گے۔ رحمت اور عذاب کی آیات یکے بعد دیگرے آئیں گی۔ اہل جنت اور اہل جہنم کا رویہ بھی ایک ساتھ بیان ہوگا۔ کفر کے نتیجے میں پیدا ہونے والے کردار اور اسلام کے نتیجے میں تیار ہونے والے کردار آپ کو ایک ساتھ نظر آئیں گے۔ سورہ الفرقان اور المومنون اس کی واضح مثالیں ہیں۔ یہ انداز قرآن کریم کے الفرقان یعنی حق و باطل میں کسوٹی اور امتیاز

ہونے کا مظہر ہے۔

اگر ہم غور و تدبر میں مزید ایک قدم بڑھائیں تو معلوم ہو گا کہ الفرقان ہونے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ یہ کتاب اپنے طرز تحریر اور طرز تخاطب میں اس حد تک واضح اور بے لاگ ہے کہ کسی قسم کا ابہام التباس اور کتمان باقی نہیں رہنے دیتی مگر دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اس کی تعلیمات اپنے ماننے اور عمل کرنے والوں کو اس کے نازل کرنے والے کی تائید و نصرت سے اس قابل بنا دیتی ہیں کہ وہ اپنے اخلاق و کردار اور حق و باطل میں معرکہ آرائی سے دنیا میں الفرقان بن جاتے ہیں۔ وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کے نشان اور حجت قاطعہ ٹھہرتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے پہلے حق و باطل کے معرکہ کے دن یعنی یوم بدر کو یوم الفرقان قرار دیا گیا ہے کیونکہ اسی دن حق و باطل میں واضح فیصلہ ہو گیا اور کوئی شک نہ رہا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آنحضرت ﷺ دونوں حوالوں سے الفرقان ہیں۔ ایک تو اس حوالے سے کہ قرآن کریم کی ہر آیت ہر حقیقت‘ ہر قانون‘ اور ہر حکم نے آپ کے عمل اور آپ کے نفاذ کے آئینہ میں اپنا حقیقی مفہوم پایا ہے اور آپ کے عمل اور عملی وضاحت نے اس کے فرقان ہونے کو بالکل مبرہن کر دیا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم قرآن ساکت ہے آپ قرآن ناطق ہیں۔ قرآن کریم قول ہے آپ عمل ہیں۔ قرآن کریم مجمل ہے آپ اس کی تفصیل ہیں۔ قرآن کریم متن ہے آپ اس کے شارح ہیں۔ قرآن کریم آئین ہے آپ اس کے مبین اور قانونی شکل دینے والے اور اس کے منفذ ہیں۔

اور دوسرا حوالہ یہ ہے قرآن کریم اگر جہد و عمل کا درس دیتا ہے وہ اگر استقامت کی ہدایت کرتا ہے وہ اگر مخالفتوں اور مصائب کی تاریکیوں سے غلبہ دین کے آفتاب کے طلوع ہونے کی حتمی نوید دیتا ہے اور بالاخر کفر کے سرنگوں ہونے اور اسلامی تحریک کے کامیاب و بامراد ہونے کا یقین دلاتا ہے تو ان تمام حقائق کو اپنے عمل میں ڈھال کر مسجد اور مکتب سے لے کر معرکہ کار زار تک کامیاب‘ بامراد کس نے کیا؟ صرف سرکار دو عالم نے۔ اس لحاظ سے

آنحضرت ﷺ سب سے بڑے الفرقان ہیں۔ اور آپ کی معیت اور تابعیت میں صحابہ کرام اور ان کے راستہ پر چلنے والے لوگ الفرقان ہیں۔

قرآن کریم کی بے شمار خصوصیات میں یہ چند خصوصی صفات ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ ان سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی کتنی عظیم نعمت ہے یعنی ہم ایک ایسی امت ہیں۔ جس کا ایک ایک فرد اپنے گھر میں ہیروں کا خزانہ اور کان رکھتا ہے لیکن انتہائی دکھ سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہم اس سے کماحقہ فائدہ نہیں اٹھا رہے۔ اس کے اسباب کیا ہیں اس کا ذکر انشاء اللہ اگلی صحبت میں کروں گا۔

# گذشتہ تقریر کا تتمہ

معزز و محترم حاضرین!

گذشتہ خطبہ میں، میں نے قرآن کریم کی چند خصوصی صفات کا ذکر کرنے کو بعد عرض کیا تھا کہ قرآن کریم اس امت کے لیے اللہ تعالیٰ کی بیش بہا نعمت ہے مگر افسوس ہم اس سے کماحقہ فائدہ نہیں اٹھا رہے۔ اس کی متعدد وجوہ ہیں جن میں سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس کتاب سے استفادہ کرنے اور فیضیاب ہونے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ قرآن کریم کا موضوع جیسا کہ آغاز کلام میں ذکر ہو چکا، انسان ہے اور قرآن کریم انسانوں کی اصلاح کا ایک نسخہ اور پروگرام ہے۔ لیکن ہمیں یہ علم ہی نہیں کہ اس کا طریق اصلاح کیا ہے؟ آپ اگر غور فرمائیں گے تو دیکھیں گے کہ اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے قرآن کریم کا طریق اصلاح بھی یقیناً وہی ہونا چاہیے جس کا فطری اظہار کائنات کی تعمیر و اصلاح میں ہوا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں جہاں کہیں بھی تعمیر کا ظہور نظر آتا ہے۔ اس کے ظہور پذیر ہونے کے لیے دو چیزیں لازمی ہیں۔ ان کے بغیر تعمیر کا عمل مکمل نہیں ہو سکتا۔ پہلی چیز ہے تخریب اور دوسری چیز ہے صالح مادہ تعمیر جس میں مطلوبہ نتائج دینے کی صلاحیت موجود ہو۔ آپ کسی بھی تعمیر کا تصور کیجئے جب تک آپ تخریب سے اس کا آغاز نہیں کریں گے۔ تعمیر کے مرحلہ میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔

میں تفہیم کے لیے ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ فرض کیجئے آپکو ایک قطعہ زمین دیا جاتا ہے کہ آپ اس سے اپنے لیے معیشت کا سامان پیدا کیجئے۔

اور اس قطعہ زمین کا حال یہ ہے کہ اس میں جا بجا ٹیلے سر اٹھائے کھڑے ہیں گہری کھائیاں ہیں قدر آور درخت ہیں بیلوں اور جھاڑیوں نے زمین کا ایک ایک انچ روک رکھا ہے نشیب و فراز کی وجہ سے آبیاری ممکن نہیں اور جڑی بوٹیوں کی بہتات کی وجہ سے تخم ریزی کا کوئی امکان نہیں۔ اس صورت میں آپ کیا کریں گے؟ یقیناً آپ اپنے سفر کا آغاز تخریب سے کریں گے۔ آپ کسیّ ہاتھ میں لے کر جڑی بوٹیوں کو تلف کریں گے۔ کلہاڑا لے کر درخت اکھاڑیں گے۔ کسی بلڈوزر سے ٹیلوں کو اٹھائیں گے اور کھائیوں کو پر کریں گے۔ جب زمین کا سینہ جڑی بوٹیوں درختوں اور خود رو پودوں سے خالی ہو جائے گا اور زمین تخم ریزی اور آبیاری کے لیے ہموار ہو جائے گی تو اب آپ ہل جوتیں گے اور تخم پاشی کا سامان کریں گے۔ اب آپ تعمیر کے مرحلے میں داخل تو ہوگئے مگر اب آپ کے لیے نہایت نازک مرحلہ صالح بیج کا مہیا کرنا ہے۔ اگر آپ نے غلط بیج کاشت کر دیا یا احتیاطی تدابیر بروئے کار نہ لاسکے تو آپ کی ساری محنت اکارت جائے گی۔ یا آپ نے زمین کو تخم پاشی کے قابل بنا کر چھوڑ دیا۔ یعنی تخریبی عمل کے بعد تعمیری عمل کے لیے محنت اور کوشش نہ کی تو زمین کی قوت نمو کو اپنا کام کرنے سے تو نہیں روکا جاسکتا وہاں پھر جڑی بوٹیاں اگیں گی خود رو پودے سر اٹھائیں گے اور پھر یہ زمین جنگل کا منظر پیش کرنے لگے گی۔

بالکل یہی حال انسانی دل و دماغ کا ہے۔ قرآن کریم اور حدیث پاک میں انسانی دل کو زمین سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں بھی ایک قوت نمو ہے۔ اس میں بھی افکار کی فصل اگتی اور خواہشات کے خود رو پودے سر اٹھاتے اور امیدوں اور آرزوؤں کی جڑی بوٹیاں پھیلتی ہیں۔ اس میں بھی جھوٹی انا کے قد آور درخت عصبیت و حمیت جاہلیہ کے ٹیلے اور کینہ و بغض کی کھائیاں موجود ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اپنے دل و دماغ کی زمین میں صالح افکار کی کاشت کرنا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے تخریبی مرحلے سے گذرنا ہوگا۔ اسے سب سے پہلے باطل افکار غلط خیالات جھوٹی آرزوؤں فرسودہ تصورات ناآسودہ تمناؤں

اور جھوٹے ازموں سے وابستگی اور جھوٹے پندار اور جھوٹی انا کی گرفت اور رسم و رواج کی پابندی جیسی زنجیروں کو توڑنا ہوگا اور پھر اپنے اصلاحی اور تعمیری سفر کو وہیں پر ہی ختم نہیں کر دینا بلکہ صالح افکار اور زندہ و پائندہ تصورات کے بیج کو تلاش کر کے صحیح طریق سے اپنے دل و دماغ کی زمین میں کاشت کرنا ہوگا اگر ان دونوں باتوں میں سے کسی میں بھی جھول آگیا تو ساری محنت اکارت جائے۔ گی۔ یہی بات اقبال مرحوم نے اپنے انداز میں کہی:

؎ نہادِ زندگی میں ابتدا لا انتہا الاّ
پیامِ موت ہے جب لا ہوا الا سے بیگانہ
وہ ملت روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ

لا سے مراد وہی تخریبی عمل ہے جو تعمیری مرحلے کی تمہید ہے اور الا وہ مادہ تعمیر اور صالح افکار اور عمل صالح کا بیج ہے جس کے نتیجے میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کی فصل لہلہاتی اور بار آور ہوتی ہے۔

اسلام انسانی اصلاح کا جو طریقہ اختیار کرتا ہے وہ یہی فطری طریقہ ہے البتہ اس میں وہ ایک تیسرے عنصر کا اضافہ کرتا ہے جس کا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔ اور اس سہ نکاتی طریق اصلاح کو وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے عنوان سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے وہ انسان جو اپنے اللہ سے برگشتہ ہو چکے ہیں۔ انہیں سب سے پہلے لا الہ پر عمل کرنا ہوگا۔ یعنی انہوں نے اپنے دل میں جتنے غیر اللہ کے بت بنائے ہوئے ہیں وہ توڑ پھینکیں جتنے آستانوں سے وابستگیاں بنا رکھی ہیں سب سے توبہ کریں جتنے خوف غیر اللہ کے بسا رکھے ہیں انہیں دل سے نکال دیں۔ جتنی محبتیں اور امیدیں غیر خدا کی دل میں پال رکھی ہیں ان سے قطع تعلق کریں۔ زندگی کے سفر میں جہاں کہیں غیر اللہ سے اثر پذیری مرعوبیت اندیشہ ہائے دور و دراز دانش برہانی کی معصومیت کا یقین یا امیدوں کی شکست و ریخت جیسے تصورات اگر کہیں موجود ہیں تو دل کو ان سے پاک کریں اور جب یہ دل اور اس کے احساسات، ایسی تمام کمزوریوں، اور

آلودگیوں سے پاک ہو جائیں تو اب قرآن کریم کے حیات بخش افکار کا بیج ایمان کی شکل میں اس یقین کے ساتھ کاشت کریں کہ قرآن کریم کا دیا ہوا ضابطہ حیات اور طرز زندگی ہی حیات بخش اور انسان کی فلاح کا ضامن ہے اس کا دیا ہوا ہر نظریہ محکم اور ہر قول حرف آخر ہے۔ مخلوق کے بنائے ہوئے نظریات غلط بھی ہو سکتے ہیں اور صحیح بھی۔ مخلوق کی عقل و دانش کے فیصلے رسا بھی ہوسکتے ہیں اور نارسا بھی۔ مگر خالق انسان کا علم نہ غلط ہو سکتا ہے نہ نارسا اس لیے جب کبھی خلق اور خالق کے دیئے ہوئے افکار اوامرو نواہی طرز حیات اور حسن و قبح کے معیارات میں تصادم ہو گا تو مخلوق سے منہ پھیر کر خالق کی طرف لوٹنا ہو گا۔

یہی وہ بات ہے جسے سورہ بقرہ میں بہ ایں الفاظ بیان فرمایا گیا۔ فلا تخشوا الناس واخشون ولاتم نعمتی علیکم ولعلکم تھتدون لوگوں سے نہ ڈرو (پرواہ نہ کرو) اور مجھ سے ڈرو تاکہ میں اپنی نعمت تم پر تمام کروں اور تاکہ تم ہدایت پاجاؤ۔ پھر تکمیل دین کی آیت میں اپنی نعمت یعنی قرآن پاک کے اتمام کا وعدہ پورا فرمانے کا اعلان فرمایا اور اس سے پہلے کی آیت میں پھر اس ہدایت اور تنبیہہ کو ان الفاظ میں دھرایا الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشو ھم واخشون آج کافر تمہارے دین سے مایوس ہوگئے ہیں پس تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرو۔ مولانا محمد علی جوہر کا ایک واقعہ اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے:

مولانا عبدالماجد دریا آبادی راوی ہیں کہ میں ایک دفعہ مولانا سے ملنے گیا ان کے کمرے میں قدم رکھا تو یہ دیکھ کر ٹھٹھک گیا کہ قرآن کریم مولانا جوہر کے سامنے ہے اور وہ زار و قطار رو رہے ہیں میں فورا" باہر آگیا انتظار کیا مگر دیر تک ان کی طبیعت نہ سنبھلی تو مجبورا اندر داخل ہوگیا میرے پاؤں کی آہٹ سن کر مولانا نے سر اٹھایا مجھے دیکھ کر اپنے آپ کو سنبھالا۔ پرسکون ہونے پر میں نے رونے کا سبب پوچھا تو قرآن پاک کی طرف اشارہ کیا میں نے غور سے دیکھا تو مذکورہ بالا آیت آپ کے سامنے کھلی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ میں جب ابھی

اس آیت کو پڑھتا ہوں تو اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ پروردگار تکمیل دین اور اتمام نعمت کو فلا تخشنوھم واخشونی کا ثمر قرار دے رہا ہے اور میرا حال یہ ہے کہ میں کبھی اپنے آپ کو غیر اللہ کے اثرات سے آزاد نہیں پاتا۔ میری دانش' فرنگی دانش سے متاثر ہے میرا ایمان ہندو اثرات سے آلودہ ہے میرا دل مختلف خواہشوں اور آرزوؤں سے لبریز ہے۔ میرے دماغ پر مختلف مصلحتوں کا پہرہ ہے اور میرا ہر قدم کئی قسم کے اندیشوں سے گراں بار ہے۔ میں اس کے دین اور اس کے قرآن سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ یہ وہ احساسات ہیں جو مجھے بے چین رکھتے ہیں۔ مولانا فی الحقیقت اپنے حوالے سے پوری امت کی داستان کہہ رہے تھے۔ شاید یہی وہ تاثر تھا جس نے مولانا سے یہ لافانی شعر کہلوایا:

؎ توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

درحقیقت آج مسلمانوں کی اس منبع رشد و ہدایت سے محرومی کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ ذہنی تحفظات علمی آلودگیوں اور قلبی وابستگیوں کے ساتھ اس کتاب کی طرف رجوع کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ہمیں مغرب سے لیے ہوئے افکار کو بھی نہ چھوڑنا پڑے اپنے معمولات کو بھی نہ بدلنا پڑے اور اپنی قلبی وابستگیوں سے بھی دستبردار نہ ہونا پڑے اور ان کے ساتھ ساتھ قرآن کی برکات سے جھولیاں بھی بھرلیں ظاہر ہے یہ تو کفر اور ایمان نور و ظلمت زمین اور آسمان اور آگ اور پانی کو اکٹھا کرنے والی بات ہے۔ قوموں کی زندگی میں یہی مرحلہ ہمیشہ دشوار رہا ہے۔ بقول اقبال:

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اسے مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ آپ ایک ایسے شخص کے سامنے تخلیق آدم اور خلافت آدم کا قرآنی نظریہ پیش کرتے ہیں جو ڈارون کے نظریہ ارتقا کا اسیر ہے یا ایک ایسے شخص کے سامنے قرآن کا نظام معیشت پیش کرتے

ہیں جو سوشلزم یا سرمایہ داری کو جملہ تفاصیل سمیت برحق سمجھتا ہے یا ایک ایسے آدمی سے قرآن کے بیان کردہ فلسفہ عروج و زوال اقوام کا ذکر کرتے ہیں لیکن وہ روسو جان لاک یا برٹرینڈ رسل جیسے دانش وروں کی دانش پر ایمان لاچکا ہے۔ ظاہر ہے ایسا آدمی قرآن کریم سے اس وقت تک کیا فائدہ اٹھائے گا جب تک اپنے اختیار کردہ خیالات کے خول سے باہر نہیں نکلتا۔ اس لیے قلب و دماغ کی اصلاح اور زندگی کے معمولات میں صحت مند تبدیلی کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس جھاڑ جھنکار سے دلوں اور دماغوں کو صاف کیا جائے جو قرآن کریم کی ہدایت، فکر، تعلیم اور نظام کے خلاف ہیں اور پھر افکار قرآنی کا صالح بیج دل و دماغ کی زمین میں بویا جائے یعنی اس طریق اصلاح میں اولاً" دل و دماغ کی زمین کو باطل اعتقادات فرسودہ خیالات غیر اسلامی رسم و رواج اور غیر خدا سے وابستگیوں کو ختم کرنا ہوگا۔ کیونکہ ان کی موجودگی میں کوئی صالح فکر کا بیج بھی اپنی جگہ نہیں بنا سکتا پھر اس کے فوری بعد قرآنی افکار کا بیج بونا ہوگا ورنہ دل کی زمین کو اگر خالی چھوڑا گیا تو وہاں پھر پہلے جیسے خود رو پودے اگ کر اسے جنگل میں تبدیل کر دیں گے اور وہی حادثہ ہوگا جو اہل مغرب کو پیش آیا انہوں نے لاکو تو خوب استعمال کیا بلکہ ضرورت سے زیادہ استعمال کیا لیکن الا اللہ تک نہ پہنچ سکے نتیجتہ" ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی بے خدا تہذیب خدا بیزار تمدن اور خواہشات و مرغوبات کی پرستار معاشرت کی نذر ہو کر رہ گئی۔ اسی کی طرف اقبال اشارہ کرتے ہیں:

ے لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مئے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الا

عام فطری طریق اصلاح کا کام تو ان دو نکات کو بروئے کار لانے سے مکمل ہو جاتا ہے مگر انسانی اصلاح کا معاملہ ایک تیسری ضرورت کا بھی متقاضی ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ کتابی افکار سے کم، انسانی سیرت و کردار کے نمونوں سے زیادہ متاثر ہوتا ہے جس طرح دیئے سے دیا جلتا ہے اسی طرح آدمی سے آدمی بنتا ہے اور زندگی کا چراغ زندگی کے چراغ سے روشن ہوتا ہے اسی

لیے ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی بھی انقلاب صرف افکار اقوال اور کتابوں سے نہیں آیا بلکہ ہر انقلاب کے پیچھے کوئی نہ کوئی زور دار شخصیت رہی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی اصلاح کے لیے صرف کتابیں نہیں اتاریں ساتھ پیغمبر بھی بھیجے جنھوں نے قول کو عمل فکر کو تحریک افراد کو قوم اور ہدایت کو شخصیت کی صورت میں ڈھال کر انقلابی تبدیلی کا راستہ صاف کیا اور یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جن قوموں کے پاس شخصیت کا ماڈل اور کردار کا اسوہ اور سیرت پیغمبر کا عملی نمونہ موجود نہیں ہے وہ کبھی بھی کسی صالح تبدیلی اور اخلاقی تعمیر میں کامیاب نہیں ہو سکیں اسی کو اقبال کہتے ہیں:

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
جہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

اس لیے اسلام نے محمد رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے اس تیسری ضرورت کو بھی پورا کیا۔ یعنی لا سے دل و دماغ کی زمین کو قابل کاشت بنایا۔ پھر الا اللہ کی تخم ریزی کی گئی۔ اب سوال یہ تھا اس طریق اصلاح کا رہنما کون ہو جو ہمیں اس پورے عمل کو بروئے کار لا کر دکھائے اور ہم پورے اطمینان سے اس پر عمل کر سکیں۔ چنانچہ محمد رسول اللہ کہہ کر اس طریق اصلاح کی مکمل صورت گری کر دی گئی۔ اس طرح لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ جو اس طریق اصلاح کا عنوان تھا اس کی تکمیل ہو گئی چنانچہ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے پاس مئے اصلاح اور صہبائے انقلاب ہی نہیں آنحضرت کی صورت میں ساقی بھی میسر ہے اسی لیے پروردگار نے قرآن کریم میں جابجا آنحضرت کی صفات کا ذکر فرمایا اور آپ کے اتباع کا امت مسلمہ کو حکم دیا گیا۔ کیونکہ آپ فی الحقیقت عملی قرآن ہیں ان متعدد مقامات میں سے ہم صرف ایک کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

ارشاد فرمایا انا ارسلنک شاھدا" و مبشرا" و نذیرا" و داعیا" الی اللہ باذنہ و سراجا" منیرا" ہم نے تمہیں شاہد مبشر نذیر اور داعی اللہ اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے اور پھر فرمایا لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین اسوہ موجود ہے۔ (اس

کی پیروی کرو) یعنی قرآن کریم کتاب منیر اور آنخضرت سراج منیر ہیں دونوں کی روشنی سے اکتساب کرو۔ اس طرح لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے سہ نکاتی طریق اصلاح کی تکمیل ہوجاتی ہے لیکن جب ہم آنخضرت کا اسوہ اس معاملے میں دیکھتے ہیں تو ہمیں عجیب صورتحال نظر آتی ہے جس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ روشنی ڈالتا ہے ایک دفعہ حضرت عمر کو کہیں سے تورات کے کچھ اجزاء ملے۔ آپ کو بے انتہا خوشی ہوئی کہ یہ ایک سابقہ آسمانی کتاب کے اجزاء ہیں۔ خوشی خوشی آنخضرت کے پاس لائے اور پڑھ کر سنانے لگے حضرت صدیق اکبر پاس ہی بیٹھے تھے ان کی جو اچانک نظر آنخضرت کے روئے مبارک پر پڑی تو یہ دیکھ کر کانپ اٹھے کہ آنخضرت کا چہرہ غضب سے تمتما رہا ہے۔ انہوں نے حضرت عمر کو توجہ دلائی تو وہ بھی تھرا اٹھے۔ ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ حضور خفگی کا سبب یہ ناچیز سمجھ نہیں سکا۔ تب آنخضرت نے فرمایا۔ عمر، کیا قرآن کریم کے نازل ہو جانے اور میرے آجانے کے بعد بھی تمہیں مزید کسی ہدایت کی ضرورت ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے آج اگر موسیٰ علیہ السلام بھی آجائیں تو انہی بھی میرے اتباع کے سوا چارہ نہ ہوگا۔ اس سے اندازہ فرمایئے کہ آنخضرت ﷺ کا اسوہ قرآن کریم سے استفادہ کے معاملے میں کیا ہے؟ وہ اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتے کہ کسی آسمانی کتاب سے بھی رہنمائی حاصل کی جائے کیونکہ وہ منسوخ ہو چکیں نیز تحریف و ترمیم کا شکار ہوگئیں۔ تو کسی اور رہنمائی کا کیا تصور ہو سکتا ہے اور کسی اور ازم کی کیا گنجائش نکل سکتی ہے اس لئے مسلمان پابند نہیں کہ اپنے انفرادی اور اجتماعی مسائل میں صرف قرآن و سنت سے رہنمائی لیں اور ادھر ادھر کی دریوزہ گری سے توبہ کریں۔ پھر اسی پر بس نہیں بلکہ یہ بھی ہدایت دی گئی کہ اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کی رہنمائی کو تقسیم کرنا اور نہ کسی اور رہنمائی کی شرکت اس میں گوارا کرنا یہ نہ کرنا کہ عبادت کا طریقہ قرآن کریم سے لے لو اور معاشرت مغرب سے معیشت سوشلزم سے قانون سوئیزرلینڈ سے رسم و رواج ہندوؤں سے ارشاد فرمایا۔ افتومنون ببعض الکتاب و تکفرون

ببعض کیا تم کتاب اللہ کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک حصے کا انکار کرتے ہو۔ مسجد میں آکر اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکاتے ہو اور پارلیمنٹ ہاؤس میں ایوان حکومت میں عدالتوں میں تعلیمی اداروں میں ثقافتی مراکز میں شیطان کے سامنے جھکتے ہو یا اپنی خواہش نفس کے سامنے مزید فرمایا فما جزاء من یفعل ذلک منکم الاخزی فی الحیوۃ الدنیا و یوم القیامۃ یردون الی اشد العذاب تم میں سے جو کوئی بھی یہ رویہ اختیار کرے گا اس کا بدلہ دنیا کی زندگی میں رسوائی ہوگا اور قیامت کے دن وہ بدترین عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ ہمیں آج رونا ہے کہ زندگی کے مسائل الجھتے جارہے ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی مشکلات میں آئے دن اضافہ ہوتا جارہا ہے زندگی ایک بوجھ بنتی جارہی ہے غریب اور سفید پوش آدمی سے جس کا اٹھانا مشکل ہوتا جارہا ہے مگر جب ہم اس کے اسباب کی تلاش میں نکلتے ہیں تو ہر دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں ہر آستانے پر سر پٹکتے ہیں ہر دانشگاہ کی دریوزہ گری کرتے ہیں مگر زندگی کی رہنما کتاب یعنی قرآن کریم سے کبھی نہیں پوچھتے کہ ہماری اس ابتری اور حرمان نصیبی کا سبب کیا ہے؟ حالانکہ قرآن کریم پکار پکار کر کہہ رہا ہے من اعرض عن ذکری فان له معیشۃ صنکا و نحشرہ یوم القیامۃ اعمی قال رب لم حشر تنی اعمی و قد کنت بصیرا قال کذالک اتتک آیاتنا فنیسیتھا و کذالک الیوم تنسی جس نے میرے ذکر یعنی قرآن کریم سے اعراض برتا (لا پرواہی کی یعنی اس کی ہدایات سے منہ پھیرا) تو ہم اس کی روزی اور زندگی تنگ کر دیں گے اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا اے رب تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا حالانکہ میں بینا تھا اللہ، فرمائے گا تیرے پاس (ہمارے قرآن) کی آیات آئیں تو نے انہیں طاق نسیان پر رکھ دیا اور انہیں بھلا دیا اسی طرح آج تجھے بھی بھلا دیا گیا ہے۔ مذکورہ آیہ کریمہ میں قرآن کریم کو ذکر کے لفظ سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ قرآن کے ناموں میں ایک نام ہے۔ جس آیت میں قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ فرمایا گیا ہے اس میں بھی اسی نام سے قرآن کریم کو موسوم کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون ہم

نے اس ذکر یعنی قرآن مجید کو اتارا ہے ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ ان آیات میں غور فرمائیے قرآن کریم سے اعراض اور انحراف کا نتیجہ دنیا میں زندگی کی تنگی ہے اور آخرت میں حرمان نصیبی زندگی کی تنگی سے مراد صرف تنگدستی نہیں بلکہ اس سے مراد آسودگی اور اطمینان کا میسر نہ ہونا ہے اور ایسا صرف تنگدستی ہی کیوجہ سے نہیں ہوتا بلکہ کتنے امراء اور دولت مند ہیں جنہیں دولت میسر ہے لیکن آسودگی میسر نہیں۔ ایک بے کلی' بے چینی اور بیزاری ہمیشہ ان کا مقدر بنی رہتی ہے۔ چونکہ ان کی زندگی قرآنی رہنمائی سے خالی اور قرآن کے نور سے محروم ہے اس لیے وہ ہمیشہ اپنے ضمیر سے لڑتے ہوئے ایک مستقل بے کلی کا شکار رہتے ہیں۔ اور دوسرے لوگ ان کے استحصال استیصال اور بدمعاملگی و بد اطواری کا شکار ہو کر زندگی کی تلخیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا بھی گئی اور آخرت بھی گئی۔ امت مسلمہ کے ساتھ یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے اور اس امت کے افراد قرآن کے حقیقی فیض سے اس لیے محروم ہیں کہ وہ اس کتاب کو بھی باقی کتابوں کی طرح ایک کتاب سمجھتے ہیں جو صرف بے سوچے سمجھے پڑھ لی جاتی ہے یا ترنم سے اسے گالیا جاتا ہے یا بہت آخرت کا خیال ہوا تو اسے طوطے کی طرح رٹ لیا اور اسے بے سمجھے زندگی بھر دھراتے رہے۔ اور یا زیادہ سے زیادہ یہ سمجھ لیا کہ اس کتاب کے پڑھنے سے بہت ثواب ملتا ہے اس لیے رمضان المبارک میں اسے تراویح میں بھی سنا جاتا ہے اور خود بھی زیادہ سے زیادہ تلاوت کی جاتی ہے۔ مقصد کیا ہوتا ہے؟ صرف حصول ثواب، اور اگر کوئی مرجائے تو تب ایصال ثواب کے لیے اسے پڑھا جاتا ہے اور کبھی حصول شفا کے لیے اسے پڑھ کر پھونکا جاتا ہے ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اس کے ایک ایک لفظ پر نیکیاں ملتی ہیں۔ اس کی تلاوت سے ایصال ثواب بھی کیا جاسکتا ہے اس کے پھونکنے سے شفا بھی ہوتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ یہ کتاب عزیز کیا ان مقاصد کے لیے نازل ہوئی تھی؟ یہ تو اس کے ضمنی فوائد ہیں جو بہرصورت حاصل ہوتے ہیں یہ اس کے مقاصد نہیں ہیں لیکن :

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کرگیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی تھا

یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص چڑیوں اور کوؤں کے شکار کے لیے توپ فائر کرے یقیناً جو جانور اس کی زد میں آئیں گے ضرور مریں گے۔ لیکن کیا توپیں اس لیے فائر کی جاتی ہیں توپیں تو قلعوں کی فصیلیں توڑنے اور دمدمے اڑانے کے لیے فائر کی جاتی ہیں۔ اسی طرح یہ کتاب اللہ بھی محض کتاب نہیں اسے ان چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے نازل نہیں کیا گیا کاش ہم نے اس حقیقت کو سمجھا ہوتا کہ یہ کتاب اس خدائے برتر کا کلام ہے جس کے ایک حرف کن سے کائنات وجود میں آئی اور جس کے حکم سے زمین سورج چاند ستارے محو حرکت اور اپنے اپنے فرض کی ادائیگی میں مصروف کار ہیں۔ جس کے حکم سے پانی بہتا آگ بھڑکتی سورج چمکتا ہوائیں چلتی بادل کڑکتے اور بجلیاں کوندتی ہیں۔ وہ اگر چاہے تو سمندر پایاب ہو جائیں صحرا سے حباب اٹھنے لگیں دریا دھواں اگلنے لگیں پہاڑ پھٹ جائیں زمین کا سینہ شق ہو جائے یہ کتاب اس خداوند ذوالجلال کے فرامین کا مجموعہ ہے یہ وہ کتاب ہے جس کا ہر قول قول فیصل اور جس کا ہر حکم قطعی الثبوت اور محکم الدلالت ہے۔ کیونکہ اس کی تعریف لاریب فیہ ہے یہ اپنی پیروی کرنے والوں کو ایک مضبوط راستے کی رہنمائی کرتی اور کامیابی و کامرانی کی بشارت دیتی ہے کیونکہ یھدی للتی ھی اقوم ویبشر المومنین اس کی شان ہے۔ یہ حق و صداقت کی مناد و مبلغ اور شناخت اور پہچان ہے کیونکہ نزل الکتاب بالحق اس کا امتیاز ہے باطل کبھی اس کے قریب نہیں پھٹک سکتا کیونکہ یسلک من بین یدیہ و من خلفہ رصدا اس کا طفرہ ہے۔ یہ کتاب کتاب انقلاب ہے جس نے عرب جیسی ناقابل ذکر وحشی اور غیر متمدن قوم میں ایسا ہمہ گیر انقلاب برپا کیا کہ دیکھتے دیکھتے وہ قوم پوری دنیائے انسانیت کے لیے ہدایت اور رحمت کا پیغام بن گئی اور جس نے چند ہی سالوں میں نصف سے زیادہ زمین پر ایک عادلانہ اور منصفانہ نظام قائم کر دیا اور اللہ کے وہ بندے جو سچائی اور راستی کی ہر بات اور ہر طریقے کے دشمن تھے وہ

اخلاق کے پیر نمونے اور حق و راستی کے گواہ بن کر کھڑے ہو گئے۔

اگر ان باتوں کا ہلکا سا تاثر بھی ہمارے ذہنوں میں ہوتا تو اس کی ایک ایک بات ہمارے غور و فکر کا موضوع بنتی اس کے احکام سے سے ہمارے دل پگھلتے اور جسموں پر کپکپی طاری ہو جاتی اس کی بشارتیں ہماری فرحت و مسرت کا سامان اور اس کے انذار ہماری فکر مندی اور تبدیلی کے محرک ہوتے۔ ہم اس کی ایک ایک آیت کو اپنے نام اپنے مالک کا پیغام سمجھ کر فخر و انبساط سے جھومتے اور اس کی ذمہ داری کو محسوس کر کے گراں بار ہوتے۔ ہم اس کے پیغام کو اللہ کی زمین پر رہنے والوں تک پہنچانے کے لیے پریشان اور اس کے ماننے والوں پر نافذ اور قائم کرنے کے لیے فکر مند ہوتے۔ ہم اسے طاقوں میں سجانے کی بجائے دلوں میں سجاتے اور اسے تعویذ بنانے کی بجائے زندگی کا عمل بناتے۔ ہم اسے صرف حصول ثواب یا ایصال ثواب کی کتاب نہ سمجھتے بلکہ اسے کتاب زندگی اور کتاب انقلاب سمجھ کر اپنی زندگی اس کی رہنمائی میں دے دیتے اور اجتماعی زندگی میں اس کے ذریعہ انقلاب برپا کرتے۔ نتیجتہً ہماری دنیا بھی خیر و بھلائی کا گہوارہ ہوتی اور آخرت میں اللہ کی رضا و خوشنودی ہمارے انتظار میں ہوتی۔ دنیا کی قوموں میں ہمارا ایک مقام اور وزن ہوتا اور دنیا کے فیصلے ہمارے بغیر ادھورے رہتے مگر آج ہم روئے زمین پر ایک ایسی امت ہیں جن کے پاس قرآن کریم کی شکل میں ہیروں کی ایک کان موجود ہے مگر ہم اسے خزف ریزے سمجھ کر پس پشت پھینک چکے ہیں۔ ہمارے پاس زندگی کے ایک ایک مسئلے کا حل موجود ہے مگر ہم اسے درخوار اعتنا سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔ ہمارے پاس ایک بہترین نظام زندگی میسر ہے مگر اسے نافذ کرنے کے لیے آمادہ نہیں۔ ہمارے ہاتھوں میں عصائے موسی ہے لیکن ہم جادو گروں کی رسیوں سے خوف زدہ ہیں۔ ہمارے پاس ایک مشعل حق ہے لیکن ہم تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے پر مصر ہیں۔ قرآن ہم سے فریاد کرتا ہوا سنائی دیتا ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے ہم کب اس پر کان دھریں گے۔

# قرآن کی فریاد

؎ طاقوں میں سجایا جاتا ہوں آنکھوں سے لگایا جاتا ہوں
تعویذ بنایا جاتا ہوں دھو دھو کے پلایا جاتا ہوں
جس طرح سے طوطے مینا کو کچھ بول سکھائے جاتے ہیں
اس طرح پڑھایا جاتا ہوں اس طرح سکھایا جاتا ہوں
جب قول و قسم لینے کے لیے تکرار کی نوبت آتی ہے
پھر میری ضرورت پڑتی ہے ہاتھوں پہ اٹھایا جاتا ہوں
دل سوز سے خالی رہتے ہیں آنکھیں ہیں کہ نم ہوتی ہی نہیں
کہنے کو میں اک اک جلسہ میں پڑھ پڑھ کے سنایا جاتا ہوں
نیکی پہ بدی کا غلبہ ہے سچائی سے بڑھ کر دھوکا ہے
اک بار ہنسایا جاتا ہوں سو بار رلایا جاتا ہوں
یوں مجھ سے محبت کے دعوے قانون پہ راضی غیروں کے
یوں بھی مجھے رسوا کرتے ہیں ایسے بھی ستایا جاتا ہوں
کس بزم میں مجھ کو بار نہیں کس عرس میں میری دھوم نہیں
پھر بھی میں اکیلا رہتا ہوں مجھ سا بھی کوئی مظلوم نہیں

# تکمیلِ انسانیت میں روزہ قیام اللیل اعتکاف اور لیلۃ القدر کا کردار

میرے بزرگو بھائیو اور عزیزو!

انسان کے دو اساسی تصورات یا دو بنیادی جوہر ہیں۔ جن پر اس کی معنوی روحانی اور اخلاقی زندگی کا مدار ہے اور پھر اسی کے نتیجے پر اس کی پوری زندگی اور اس کے اداروں کی صحیح یا غلط تعمیر و تشکیل ہوتی ہے۔ اگر یہ دو بنیادی جوہر ٹھیک کام کریں تو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی اپنی حدود میں محدود رہ کر انسانی بھلائی کے کام آتی ہے اور اگر ان دونوں میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو انسان نہ صرف اپنی اصل حیثیت گم کر بیٹھتا ہے بلکہ زمین کو بگاڑ سے بھر دیتا ہے اور اہل زمیں کے لیے ایک عذاب بن جاتا ہے۔

ان دو اساسی تصورات میں سے پہلا تصور خودشناسی ہے۔ انسان کی پہلی بنیادی ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنی حیثیت کو سمجھے اس کا ادراک پیدا کرے اور اس کی حدود کو پہچانے۔ اسی پر اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر اس کے اداروں کی بقا اور اس کے سفر زندگی کے مستقیم اور محفوظ ہونے کا دار و مدار ہے اور اگر اس میں کہیں کجی یا کج روی پیدا ہو جائے یا اس کے تعین میں کوتاہی ہو جائے تو پھر تاریخ اس پر شاہد ہے اور خود ہمارا حال اس پر گواہ ہے کہ انسانی زندگی میں وہ بگاڑ پیدا ہوتا ہے جس کا تریاق نہ انسانی دانش کے پاس ہے نہ ہمارے مروجہ رہنمائی کے ادارے اس میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور وہ نہ احتسابی قوتیں اس بگاڑ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مفاسد کے سدباب میں

کامیاب ہوتی ہیں۔

اس بگاڑ یا خود شناسی میں ناکامی کی عموماً" دو صورتیں رہی ہیں۔ کبھی اپنی حیثیت کا غلط اندازہ کرتے ہوئے خود کو ان بلندیوں پر فائز کر دینا جس کا انسان استحقاق نہیں رکھتا اور کبھی اس قدر پستیوں میں اپنے آپ کو گرا دینا جو اس کے مقام و مرتبہ سے نہایت فروتر ہیں۔ پہلی صورت کے نتیجے میں انسان کی تاریخ عہد رفتہ کے فرعونوں سے اور عصر حاضر کے ہٹلروں سے معمور ہے اور دوسری صورت کے نتیجے میں عصر رفتہ میں ہم انسانی سروں کو پتھروں کے خود ساختہ خداؤں کے سامنے نسلی بادشاہوں اور سرداروں کے سامنے تقدس و شخصیت کے دعویداروں اور عناصر فطرت اور مظاہر قدرت کے اوتاروں کے سامنے جھکتا ہوا نیز انسانوں کو غلاموں کی شکل میں انسانوں کی بندگی کرتے ہوئے اور بازاروں میں بکتا ہوئے دیکھتے ہیں اور موجودہ دور میں ہیرو ورشپ میں مبتلا پارٹیوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو دیو استبداد کے سامنے جھکتا ہوا اور عالمی اداروں میں غلاموں سے بھی بدتر حالت میں قوموں کو بکتا ہوا دیکھتے ہیں' انسانی بصیرت کی تاریخ بھی ایک اعجوبہ سے کم نہیں۔ یہ انسان خود شناسی سے محروم ہو کر کبھی ایسے پندار میں مبتلا ہوتا ہے کہ اپنے خالق و مالک کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے اور کبھی ایسی پستیوں کا شکار ہوتا ہے کہ پتھر کے گھڑے ہوئے خداؤں کے سامنے سر جھکا دیتا ہے انسانی زندگی میں یہ افراط و تفریط ہی وہ اصلی روگ ہے جس نے ہمیشہ انسان کو اعتدال اور توازن سے محروم رکھا ہے۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسے خود شناسی سے بہرہ ور کیا جائے اسے معلوم ہو کہ اس کی اصل حیثیت نہ ذات کا جھوٹا پندار ہے اور نہ پستی و فروتنی بلکہ اس کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ بندہ ہے کوئی خود سر اور آزاد انسان نہیں کہ جو اس کے جی میں آئے کرتا رہے اور نہ وہ کوئی خود رو پودا ہے کہ جو مل دل کے ختم ہو جائے بلکہ وہ ذمہ داریوں سے گراں بار زندگی رکھتا ہے یہ زندگی ایک مہلت عمل ہے اس میں کئے ہوئے ہر عمل اور اس میں گذارے ہوئے ہر پل کی اسے جواب دہی کرنا ہے۔ یہاں پہنچ کر ایک

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بندگی کس کی؟ کیونکہ بجائے خود بندگی تو کوئی قابل ذکر چیز نہیں بلکہ قابل نفرت چیز ہے جس میں انسان اپنے اصل فضائل و جواہر سے محروم ہو کر منصب شرافت و کرامت سے معزول ہو جاتا ہے اور اس کی صلاحیتیں اور اس کے ولولے بحر بیکراں بننے کی بجائے جوئے کم آب کی شکل اختیار کر لیتے ہیں حالانکہ خودشناسی کے جذبہ سے انسان کو انہی معائب و قبائح سے بچانا ہی تو اصل مقصود ہے۔ اس لیے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بندگی اس کی جس نے اسے پیدا کیا ہے اسے رزق دیتا ہے اس کے لیے زندگی کے امکانات پیدا کرتا ہے۔ اسے عقل و بصیرت عطا کی ہے اس کے لیے نشانات منزل روشن کئے ہیں اور پھر وحی و الہام سے اس کی معنوی روحانی اجتماعی اور تہذیبی ضرورتوں کو پورا کیا ہے۔ اسی کی بندگی کرنا اس کی بندگی کا حقیقی جواب ہے اور یہی انسان کے دو اساسی تصورات میں سے دوسرا بنیادی تصور ہے جسے خدا شناسی کہا جاسکتا ہے جس سے مل کر خود شناسی کا تصور مکمل ہوتا اور جلا پاتا ہے۔ یہی دو تصورات ہیں جن پر پوری زندگی کی تعمیر ہوتی ہے اور انہیں کو پیدا کرنا اور پھر اسے زندہ تازہ اور مستحضر رکھنا ہی اسلام کا اصل ہدف اور مقصود ہے۔ کیونکہ اسی پر انسانی صلاح و فلاح کا دارومدار ہے۔ چنانچہ اسلامی تعلیمات کو بنظر غائر دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہی دو تصورات اسلام کی بنیاد ہیں اور یہی مسلمان کی شناخت منزل اور حقیقی سرمایہ ہیں۔ چنانچہ اسلامی عقائد سے انہیں تصورات کو دل و دماغ میں راسخ کیا جاتا ہے اور پھر حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے ذریعہ انہیں کی یاد دہانی کرائی جاتی ہے اور عبادات بالخصوص نماز کے واسطہ سے دن میں پانچ مرتبہ انہیں کا استحضار کرایا جاتا ہے تاکہ انسان اپنی حقیقت یعنی عبدیت اور اپنے آقا کی یاد کو گم نہ کر دے لیکن انسان کی سرشت میں شاید سہو و نسیان شامل ہے اسے بار بار خود فراموشی اور خدا فراموشی کے دورے پڑتے ہیں اور وہ بار بار اپنی حقیقت سے غافل ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں اس کے اندر کا حیوان اور اس کی دبی ہوئی نفسانیت اس پر غالب آکر اسے ایک ایسا حیوان بنا دیتی ہے جسے غذائی طلب خواہشِ نفس اور

لذت و راحت کے جنون کے سوا کسی اور مقصد و مدعا کا ہوش نہیں رہتا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ انسانی کمزوریوں کے صحیح ادراک کے بعد ان کا تعین کیا جائے اور پھر ان کا ایک مکمل علاج تجویز کیا جائے۔ چنانچہ جب ہم اس حوالے سے انسان کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی بنیادی ضرورتیں چار ہیں جو اپنی حدود میں رہیں تو انسان کی قوت اور بقا کا سامان ہیں اور اگر حدود سے تجاویز کر جائیں تو انسانیت کے ضعف بلکہ موت کا باعث ہیں۔ ان میں پہلی چیز غذا ہے۔ یہ انسانی زندگی کی بقا کی ضامن اور اس کی بنیادی ضرورت ہے لیکن جب اسے مقصود بنالیا جائے تو انسان انسان نہیں بلکہ انسان نما حیوان بن جاتا ہے جو صرف اس لیے جیتا ہے تاکہ وہ غذائی ضرورت کو مقصد زندگی ٹھہرا کر شب و روز اس میں تنوع کشش اور لذت بڑھانے کے لیے محنت و کوشش میں لگا رہے چنانچہ اس بنیادی ضرورت کو حدود میں محدود کرنے اور اس کا بطور ضرورت صحیح شعور دینے کے لیے رمضان المبارک کے روزے فرض کئے گئے اگرچہ حلال و حرام کے تصور سے بھی اس کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن انسانی تغافل کو دیکھتے ہوئے ضرورت تھی کہ اس کے لیے ایک طویل اور موثر کورس کرایا جائے جس سے غذا کے ایک ضرورت ہونے کا شعور ابھارا جائے اور پھر اس بنیادی ضرورت میں بھی اللہ کی حاکمیت کا احساس اجاگر کیا جائے۔ چنانچہ رمضان المبارک میں پورا ایک مہینہ بغیر کسی انقطاع کے ظلوع سحر سے غروب آفتاب تک مسلسل اس کی مشق کرائی گئی کہ غذا تمہاری ضرورت ہے مقصد نہیں اور اس میں بھی تمہارے اختیارات غیر محدود نہیں بلکہ اللہ کے حکم کے تابع ہیں کیونکہ تم اس کے بندہ ہو اور وہ تمہارا آقا ہے اس طرح اس بنیادی ضرورت کو نظم و ضبط میں ڈھال کر اس کی مضرت کو ختم کر دیا گیا اور اس کی بڑھی ہوئی اشتہاء میں تقلیل کا میلان پیدا کر کے انسان کی معنوی اور اخلاقی زندگی کو مضبوط کر دیا گیا۔ اسے اہل علم کے یہاں تقلیل طعام کا نام دیا گیا۔

دوسری چیز جس سے انسانی قوت عمل بلند ارادی اور اولوالعزمی کو

نقصان پہنچتا ہے وہ انسان کے اندر آرام و راحت کی حد سے بڑھی ہوئی طلب ہے۔ انسان محنت سے جی چراتا مشقت سے بھاگتا اور زیادہ سے زیادہ خواب و منام کا حریص ہے۔ اس کا دل عبادت و ریاضت اور مطالعہ و تحقیق میں نہیں خواب گاہ میں لگتا ہے۔ چنانچہ اس نشے کو توڑنے اور اس بنیادی ضرورت کو ضرورت کے دائرے میں رکھنے کے لیے قیام لیل کو سنت ٹھہرایا اور اس طرح تقلیل منام کا احساس پیدا کیا۔

تیسری اور چوتھی چیز جس نے انسانی کامیابیوں کو دھندلا کر رکھ دیا ہے وہ حد سے بڑھا ہوا بزم آرائی اور طلاقت لسانی کے اظہار کا شوق ہے۔ اسے ایک خوبی سمجھا جاتا ہے کہ فلاں آدمی بڑا یارباش آدمی ہے اس کے پاس اکثر وقت دوستوں کا جمگھٹا رہتا ہے اور بزم آراء وہ ایسا ہے کہ اس کی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی سے مجلس ہر وقت کشتِ زعفران بنی رہتی ہے اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ صاحب اس کے کیا کہنے اس سے بڑا فقرے باز کون ہو سکتا ہے۔ گویا قوت گویائی حاضر جوابی زود گوئی بلکہ بسیار گوئی اور بلالحاظ ادب و اخلاق فقرے بازی اور جگت بازی کو ایک فن کا درجہ دے دیا گیا ہے اور کبھی کوئی نہیں سوچتا کہ زبان سے نکلنے والا ایک ایک بول کل کا تول بنے گا اور زبان کی بے احتیاطی متانت و سنجیدگی کو تو ختم کرے گی ہی دلوں میں کانٹے بھی بوئے گی۔ علاوہ ازیں وقت اور مہلت عمل جو قدرت کا انسان کے لیے سب سے بڑا عطیہ ہے وہ اس جا و بیجا مجلس طرازیوں اور بزم آرائیوں میں کس بری طرح غارت ہوتا ہے حالانکہ اسی وقت سے کام لینا کامرانیوں کی کلید ہے اور اسے ضائع کر دینا تباہی و ہلاکت اور نامرادی کا باعث ہے۔ غیر ضروری میل ملاپ اور بے مقصد خوش گفتاری میں ایک لذت تو ہے لیکن اس کے نقصانات ناقابل تلافی ہیں۔ آدمی وقتی طور پر اس نشے میں ایسا مخمور رہتا ہے کہ اسے نقصانات کا اندازہ نہیں ہوتا۔ لیکن جب وہ ذمہ داریوں سے گراں بار اور اس کے نتائج کے لیے جواب دہ ہوتا ہے تو تب پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ طالب علموں کی امتحانات میں ناکامی دفاتر میں دفتری امور کی ناتمامی لائبریریوں کی ویرانی

کسی بھی سنجیدہ کام کے لیے محنتی اور مستعد کارکنان کی کمیابی اور ہجوم کار میں صحتوں کا بگاڑ یا کام سے فرار یہ سب بے وجہ کے میل ملاپ کی عادت، گلیوں کھیلوں اور تفریح گاہوں میں حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی نام نہاد ادبی مجالس بے مقصد خوش گفتاریوں کے مقابلے اور گپ بازی اور مجلس آرائی کے حد سے بڑھائے بڑھے ہوئے ذوق ہی کی وجہ سے ہے۔ جب آدمی اپنی عبدیت اور اپنے آقا کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی کے تصور سے بے گانہ ہوتا ہے تو وہ بھول جاتا ہے کہ زبان جتنی بڑی نعمت ہے اتنی ہی بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ آنخضرتؐ کا ارشاد ہے کہ ہر صبح معمولات کے آغاز سے پہلے جسم کے تمام اعضاء و جوارح زبان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس سے درخواست کرتے ہیں کہ خدا کے لیے تم حدود میں رہنا اور راہ راست پر چلنا۔ کیونکہ اگر تم راہ راست پر رہیں تو ہم بھی رہ راست پر رہیں گے اور بچ جائیں گے اور اگر تم بگڑیں اور کجروی اختیار کی تو ہم بھی تمہارے ساتھ تباہ ہو جائیں گے۔

مسلمان کی تعریف کرتے ہوئے آنخضرتؐ نے فرمایا: اَلْمَسلِم مَن سَلِمَ المَسلِمَونَ مِن لسانِہ وَیَدِہِ مسلمان وہ ہے کہ مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہیں۔ یہاں دیکھئے زبان کا ذکر ہاتھ کے ذکر سے پہلے ہے یعنی زبان اپنے اچھے یا برے اثرات میں ہاتھ سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ ہاتھ کے لگائے ہوئے زخم مندمل ہو جاتے ہیں مگر زبان کے لگائے ہوئے گھاؤ کبھی بھرنے میں نہیں آتے۔ کیا خوب کہا ایک عرب شاعر نے:

جَراحاتَ السِّنَانِ لَھَا اَلْتِیَامَ وَلاَ یَلتَامَ مَاجَرَحَ اللِّسَانِ یعنی تینوں کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں مگر زبان کے زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے۔

وقت زبان سے بڑی نعمت ہے۔ اسی لیے قیامت کے دن انسان سے اس کی عمر اس کی جوانی یعنی وقت کے متعلق سب سے پہلے سوال ہوگا۔ دنیا میں جن لوگوں نے کامیاب زندگی گذاری ہے وہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے وقت کی طنابیں کھینچ کر رکھیں اور ایک ایک منٹ کو مفید کاموں میں صرف کیا۔ عمر تو

سب کو کم و بیش ایک سی ملتی ہے مگر جو لوگ وقت کی قدر و قیمت کو پہچان لیتے ہیں اور اسے ضائع کرنے کی بجائے کام میں لاتے ہیں وہی دنیا سے اپنی کامرانیوں کا خراج وصول کرتے ہیں سید امیر علی مرحوم سے کسی نے انگلینڈ میں پوچھا تھا کہ آپ دوسرے لوگوں سے کام زیادہ کیسے کر لیتے ہیں؟ انہوں نے جواب میں کہا' میرا دن تم سے لمبا ہے۔ پوچھنے والے نے وضاحت چاہی کیونکہ دن کی طوالت تو سب کے لیے یکساں ہے۔ سید امیر علی نے کہا میں علی الصبح کام کا آغاز کرتا ہوں اور رات تک کام میں لگا رہتا ہوں اور تمہارا رات کا ایک معتدبہ حصہ کلبوں میں گھومنے پھرنے اور بے مقصد گفتگو کی نذر ہو جاتا ہے۔ رات کو دیر سے سوتے ہو اور پھر دن چڑھے اٹھتے ہو۔ ظاہر ہے میرا اور تمہارا کام برابر کیسے ہو سکتا ہے۔ اس معاملے میں سید امیر علی تنہا نہیں بلکہ زندگی میں ہر کامیاب انسان کو ایسا ہی پاؤ گے اور یہ آنحضرت ﷺ کا اسوۂ اور طریق زندگی ہے۔ مختصر یہ کہ زبان اور وقت کا ضیاع یا بے مقصد استعمال ایک بڑی برائی ہے۔ جس نے انسان کو صرف ناکامیاں ہی نہیں دیں بلکہ سیرت و کردار میں بھی دراڑیں پیدا کیں۔ پروردگار نے جس طرح انسان کی بسیار خوری اور ضروریات زندگی کو مقصد بنانے کا علاج روزہ کے ذریعہ تقلیل طعام کا ذوق پیدا کر کے فرمایا اور آرام و راحت اور طویل خوابی کا علاج قیام لیل کے ذریعہ تقلیل منام سے کیا اسی طرح مذکورہ بالا دونوں مفاسد کا علاج اعتکاف جیسی عبادت کی مشروعیت سے کیا۔ ایک معتکف کو کم ملنے (تقلیل انام) اور کم بولنے (تقلیل کلام) کی مشق کرائی جاتی ہے اسے ملنے سے نہیں روکا جاتا بلکہ صرف یہ احساس دیا جاتا ہے کہ یہ دیکھو کس سے مل رہے ہو کیونکہ باہمی میل جول اور مجلس آرائی انسانی دل و دماغ عادات اور سیرت و کردار پر اثر انداز ہوتی ہے۔ آنحضرتؐ کے ارشاد کے مطابق ایک بُری مجلس کا حال کوئلے کی دکان جیسا ہے کوئلہ نہ بھی خریدو جب بھی کپڑے کوئلوں کی کالک سے بچ نہیں سکیں گے۔ کہیں نہ کہیں کالک لگ ہی جائے گی۔ ایک اچھی اور نیک مجلس کا حال عطر کی دکان جیسا ہے عطر نہ بھی خریدو باہر نکلو گے تو کپڑوں سے خوشبو

آرہی ہوگی۔ اس لیے اعتکاف کے ذریعہ ایک روحانی اخلاقی اور صالح ماحول میں معتکف کو پابند کرکے دو باتوں کی طرف توجہ دلائی۔ 1- بری مجلس بری دوستی برا میل جول اجتناب اور پرہیز کے لائق ہے جس سے خلوت اور تنہائی اچھی ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا وحدة المرء خیر من جلیس السوء برے ساتھی سے تنہائی اور خلوت بہتر ہے۔

2- اور دوسری بات جس کی طرف توجہ دلائی وہ یہ ہے کہ اپنا ماحول ہمیشہ صالح اور پاکیزہ رکھو۔ مجلس آرائی ہمیشہ اچھے لوگوں سے کرو۔ اہل علم اور صاحب دل لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔ یہ تشکیل کردار میں سب سے موثر عامل ہے۔ جس طرح بری مجلسوں اور برے لوگوں سے پرہیز ضروری ہے اسی قدر اچھے لوگوں کی محبت ضروری ہے۔ میل جول اور مجلس آرائی انسان کی فطرت ہے۔ اس لیے انسان کو اس سے محروم کر دینا کوئی حکیمانہ طریق نہیں ہے۔ اس لیے اسلام نے اس ضرورت کو تسلیم کیا۔ مگر اس میں کمی اور اس کی صحت کا احساس پیدا کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ مولانا تھانوی مرحوم فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا دیکھا تو وہ تنہا بیٹھے تھے میں پاس جا بیٹھا مگر معاً" مجھے خیال آیا کہ میں شاید حاجی صاحب کی خلوت میں مخل ہوا ہوں۔ چنانچہ میں نے اس جسارت پر معذرت چاہی تو حاجی صاحب نے فرمایا خلوت از اغیار است نہ کہ از یار یعنی خلوت ان لوگوں سے ہوتی ہے جو مجلس کے اہل نہیں ہوتے جن سے ملنا دل پر برے اثرات پیدا کرتا ہے خلوت اپنے لوگوں یعنی مجلس کے اہل لوگوں سے تو نہیں ہوتی۔ کیونکہ خلوت بجائے خود مقصود نہیں ہے بلکہ دل و دماغ اور سیرت و کردار کو برے اثرات سے بچانا مقصود ہے۔

دوسری برائی جس کا علاج اعتکاف سے کیا گیا وہ ہے ضرورت سے زیادہ بولنا اور زبان کا بے محابا بے مقصد اور ناروا مصرف میں استعمال۔ اعتکاف میں بولنے پر پابندی نہیں لگائی۔ بلکہ دو باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی۔ ایک یہ کہ کم سے کم بولنے کی عادت ڈالو کیونکہ ایک مومن کے سر پر انفرادی اور

اجتماعی ذمہ داریوں کا پہاڑ رکھ دیا گیا ہے فکر اس پہاڑ کو سر کرنے کی ہونی چاہیے۔ باتیں بنانا تو بے کار لوگوں کا مشغلہ ہے۔ اقبال نے کیسی سچی تصویر ایک مومن کی کھینچی ہے۔

؎ نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

اور دوسری یہ بات کہ بولنے سے پہلے سوچو کہ تم کیا بول رہے ہو۔ یہ آج کے بول کل کے تول بنیں گے۔ ایک ایک کہی ہوئی بات کا جواب دینا ہوگا۔ ارشاد خداوندی ہے ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید زبان جو بول اگلتی ہے دونوں کندھوں پر بیٹھے ہوئے فرشتے اسے لکھ لیتے ہیں اور یہی نامہ اعمال ہے جو کل کو ہمارے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ آدمی حیران ہو کر پکارے گا مالھذا الکتاب لا یَغادرَ صَغیرۃ ولا کبیرۃً الاّ احصا ھا و وجدوا ما عملوا حاضرا یہ کیسا نوشتہ اور کیسی تحریر ہے جس نے ہر چھوٹی بڑی بات کو شمار اور محفوظ کر رکھا ہے اور لوگ اپنے تمام اعمال اس میں موجود پائیں گے۔ اسی بات کا استحضار اعتکاف کے ذریعہ کرا کر تقلیل کلام کی عادت پیدا کی جاتی ہے۔

اس طرح وہ چار کمزوریاں یعنی کثرت طعام کثرت منام کثرت انام اور کثرت کلام جو ہمارے خود شناسی و خدا شناسی کے جذبے کو نقصان پہنچا سکتی تھیں اس کا فرضیتِ صیام قیام اللیل اور اعتکاف کے ذریعے علاج تجویز فرما کر ایک مومن کے سیرت و کردار کی تکمیل کا سامان فراہم کر دیا اور آخری عشرہ میں جو جہنم سے آزادی کا عشرہ ہے بالخصوص اعتکاف مشروع ٹھرا کر انسان کو اپنے اندر جھانکنے اور اپنا احتساب کرنے کا ایک موقعہ مہیا کر دیا کیونکہ ہر آدمی اپنا سب سے بہتر محتسب ہے۔ کَفٰی بِنَفسِکَ الیَومَ عَلَیکَ حَسِیبًا وہ اپنی کمزوریوں کو خوب سمجھ سکتا ہے اعتکاف اسے اس کا موقعہ مہیا کرتا ہے کہ تم اپنے من میں ڈوب کر سراغ زندگی پانے کی کوشش کرو اور اپنا جائزہ لے کر دیکھو کہ تمہاری عبدیت تکمیل کے کس مرحلے میں ہے اور خدا شناسی کے نور نے کس حد تک فکر و

نظر اور جذبہ عمل کے ایوانوں میں روشنی کا سامان کیا ہے۔ چنانچہ یہ خود احتسابی کا عمل جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے ویسے ویسے اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی جاتی ہے کہ میری عبدیت دوسری مخلوقات حتی کہ فرشتوں کی عبدیت سے مختلف ہے۔ میں جس طرح خود اختیاری عبدیت کی وجہ سے ارادہ و اختیار کی آزادی رکھتا ہوں اسی طرح میری عبدیت صرف تعمیل احکام اور حضوری دربار تک محدود نہیں بلکہ میرے اندر سوز و مستی کی وارفتگی اور جذب و شوق کا گداز بھی ہے۔ مجھے صرف زندگی اور اسباب زندگی سے پیار ہی نہیں بلکہ اسے کسی آستانے پر بسر کرنے اور کسی کے لیے قربان کرنے کی آرزو بھی ہے۔ میں ایک غلام اور بندہ کی طرح صرف اطاعت کے لیے کمربستہ رہنا ہی اپنی منزل نہیں سمجھتا بلکہ میرے اندر اپنے آقا کے لیے ایک محبت کی تڑپ بھی ہے جو مجھے ہر وقت اس کے قرب پر اکساتی اور اس کے وصل کے لیے بے قرار رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس راہ پر چلنے والوں نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے اسی بے قراری کے لیے دعائیں کی ہیں کیونکہ انہیں اس میں آسودگی اور لذت ملتی ہے۔ اقبال اسی جذبے کو زبان دیتا ہوا کہتا ہے:

؎ تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دل مرتضیٰ سوز صدیقؓ دے
دلوں سے وہی تیر پھر پار کر
تمنا کو سینوں میں بیدار کر

یہ عشق و محبت کا جذبہ کوئی وقتی جذبہ تو ہوتا نہیں جو چند دنوں کے بعد دم توڑ جائے اور نہ ہی یہ جز وقتی معاملہ ہے جسے کسی اور وقت پر ٹالا جاسکے۔ یہ تو ایک تڑپ اور کسک ہے جو زندگی کے ہر سانس کے ساتھ چلتی ہے۔ بقول شاعر:

؎ دریچے بند کرکے سونے والو
محبت عمر بھر کا رتجگا ہے

اس میں ماندگی کے وقفے تو ہوسکتے ہیں لیکن ٹھہراؤ اور اٹکاؤ کہیں نہیں۔ یہ تو زندگی کا سفر ہے بلکہ زندگی سے بھی درازتر زندگی کا سفر تمام ہو جاتا ہے مگر عشق کا سفر جاری رہتا ہے اور زندگی اس کی قیمت ادا کرتے ہوئے اور

عہد وفا نبھاتے ہوئے اس پر قربان ہو جاتی ہے۔ اقبال مرحوم سے کسی نے پوچھا تھا۔ عشق کی انتہا کیا ہے؟ کہا، عشق کی کوئی انتہا نہیں۔ پوچھنے والے نے کہا۔ پھر آپ نے یہ کیوں کہا؟ ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں؟ اقبال بولے۔ دوسرا مصرعہ بھی تو پڑھو۔ مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں۔ اور جب یہ عشق اپنے خالق و مالک سے ہو تو پھر اس کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ البتہ صحابہ کرام کی زندگیوں اور ان کے کارناموں سے ہمیں روشنی ضرور ملتی ہے کہ وہ کس طرح اس راستے سے یقین کے سوز عمل کے گداز اور جذب و شوق کی وارفتگی کے ساتھ گذرے اور اس آرزو مندی کے درد اور کسک نے انہیں اس وقت تک بے تاب رکھا تا آنکہ زندگی اور متاع زندگی کا اثاثہ اسی راستے میں قربان ہوگیا۔ حضرت علی حضرت زید بن حارثہ حضرت عبداللہ بن رواحہ اور حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہم جب زخموں سے چور ہو کر گرے اور روح قفس عنصری سے پرواز کرنے لگی تو بجائے درد و الم کے اظہار کے ہر ایک نے خوشی و مسرت میں ڈوب کر فرمایا فُزتُ و رَبِّ الکعبۃ رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا۔ اسی طرح کے پاکیزہ جذبات لیے ایک معتکف اعتکاف کے لمحات گذارتا ہے اور شب و روز تسبیح و تحمید عبادت و ریاضت توبہ و استغفار سے اپنے رب کے قرب کو ڈھونڈتا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیم اجمعین تو ہمیشہ ہی ایسے جذبات و کیفیات میں متکیف رہتے تھے۔ لقاء رب کی طلب اور آرزو انہیں ہمیشہ بے چین رکھتی تھی۔ ایسے ہی ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے بنی اسرائیل کے ایک عابد و مجاہد کا واقعہ بیان فرمایا جس نے ایک ہزار ماہ اس طرح گذارے کہ دن کو جہاد میں گذارتا اور رات کو اللہ کی عبادت و مناجات میں بسر کرتا۔ صحابہ کو یہ سن کر تعجب بھی ہوا اور حسرت بھی تعجب اس مجاہد کی ہمت و ریاضت پر حیرت اپنی حالت پر کہ کاش ہماری عمریں بھی ایسی ہی طویل ہوتیں تو ہم بھی اتنا طویل وقت راہ خدا میں صرف کر دیتے اور اپنے مالک کے قرب کے مستحق ٹھہرتے لیکن اب اپنی طبعی عمر کے اختصار کے باعث ہزار کوشش کریں سابقہ امتوں کے خوش نصیب لوگوں کے ہم پلہ کیسے ہوسکتے ہیں۔ جنہوں نے

ہزار ہزار مہینے تک بلا انقطاع عبادت و جہاد کا حق ادا کیا ہے۔ یہی بات آنحضرتؐ کی خدمت میں محض اس حسرت کے ساتھ زبان پر آ گئی کہ کاش ہمیں بھی ایسا طویل موقعہ مجاہدہ و مراقبہ اور عبادت و ریاضت کے لیے ملتا تو ہم بھی بارگاہ خداوندی سے کسی بڑے انعام کے مستحق ٹھہرتے۔ اس پر سورہ القدر نازل ہوئی اور اس امت کو بے پایاں انعامات و عنایات سے گراں بار کر دیا اور رحمت حق ایسی جھوم کے برسی کہ اس امت کے جویائے حق خوش نصیبوں کو نہال کر دیا۔

اس سورت میں لیلتہ القدر کی نوید سنائی گئی ہے اور اس رات کے ذریعہ اس امت کے باہمت افراد کے لیے ایک موقع پیدا کیا گیا ہے جس کو حاصل کر کے وہ سابقہ امتوں کے صالح اور اوالوالعزم افراد سے بھی جنہیں طویل عمریں دی گئی تھیں آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اس کا نام ہی لیلتہ القدر رکھا گیا۔ یعنی قدر و منزلت والی رات۔ جو خوش نصیب اس رات کو پالے گا اور اس رات میں ایمان و احتساب سے قیام کرے گا تو اس کے سابقہ تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ وہ اب تک اگر بے قدر و قیمت تھا تو اب صاحب قدر و قیمت اور عزت و شرف کا حامل ٹھہرے گا اور پھر یہ قدر و منزلت کیا کوئی اندازہ بھی رکھتی ہے؟ فرمایا نہیں۔ وما ادرک ما لیلة القدر تم کیا جانو وہ قدر والی رات کیا ہے۔ یعنی تم اس کے عز و شرف کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ پھر فرمایا لیلة القدر خیر من الف شہر وہ قدر والی رات ہزار مہینے سے بہتر ہے۔ کتنی بہتر ہے؟ دو گنا چار گنا ہزار گنا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر ہزار کا لفظ عربوں میں ایسے مواقع پر ایک متعین عدد کے لیے نہیں بولا جاتا بلکہ غیر معمولی کثرت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یعنی وہ رات اپنی فضیلت و شرف مین غیر معمولی اور بے حد و حساب حیثیت کی حامل ہے اس رات میں کیا ہوا عمل اجر و ثواب کے اعتبار سے ہمارے اعداد کے پیمانوں میں تو آنے والا نہیں۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا کہ جس طرح اس مادی دنیا میں فصلوں موسموں اور اوقات کا اعتبار ہے ہر فصل کے برگ و بار لانے اور اس کی کاشت کا ایک متعین وقت ہوتا ہے

وہ اسی میں پوری طرح افزائش و نمو پاتی ہے اور جس طرح ہر موسم اپنے خصوصی تغیرات اور اثرات رکھتا ہے اور جس طرح مختلف اوقات اپنی تاثیر و تاثر میں امتیاز کے حامل ہیں اسی طرح روحانی دنیا میں بھی اوقات اور موسموں کا اعتبار ہے جس میں اعمال کی افزونی قبولیت اور اثر و نفوذ اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ یہ رات بھی ایک ایسی ہی رات ہے جس میں کیا جانے والا نیک عمل اپنے اجر و ثواب میں تغیر احوال میں اور تاریخ پر اثر ڈالنے میں بے مثال ہے۔

قدر کا ایک معنی تقدیر بھی ہے۔ یعنی یہ وہ رات ہے جس میں تقدیریں بنتی اور بگڑتی ہیں اس میں افراد اور اقوام کی قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اسی رات میں سال بھر میں نفوذ پانے والے امور کارکنان قضاء و قدر کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں۔ اس امت کو اس رات کو تلاش کرنے اور اس کے نتیجے میں اپنی قسمت سنوارنے کا حکم دیا گیا۔ یعنی اس رات کی تلاش کے لیے آخری عشرۂ رمضان کا اعتکاف کرو۔ جس ذات کی محبت اور جس کے قرب اور وصل کی خواہش میں تم اس کے آستانے پر آپڑے ہو جس کے لیے تم نے دن کا عیش اور رات کا آرام چھوڑا ہے اس نے تمہیں نوازنے کے لیے ایک بہانہ مہیا کر دیا ہے کیونکہ رحمت حق بہانہ ے جوید بہانمی جوید۔ وہ بہانہ اس رات کا حصول ہے۔ اس کی تلاش میں کھو جاؤ اور اس طرح اپنے مقدر کو سنوارنے اور روشن کرنے کا سامان کرلو۔ شاید اسی وجہ سے اس رات کا تعین نہیں فرمایا تاکہ سوز و مستی جذب و شوق اور روح و دل کی بیتابیوں کو پوری طرح بروئے کار لاکر عبدیت کو عشق کی معراج بخشی جائے۔

احادیث میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رات رمضان المبارک میں آتی ہے۔ آخری عشرہ میں غالب امکان ہے۔ اکثر وقوع اس کا طاق راتوں یعنی 21، 23، 25، 27 اور 29 میں ہوا ہے۔ اسی لیے آنحضرتؐ نے مختلف مواقع پر مختلف راتوں کی طرف اشارہ فرمایا۔ صحابہ کرامؓ سے بھی مختلف راتوں میں اس رات کا وقوع منقول ہے۔ 27 ویں شب میں صحابہ نے اسے

زیادہ پایا ہے۔ حضرت ابی ابن کعب نے تو حتمی طور پر اس کا ذکر فرمایا یعنی زیادہ امکان 27 ویں شب میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لیلتہ القدر آخری عشرے کی طاق راتوں میں دائر ہے، کبھی کسی رات میں آتی ہے اور کبھی کسی رات میں اسی لیے پورے عشرے میں اسے تلاش کرنے کا حکم دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہمیشہ کمزوروں پر نظر کرم فرماتے ہیں۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر کسی نے اس رات میں عشا اور فجر کی نماز باجماعت ادا کی تو اس نے اس رات کی فضیلت کو پالیا۔ یعنی یوں تو یہ راتیں اپنے مالک و خالق کی محبت میں پگھلنے کی راتیں ہیں لیکن جو شخص یہ نہیں کرسکتا اسے کم از کم نماز باجماعت کی پابندی تو کرنا چاہیے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ اگر میں اس رات کو پالوں تو کیا دعا کروں تو آپ نے فرمایا۔ یہ دعا کرنا اللھم انک عفو تحب العفو فاعف عنی اے اللہ تو سراپا معافی ہے معافی کو پسند کرتا ہے مجھے بھی معاف فرما۔ اللہ اکبر غور فرمائیے۔ ایک شخص اپنی بندگی کا سارا اثاثہ اپنے خالق و مالک کے آستانہ پر نچھاور کر دیتا ہے۔ رات دن اسی کے عشق میں جلتا اور اسی کی تلاش اور حصول تقرب میں راتوں کو جاگتا ہے تاآنکہ اس کا نصیب یاوری کرتا ہے اور وہ اس رات کو پالیتا ہے اب یہ موقعہ ہے کہ وہ عشق و مستی میں اس لمحے سے سرشار ہوکر جھوم اٹھے اور اپنے مقدر پر ناز کرے مگر اس موقعہ پر بھی اسے صرف معافی مانگنے کی تعلیم دی جاتی ہے یعنی اسے یہ سکھایا جاتا ہے کہ تمہیں یہ بات کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ تم ہزار جتن کرو تمہارا عمل کبھی نسیان و خطا سے پاک نہیں ہو سکتا اور تم کبھی اس بارگاہ عالی کے لائق عمل پیش نہیں کرسکتے۔ اسی لیے اس راستے کے شناور جتنا آگے بڑھتے ہیں اتنا ہی عاجزی و فروتنی کے پیکر بن جاتے ہیں کیونکہ اس راہ کا اصل سرمایہ یہی ہے۔

اس رات سے متعلق بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اختلاف مطالع کی وجہ سے ہر جگہ رات کا ایک وقت میں ہونا تو ممکن نہیں جب مکہ معظمہ میں

رات ہوگی اس وقت دنیا کے بہت سے ممالک میں دن ہوگا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس رات کے فضائل اور اس کی برکتوں سے تمام ممالک کے لوگ یکساں فیض یاب ہوں۔ جہاں رات ہوگی وہاں کے لوگ اس رات کی فضیلت کو پا سکتے ہیں اور جہاں دن ہو گا وہ اس سے محروم رہ جائیں گے اگر غور کیا جائے تو اس کی مختلف توجیہات ممکن ہیں۔ مثلاً” رات کی حقیقت کیا ہے؟ زمین کے کسی حصے کا سورج کے سامنے سے ہٹ جانا۔ کیونکہ جب سورج کی کرنیں زمین کے اس قطعہ تک نہیں پہنچیں گی تو وہاں اندھیرا یعنی رات ہوگی اور دن کی حقیقت کیا ہے؟ کسی قطعہ زمین کا سورج کے سامنے آکر سورج کی کرنوں سے منور ہو جانا۔

اور یہ ایک حقیقت ہے کہ زمین اپنے گرد حرکت کرتی اور گھومتی ہے اس لحاظ سے زمین کا جو حصہ سورج کے سامنے آجاتا ہے وہاں دن طلوع ہو جاتا ہے اور باقی حصوں میں رات ہوتی ہے اور پھر یہ مسلسل گھومنے کی وجہ سے رات پیچھے ہٹتی جاتی ہے اور دن پھیلتا جاتا ہے اور زمین کے یہ روشن حصے جب زمین کی حرکت کی وجہ سے سورج کے سامنے سے ہٹتے جاتے ہیں تو وہاں رات طاری ہو جاتی ہے اس طرح رات اور دن کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے جسے قرآن کریم یکور اللیل علی النہار و یکور النہار علی اللیل سے تعبیر کرتا ہے یعنی رات دن پر لپٹی آتی ہے اور دن رات پر لپٹا آتا ہے۔ اس حقیقت پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مختلف قطعات زمین پر رات کے طاری ہونے میں کہیں انقطاع نہیں ہے۔ کیونکہ زمین کی حرکت ہر دم جاری ہے جیسے جیسے زمین سورج کے سامنے سے ہٹتی جاتی ہے رات میں ڈوبتی جاتی ہے یہ سفر چونکہ مسلسل جاری ہے اس لیے رات بھی بلا انقطاع مسلسل جاری رہے گی۔ فرض کریں جب لیلتہ القدر مکہ معظمہ میں وارد ہوئی تو یہی لیلتہ القدر زمین کی گردش کے ساتھ مسلسل آگے بڑھتی جائے گی اور زمین اور اہل زمین کو اپنی برکات بانٹتی جائے گی گویا یہ رات ایک ہی ہے البتہ مختلف ممالک کے لوگ اپنی اپنی باری پر اس سے فیضیاب ہوتے جائیں گے۔

گویا یہ خیر و برکت کی ایک ٹرین ہے یہ ایک ہی ہے البتہ ہر اسٹیشن پر منتظر لوگ اس کے وہاں پہنچنے پر اس میں سوار ہو جائیں گے۔

ابھی آپ نے پڑھا کہ رات دن ایک دوسرے پر لپٹے ہوئے آتے ہیں ایک دوسرے سے بالکلیہ منقطع نہیں ہوتے۔ اس لیے یہ توجیہ بھی اہل علم نے کی ہے کہ عربی زبان میں اکثر رات کا لفظ دن اور رات کے مجموعے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس لیے رمضان کی ان تاریخوں میں سے جو تاریخ بھی دنیا کے کسی حصے میں ہو اس کے دن سے پہلے والی رات وہاں کے لیے شب قدر ہو سکتی ہے۔

اور تیسری بات جو سب سے زیادہ محکم ہے وہ یہ ہے کہ ہر جگہ کے اعتبار سے جو رات شب قدر قرار پائے گی اس جگہ اسی رات میں شب قدر کی برکات حاصل ہوں گی۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

# حج

## فرضیت اہمیت اور حقیقت

معزز خواتین و حضرات!

”وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا“

اور لوگوں کے ذمہ ہے حج کرنا اللہ کے لیے بیت اللہ کا۔
یعنی اس کے ذمہ جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو۔

### حج کا معنی

حج کا لفظی معنی قصد و ارادہ ہے۔ لیکن شریعت میں اس سے مقصود مکہ معظمہ میں واقع اللہ کے گھر میں حاضری، اس کا طواف اور مکہ کے مختلف مقامات میں حج کی نیت سے حاضر ہو کر کچھ آداب اور اعمال بجا لانا ہے۔

### حج کی فرضیت و اہمیت

حج ارکان اسلام میں چوتھا رکن ہے اور اپنی اہمیت و افادیت میں دیگر ارکان کا جامع ہے اور انسان کی خدا پرستی اور عبادت کا پہلا اور قدیم طریقہ ہے۔ انسان پر بناؤ و سنوار اور بگاڑ اور فساد کے مختلف ادوار گذرے اور سعادت و شقاوت اور ہدایت و ضلالت کے ہزاروں انقلاب اس نے دیکھے۔ لیکن حج رسم کے طور پر ہی سہی ہمیشہ مذہبی زندگی میں باقی رہا اور اس نے مذہبی شعور یا مذہبی روایت کو زندہ رکھنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اسلام نے اس

کی اسی افادیت و اہمیت کے پیش نظر نہ صرف اسے ارکان اسلام میں شامل کیا بلکہ اس کے تارک کو سخت وعید کا مستحق جانا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کے پاس اس قدر زاد و راحلہ موجود ہو جو اس کو بیت اللہ تک پہنچا سکے پھر بھی وہ حج نہ کرے تو چاہے وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی (یعنی اسلام سے اس کا کوئی رشتہ نہیں۔)

اس کا شوق پیدا کرنے اور دلوں میں اس کی اہمیت راسخ کرنے کے لیے آنحضرت ﷺ نے اس کے فضائل و درجات ذکر فرمائے۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "حج مبرور کا جنت سے کم کوئی بدلہ نہیں۔" ایک دوسری حدیث میں فرمایا "جس نے اللہ کے لیے حج کیا اور بدکلامی و بدگوئی اور فسق و فجور سے اپنے کو محفوظ رکھا تو وہ ایسا ہو جائے گا جیسا اس دن تھا جس دن ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ آنحضرت سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ حج اور عمرہ کے درمیان متابعت کرو۔ اس لیے کہ یہ دونوں گناہوں کو اس طرح دور کرتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے یا چاندی کے میل کو صاف کرتی ہے اور حج مبرور کا بدلہ جنت سے کم کوئی چیز نہیں اور جب مومن احرام میں ہوتا ہے تو سورج غروب ہونے کے ساتھ اس کے تمام گناہ بھی زائل ہو جاتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی دن ایسا نہیں جس میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اتنی بڑی تعداد میں جہنم سے آزاد کرتا ہو جتنا عرفہ کے دن۔

آنحضرت سے دریافت کیا گیا کون سا عمل افضل ہے۔ آپؐ نے فرمایا اللہ اور اس کے رسول پر ایمان' عرض کیا گیا اس کے بعد کیا؟ فرمایا اللہ کے راستہ میں جہاد' دریافت کیا گیا اس کے بعد کون سا؟ فرمایا حج مبرور۔

بعض احادیث میں آنحضرت ﷺ نے حج کو جہاد ہی کی ایک قسم قرار دیا ہے۔ اور عورتوں کے لیے تو خاص طور پر حج ہی کو جہاد ٹھہرایا گیا ہے۔ بخاری

میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سب سے اچھا اور سب سے افضل جہاد حج مقبول ہے۔ حضرت عائشہ ہی سے ایک اور روایت میں ہے فرماتی ہیں کہ میں نے کہا یا رسول اللہ ہم جہاد کو افضل عمل سمجھتے ہیں تو ہم کیوں نہ جہاد ہی کریں۔ آپ نے فرمایا لیکن افضل جہاد حج مبرور ہے۔ حضرت عمر حضور سے روایت کرتے ہیں کہ حج کا سامان اور تیاری کرو اس لیے کہ وہ بھی ایک جہاد ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نگاہ میں فریضہ حج نہ صرف ارکان اسلام میں سے ہے بلکہ ایک مومن کی مغفرت و بخشش اور اس کی صلاح و فلاح اور تربیت میں اسے غیر معمولی مقام حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کو اس بارہ میں تردد تھا کہ ارکان اسلام میں کونسا رکن سب سے افضل ہے مگر جب انہوں نے خود حج فرمایا تو وہ حج کے سب سے افضل ہونے میں یکسو ہوگئے۔

سوال یہ ہے کہ حج کے افضل الارکان ہونے اس کے غیر معمولی فضائل و برکات کا حامل ہونے اور انسان کی تربیت و اصلاح میں غایت درجہ موثر و مفید ہونے کی آخر وجہ کیا ہے؟ اسے سمجھنے کے لیے انسانی خصوصیات اس کے طبعی خواص اور اس کے فطری عواطف و جذبات اور ارکان اسلام کے ان پر موثر و عامل ہونے پر غور کرنا ہوگا۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے فطری میلانات احساسات و جذبات اور عقل سلیم جیسے عطیات و انعامات سے مالا مال کیا ہے تاکہ وہ اپنی حقیقت کائنات سے اپنے تعلق خالق کائنات سے اپنے رشتے اور انسانوں کے باہمی روابط کی نوعیت کا ٹھیک ادراک کرسکے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ان تمام تر احسانات کے باوجود انسان نے ہمیشہ اپنی حقیقت اور اس سے متعلق علاقات کو سمجھنے میں اکثر ٹھوکر کھائی ہے۔ کبھی اس نے اپنی حیثیت و حقیقت سے یکسر بغاوت اور تمرد کا راستہ اختیار کیا اور تخت طاغوت پر متمکن ہو کر لوگوں سے اپنی بندگی اور غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ کیا اور کبھی اپنے مرتبہ و مقام کو فراموش کرکے اس فروتنی کا شکار ہوا کہ ہر طاقت و قوت کے سامنے

سجدہ ریز ہو گیا اور پتھروں تک کو مسجود بنا لیا۔ انسان کی اسی افراط و تفریط اور الحاد و انحراف کی وجہ سے پروردگار نے انسانوں کو صراط مستقیم اور راہ اعتدال کی رہنمائی کے لیے پیغمبر اور رسول بھیجے اور انہوں نے انسانوں پر ان کی حقیقت منکشف کرتے ہوئے انہیں سمجھایا کہ باقی تمام کائنات کی طرح تم بھی اپنے خالق و مالک کے عباد یعنی بندے ہو اور اسے تم پر وہی حقوق حاصل ہیں جو ایک آقا کو اپنے بندوں پر ہوتے ہیں۔ پھر جن لوگوں نے پیغمبروں کی دعوت کو قبول کر کے اپنی حقیقت کا ادراک کر لیا۔ وہ مومن و مسلم کہلائے اور انہوں نے زندگی کا وہ رویہ اپنا لیا جو ایک عبد اور بندے کا ہونا چاہیے۔ لیکن انسان کی فطرت میں اگرچہ عبدیت کا جذبہ موجود ہے اور اس کے طبعی خصائص میں سلامتی غالب ہے۔ بایں ہمہ بیرونی عوامل اور خواہشات و ترغیبات کا دباؤ اسے کبھی اپنی حقیقت کی طرف سے تغافل کا شکار کر دیتا ہے اور کبھی انحراف کے راستے پر ڈال دیتا ہے پروردگار سے بڑھ کر اپنے بندوں کی کمزوریوں سے اور کون واقف ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے بندوں کو اس تغافل اور انحراف سے بچانے کے لیے کچھ عبادات لازم ٹھہرائیں جنہیں ہم ارکان اربعہ کہتے ہیں۔

ان ارکان اربعہ میں سے سب سے پہلا رکن نماز ہے۔ یہ آدمی کو دن میں پانچ دفعہ اس کی حقیقت یاد دلاتی ہے۔ وہ دن کے بدلتے ہوئے پانچ اوقات میں کبھی اپنی غفلت سے بیدار ہو کر، کبھی مصروفیت سے دامن چھڑا کر، کبھی دن بھر کی درماندگی سے خستہ ہو کر اللہ کی بارگاہ میں پہنچ کر اپنی حقیقت کا اعتراف کرتا اور اللہ کی کبریائی کا اقرار کرتا ہے۔ اس سے اسے بار بار اس احساس کو توانا کرنے کا موقع ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب قدرتوں اور سب عظمتوں کا مالک ہے اور میں اس کا ایک عاجز بندہ ہوں۔ میں جس طرح ان پانچ اوقات میں اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اقرار کرتا اور اس کی عظمت کا اعتراف کرتا ہوں اسی طرح مجھے اپنی زندگی کے معمولات میں اس کے احکام کی پیروی اور اپنے آپ کو اس کا عاجز بندہ ثابت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور اس

طریقے سے آدمی کے اندر جو ایک تغافل کی کیفیت پائی جاتی ہے جو کہ کبھی بڑھ کر انحراف کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے نماز اس سے بہت حد تک آدمی کو محفوظ رکھتی ہے۔

2- لیکن ہر آدمی کے اندر خواہشات کا ایک ذخیرہ بھی ہے اور جذبات کا ایک طوفان بھی موجزن رہتا ہے۔ ان میں سب سے زوردار خواہش بہتر سے بہتر غذا کی طلب اور آرام و راحت کا حد سے بڑھا ہوا جذبہ ہے اور اگر اس میں جنسی جذبات کی ناہمواری بھی شامل ہو جائے تو پھر یہ خواہشات انسانی زندگی کے لیے ہی نہیں بلکہ اس کے ایمان، اس کے ارادے، اس کے مقاصد زندگی بلکہ اس کی اولوالعزمیوں کے لیے بھی ہلاکت کا باعث بن جاتی ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کی طرف اقبال مرحوم نے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

ؔ دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامان موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے. دل یا شکم

یہ شکم یا معدہ خواہشات کے غلبے کے بعد آدمی کی زندگی کا محور قرار پاتا ہے پھر آدمی کی پوری زندگی اسی کا طواف کرتے ہوئے گذر جاتی ہے۔ وہ زندگی بھر اس جہنم کو بھرنے کے لیے نہ جانے کیسے کیسے پاپڑ بیلتا ہے لیکن یہ جہنم کبھی بھرنے کا نام نہیں لیتا۔ خواہشات کے اس طلسم سے بچانے اور انسان کو شکم یا معدے کا اسیر ہونے سے روکنے اور اس کے اندر حوصلہ مندی کا سامان کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزہ فرض فرمایا جس کے نتیجے میں دن بھر کی بھوک پیاس نے اسے خواہشات پر غالب ہونا سکھایا اور رات کے قیام نے حد سے بڑھے ہوئے آرام و راحت کے جذبات کو سرد کیا۔

3- اسی طرح انسان کے اندر مال و دولت کی بے پناہ حرص اور ہوس پائی جاتی ہے۔ یہ جذبہ جب اپنی حدود سے نکل جاتا ہے تو آدمی ہوس زر میں مبتلا ہو کر بندۂ درہم و دینار بن جاتا ہے۔ پھر اس کے نزدیک انسانیت اقدارِ حیات، حقوق و فرائض بے معنی سی چیز بن کر رہ جاتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کے گنبد میں اس طرح اسیر ہو کر رہ جاتا ہے کہ باہر کا کوئی تقاضا اسے اپنی طرف

متوجہ کرنے سے عاجز ہو جاتا ہے۔ وہ عزت و ذلت صرف اس بات میں دیکھتا ہے کہ اس کے پاس مادی ذرائع کس فراوانی کے ساتھ ہیں اور ان کے سر پر سجی ہوئی کلغی کتنی بڑی ہے؟ اس کے علاوہ زندگی کے معنوی خصائص اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ انسان کو اس ذلت سے بچانے اور اس فروتنی کا شکار ہونے سے روکنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ فرض فرمائی۔ انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا۔ مال و دولت کی حقیقت اس پر واضح فرمائی اور یہ بتایا کہ یہ سب کچھ یہاں رہ جانے والی چیزوں میں سے ہے اپنے ساتھ وہ اعمال جائیں گے جو آدمی مال و دولت کی طلب سے بالا ہو کر بروئے کار لائے گا۔

اس طرح ان تین عبادات یا اراکین ثلاثہ کی فرضیت کے ساتھ انسان کو ان بنیادی رذائل سے بچانے کا اہتمام کر دیا گیا اور اس طرح انسان کی عبدیت کو (جو اس کی اصل حقیقت ہے) تغافل اور انحراف سے محفوظ کر دیا گیا۔ خواہشات و شہوات کے غلبے سے بچالیا گیا اور زندگی کو دھرتی کا بوجھ بن جانے سے بہت حد تک محفوظ کر دیا گیا۔ ہوس اور عہدہ و منصب کی خواہشات کو حدود میں رکھنے کا سامان کر دیا گیا مگر مشکل یہ ہے کہ انسان کے اندر وہ منفی جذبات جو انسان کو اس کی اصل حقیقت سے دور لے جانے کی کوشش کرتے ہیں وہ صرف یہی نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انسان کے فطری میلانات وہ صرف انسانی خواہشات درہم و دینار کی خواہش، جنسی ترغیبات اور ذات کی نمود تک محدود نہیں بلکہ انسان کے اندر کچھ چھپے ہوئے اور جذبات بھی ہیں کہ اگر ان کو بروئے کار آنے کے لیے صحیح راستہ نہ ملے ان کی تربیت اور تہذیب کا سامان نہ کیا جائے تو انسان اپنی ظاہری اور معنوی زندگی میں بڑی گمراہیوں کا شکار ہو سکتا ہے۔ ان جبلی خواہشات اور فطری صلاحیتوں میں سے ایک صلاحیت وہ ہے جسے ہم عقل کا نام دیتے ہیں۔ عقل انسانی زندگی میں راہنما کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ زندگی سے متعلق تمام شعبے اور تمام دوائر اس کے دائرہ کار میں نہیں آتے لیکن عقل یا عقل کا استعمال کرنے والا جب بر خود غلط ہو جاتا ہے تو وہ زندگی کے ہر دائرہ میں اس سے رہنمائی لینے پر اصرار کرتا ہے۔

نتیجہ معلوم کہ جب وہ دائرہ عقل کی حدود سے باہر ہو تو عقل اس میں کیسے رہنمائی دے سکتی ہے اس لیے عقل کی عافیت اور عقل کے پیچھے چلنے والے کی خیریت اسی میں ہے کہ وہ عقل کی حدود کو پہچانے اور اس کے استعمال سے پہلے اس ذات کی دی ہوئی روشنی و ہدایت کو قبول کرلے۔ جو عقل اور عقل والے کی خالق ہے۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب آدمی کے اندر اپنے خالق و مالک کے لیے مکمل اطاعت اور غیر مشروط اطاعت کا جذبہ موجزن ہو گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نماز' روزہ' اور زکوٰۃ انسان کے اندر اللہ کی اطاعت کا جذبہ پیدا کرنے میں بہت حد تک معاون ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں کیا شبہ ہے کہ تینوں اعمال وقتی اور جزوی ہیں۔ پوری زندگی ان کی گرفت میں نہیں ہوتی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اللہ کی جانب سے کوئی ایسی عبادت فرض کی جاتی جو انسان کو کامل اور غیر مشروط اطاعت کی تربیت دے سکے اور انسان کے اندر یہ جذبہ پیدا کر دے کہ تمہیں بہر صورت اللہ کے احکام کی اطاعت کرنا ہے چاہے وہ احکام تمہاری عقل کی گرفت میں آتے ہوں یا نہیں۔ کیونکہ تمہیں اپنی عقل کی حدود کو اللہ کے احکام کی حدود کے مقابلے میں مختصر اور محدود سمجھنا ہو گا۔ پھر تم بڑی آسانی سے ہر معاملے میں اللہ کے احکام کی اطاعت کرسکو گے۔ چنانچہ فریضہ حج کے ذریعے انسان کے اندر مکمل اور غیر مشروط اطاعت و عبدیت کا جذبہ پیدا کرنے کا سامان کیا گیا۔ کیونکہ حج اپنے سارے ارکان و اعمال اور مناسک و عبادات کے ساتھ اطاعت محض بے چون و چرا حکم بجالانے اور ہر مطالبہ کے آگے سر جھکا دینے کا نام ہے۔ حاجی کبھی مکہ میں نظر آتا ہے کبھی منیٰ میں کبھی عرفات میں کبھی مزدلفہ میں کبھی ٹھہرتا ہے کبھی سفر کرتا ہے وہ حکم کا بندہ اور اشارہ چشم و ابرو کا پابند ہے۔ اس کا خود کوئی ارادہ ہوتا ہے نہ فیصلہ نہ انتخاب کی آزادی وہ منیٰ میں اطمینان سے سانس بھی لینے نہیں پاتا کہ اس کو عرفات جانے کا حکم ملتا ہے۔ لیکن مزدلفہ میں رکنے کی اجازت نہیں ہوتی عرفات میں غروب آفتاب کے ساتھ نکلنے کا حکم ہوتا ہے حالانکہ وہ تھک کر چور ہو چکا ہوتا ہے زندگی بھر نماز وقت کی پابندی کے ساتھ پڑھنے کا عادی ہے۔ لیکن اب

اسے حکم ہوتا ہے کہ مغرب کی نماز مزدلفہ پہنچ کر عشاء کی نماز کے ساتھ پڑھو۔ مختصر یہ کہ یہ سب کچھ کامل اطاعت کی مشق ہے۔

اسی طرح ایک اور جذبہ بھی انسان کے اندر موجود ہے۔ جو شائد سب سے زور دار جذبہ ہے جس کو ہم عشق و محبت کا جذبہ قرار دیتے ہیں۔ جو انسان کے اندر کبھی سوز و گداز کی شکل اختیار کرتا ہے اور کبھی مستی و شوریدگی کی وہ کبھی دل میں ہلکا ہلکا درد بن کر سر اٹھاتا ہے اور آنسوؤں کی شکل میں اپنا اظہار کرتا ہے اور کبھی وہ مستی و شوریدہ سری کی صورت اختیار کرکے اپنا گریبان چاک کرتا ہے اور اپنے محبوب کے وصل کی تلاش میں خاک اڑانے' صحرانوردی کرنے اور سر پھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نماز میں آدمی جب اللہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا پھر رکوع میں جاتا اور آخر میں سجدے میں گر جاتا ہے تو یقیناً اس میں بھی قلب کے سوز و گداز کا دخل ہوتا ہے اور تہجد کی نماز میں بالخصوص کبھی کبھی آنسوؤں کی شکل میں اس عشق و سرمستی کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن جیسے میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ وقتی اور جزوی جذبات کا اظہار ہے جو اس وقت کے گذرنے کے بعد باقی نہیں رہتے اور آدمی معمولات زندگی میں کھو جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس جذبہ محبت کی آنچ کو مزید تیز کرنے کے لیے اور ایک سچے عاشق کے سینے میں بھٹی کی طرح سلگتے ہوئے اس جذبے کو شعلہ فشاں کرنے کے لیے کوئی ایسی عبادت فرض ہوتی جہاں صرف محبت کی فرمانروائی اور شوق کی حکمرانی ہوتی۔ جہاں پہنچ کر آدمی واقعی عشق و محبت میں اس طرح ڈھل جاتا کہ ہر دیکھنے والا اسے عاشق ناشاد کی کیفیت میں دیکھتا۔ چنانچہ اسی لیے یہ حج کی عبادت فرض کی گئی۔ اس میں وہ تمام طریقے اور تمام مناسک مقرر فرمائے گئے جس میں فی الواقع عشق و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ آدمی کے اندر لگی ہوئی عشق کی آگ کو فروزاں کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس میں آدمی اپنا گریبان چاک بھی کرتا ہے۔ اس میں دیوانہ وار آستانہ محبت کے چکر بھی لگاتا ہے۔ اس میں وہ غبار میں اٹا ہوا اور صحرا نوردی کرتا ہوا بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس میں وہ محبت کے آستانے سے لپٹ کر

سینے کی سلگتی ہوئی بھٹی کو اپنے آنسوؤں سے سرد کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اس میں وہ زمزم کے جام بھر بھر کر پیتا ہے جس کے ہر جام پر اسے وصل محبوب کی لذت محسوس ہوتی ہے۔

اسلام نے اگرچہ خیال کی پاکی، فکر کی بلندی نیت و ارادے کی صفائی و درستی، غیر سے بے تعلقی اور عمل میں اخلاص کے معیار کو اس حد تک بلند کر دیا ہے کہ جس سے بہتر معیار اور بلند سطح ناقابل تصور ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب فلسفے، دینی اور عقلی نظام اور پوری انسانیت مل کر بھی آج تک اس جیسی کوئی چیز پیش کرنے سے قاصر رہی ہے حتی کہ اس معیار کے قریب بھی اس کی رسائی نہ ہو سکی۔ لیکن فطرتِ انسانی فطرتِ انسانی ہی ہے ایک ایسی چیز کی جستجو اور آرزو ہر بشر کی سرشت میں داخل ہے جس کو وہ اپنی ان مادی آنکھوں سے دیکھ سکے اس کے ذریعے اپنے جذبہ شوق کی تسکین کر سکے اور قرب و وصال، تعظیم و تسلیم کے شدید تقاضے کی آسودگی کا سامان کر سکے جو ہمیشہ سے اس کے خمیر میں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ نماز، روزہ اور زکوٰۃ میں تو اس جذبہ کی تسکین کا کوئی سامان نہ تھا ایک مومن اس ذات کی اطاعت کرتا تھا جس کو وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اسی کے سامنے رکوع و سجود اور قعود کرتا تھا جس کے ہونے کا اسے یقین تھا۔ لیکن اس پر اس کو نہ دیکھے جانے کا بھی یقین تھا۔ اب یہ تو ممکن نہیں تھا کہ انسان اس دنیا میں اپنی ظاہری آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو دیکھ سکے لیکن یہ تو ممکن تھا کہ اس کی صفات کا ادراک کر کے وہ اس کی پوجا کرے اور اپنے اندر کی لگی ہوئی آگ کا سامان کرنے کے لیے ان مقامات تک جائے اور ان چیزوں کو دیکھے جہاں اللہ کی تجلیات برستی رہی ہیں اور آج بھی برس رہی ہیں۔ اور جن کا ادراک مختلف زمانوں میں اللہ کے ان عظیم بندوں نے کیا ہے جن کی ظاہری آنکھوں کی طرح ان کے دل کی آنکھیں بھی روشن تھیں۔ اس لیے حج کی عبادت فرض کر کے اس ضرورت کو اس طرح پورا کیا گیا کہ اس میں کچھ ایسی ظاہری اور محسوس چیزیں مقرر فرمائی گئیں جو اس کی ذات اقدس کے ساتھ کچھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ اس کی طرف منسوب ہیں اسی کی کہلائی جاتی ہیں۔

ان پر اس کی رحمت کی اس قدر تجلی اور عنایت کی ایسی نظر ہے کہ ان کو دیکھ کر ہی خدا یاد آتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ بہت سے ایسے واقعات و معاملات اور اعمال و احوال وابستہ ہیں جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں اور اس کے انعامات اس کا دین توحید' اور اس کے رسولوں کا جہاد اور صبر یاد دلاتے ہیں۔ ان چیزوں کا نام اس نے شعائر اللہ رکھا ان کی تعظیم اپنی تعظیم قرار دی اور ان میں کوتاہی کو اپنے حق میں کوتاہی کے مترادف قرار دیا اور انسانوں کو اس کی اجازت بلکہ دعوت دی کہ اس کے ذریعے وہ اپنی پوشیدہ و مستور محبت اور مشاہدہ و قرب کے فطری جذبہ کو تسکین دیں۔ اور اپنی آسودگی کا سامان کریں۔ امام غزالی نے اپنی نادرۂ روزگار ذہانت اور شریعت کے مطالعہ سے اس نکتہ کو خوب سمجھا تھا کہ محبت و شوق ایک زندہ اور سلیم الطبع انسان کی حقیقی ضرورت ہے۔ وہ اس کی تسکین کے لیے ہمیشہ طلب و جستجو میں رہتا ہے۔ بیت اللہ اور اس کے ساتھ جتنے شعائر اللہ اور حج کے مناسک و مقامات ہیں' وہ اس کی ایک سچی اور حقیقی ضرورت کو اچھی طرح پورا کرسکتے ہیں اور ان سے اس کی پوری تسکین ہوسکتی ہے۔ امام غزالی احیاء العلوم میں لکھتے ہیں کہ "اگر اللہ تعالیٰ سے لقا کا شوق ہو تو مسلمان اس کے وسائل و اسباب اختیار کرنے پر لامحالہ مجبور ہوگا عاشق اور محب ہر اس چیز کا مشتاق ہوتا ہے جس کی اضافت اس کے محبوب کی طرف ہو۔ کعبہ کی نسبت خدائے بزرگ و برتر کی طرف ہے۔ اس لیے مسلمان کو قدرتی طور پر اس کا سب سے زیادہ مشتاق ہونا چاہیے۔ علاوہ اس اجر و ثواب کی طلب و احتیاج کے جس کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔"

حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ بھی اسی نکتہ کو حج کی حکمت بتاتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "کبھی کبھی انسان کو اپنے رب کی طرف غایت درجہ اشتیاق ہوتا ہے اور محبت جوش مارتی ہے اور وہ اس شوق کی تسکین کے لیے چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے کہ اس کا سامان صرف حج ہے۔"

انسان کے فطری خصائص میں سے اس کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ یوں تو وہ ہر چیز سے اثر قبول کرتا ہے۔ آنکھوں کے ذریعے بھی اور کانوں

کے ذریعے بھی وہ پڑھ کر بھی اثر پذیر ہوتا ہے اور سن کر بھی۔ نصیحتیں بھی اس پر اثر انداز ہوتی ہیں اور نصیحت پر مبنی واقعات بھی۔ وہ بعض دفعہ دیواروں پر لکھا ہوا پڑھ کر بھی اپنا راستہ درست کرلیتا ہے۔ راستے کے سنگ میل بھی اسے منزل کی خبر دیتے ہیں۔ لیکن اس اثر پذیری میں جس عامل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ شخصیت کا عامل ہے۔ انسان کتابوں سے اتنا نہیں سیکھتا جتنا ایک شخصیت سے سیکھتا ہے۔ انسانی اقوال اس پر وہ اثر نہیں ڈالتے جس قدر انسانی افعال ڈالتے ہیں۔ بڑی سے بڑی نصیحت بعض دفعہ اس کے لیے بیکار ثابت ہوتی ہے۔ لیکن نصیحت پر مبنی کوئی چھوٹا سا واقعہ یا چھوٹا سا عمل اس کی طبیعت میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے نصیحتیں بھی فرمائیں' زندگی کے اسلوب بھی عطا کئے زندگی کے اصول بھی بخشے مگر زیادہ زور انبیاء کرام کے واقعات پر دیا گیا۔ اللہ کے راستے میں ان کی دعوت کا انداز اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات پھر اس پر ثابت قدمی اور استقامت' مال و دولت کا لالچ اور بھوک پیاس کی آزمائش کو خاطر میں نہ لانا بڑی سے بڑی قوت کو پرکاہ کے برابر نہ سمجھنا زندگی کے بند راستوں میں بھی اللہ کی ذات پر ہی توکل رکھنا اور پوری زندگی اللہ کے وعدوں پر یقین کرکے اپنے مسلک کی صداقت پر قائم رہنا۔ یہ تمام واقعات جزئیات سمیت قرآن کریم بار بار بیان کرتا ہے صرف اس لیے کہ قرآن کو بھیجنے والے سے بڑھ کر اور کون جانتا ہے کہ انسانی نفسیات کیا ہیں؟ اسے خوب معلوم ہے کہ جس طرح دیا دیئے سے جلتا ہے' زندگی زندگی سے روشن ہوتی ہے اور زندگی میں انقلاب' سوز دماغ سے نہیں بلکہ سوز قلب سے آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نماز' روزہ اور زکوٰۃ میں اگرچہ افراد اور شخصیات کے حوالے بھی ہیں مگر وہ اس قدر موثر نہیں۔ ہر آدمی اپنی نماز اپنے روزے اور اپنی زکوٰۃ پر نظر رکھتا ہے۔ بہت کم اس پر دھیان جاتا ہے کہ دوسرے کے اعمال کیا ہیں؟ اگرچہ نماز باجماعت روزے کی اجتماعی شکل و صورت اور بیت المال کی موجودگی کسی نہ کسی حد تک اس ضرورت کو بھی پورا کرتے ہیں لیکن پھر بھی ایک ایسی عبادت کی ضرورت محسوس ہوتی تھی جس میں

شخصی اعمال تاریخی حقائق کی صورت میں آدمی کے سامنے نمایاں رہیں اور وہ ان سے اثر قبول کیے بغیر نہ رہ سکے اور اس عبادت کو اس طرح کا پس منظر دیا جائے اور پھر اس کی ادائیگی کے لیے ایسا محل وقوع میسر ہو جس کا ایک ایک ذرہ تاریخ کے تاثر میں ڈوب کے نکلا ہو۔ چنانچہ حج ایک ایسی ہی عبادت ہے جس کو ادا کرتے ہوئے آدمی تاریخ کے اس تاثر کو بلکہ اس کی گرفت کو قدم قدم پر محسوس کرتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے نقوش قدم اسے جابجا دکھائی دیتے ہیں۔ حضرت ہاجرہ کی تشنہ لبی اور پھر اللہ پر بے پناہ اعتماد اسے صاف دکھائی دیتا ہے۔ وہ آج زمزم کو جب تاریخ کے آئینے میں دیکھتا ہے تو اللہ کی قدرت بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آجاتی ہے۔ منیٰ' مزدلفہ اور عرفات میں گھومتے پھرتے اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ انبیاء' صدیقوں اور صالحین کی روحوں سے ہم آغوش ہو رہا ہے اور وہ برابر اس کے سر پر اپنا سایہ ڈال رہی ہیں۔

جیسا کہ آغاز میں کہا گیا کہ ایک مومن کی اصل حیثیت عبدیت یعنی اللہ کی غلامی ہے۔ اللہ کی غلامی کا تقاضا بندگی بھی ہے اور اطاعت بھی۔ عشق و محبت کا اظہار بھی ہے اور روح و قلب کا سوز و گداز بھی۔ مگر یہ تمام حقائق اور بندگی کے تمام تقاضے نامکمل رہتے ہیں اگر اس میں جاں سپاری آخر دم تک وفا شعاری اور سرفروشی کا جذبہ شامل نہ ہو۔ وہ سوز و گداز کس کام کا جسے مرمٹنے کا جذبہ عطا نہیں ہوتا۔ اور اس عشق بلاخیز کا کیا فائدہ جو آستانہ جمال پر جانثار کرنے کی تمنا نہیں رکھتا۔ اس لیے اس عبودیت اور غلامی کا کمال اور اس کا اہتمام اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اسے اپنی جان یا جان سے بھی زیادہ قیمتی متاع کو قربان کرنے کا موقع ملے۔ چنانچہ اسی جذبہ عبودیت کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے فریضہ حج کو لازم ٹھہرایا اور اس کے مناسک میں قربانی کو ایک اہم حیثیت سے شامل فرمایا اور یہ واضح طور پر بتایا گیا کہ یہ قربانی اصل میں علامت ہے اس جذبہ ایثار اور تکمیل عبودیت کی جس کا اظہار حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوا تھا۔ وہ اللہ کی بندگی کی تمام ممکنہ صورتوں سے گذر چکے

تھے۔ انہوں نے اپنے پروردگار کی خاطر اپنے خاندان، اپنے ماں باپ اور اپنے وطن کو خیر باد کہا تھا۔ زندگی کی ہر آسودگی راہ خدا میں قربان کر کے نہ جانے کتنے سالوں تک نگر نگر گھومتے رہے اور تنہائی کے اس سفر میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے کس قدر صعوبتوں سے واسطہ پڑا۔ اس راستے میں چلتے ہوئے ان کی جان تک لینے کی کوشش کی گئی اور آگ کے الاؤ میں پھینکا گیا تو وہ نہایت اطمینان سے اس امتحان سے بھی سرخرو ہو کر نکلے۔ اللہ کے دین کی دعوت دیتے ہوئے بڑھاپے کی آخری منزلوں کو چھو رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جیسا بیٹا عطا فرمایا۔ چنانچہ ایک وقت آیا کہ پروردگار کی طرف سے حکم دیا گیا کہ ایسی وہ تمام چیزیں جس سے انسان کا رشتہ محبت قائم ہو سکتا ہے ایک ایک کر کے تم نے میرے راستے میں قربان کر ڈالیں لیکن ابھی ایک محبت کا ٹانکا تمہارے دل سے جڑا ہوا ہے یعنی بیٹے کی محبت کا ہم چاہتے ہیں کہ اسے بھی قربان کر ڈالو۔ وہ اپنے پروردگار کا فرمانبردار بندہ اس امتحان میں پورا اترنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ بیٹے کو ساتھ لے کر منیٰ کی وادی میں پہنچا اور اپنے تئیں اسے قربان کر ہی ڈالا لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے بچا لیا اور اس کے بدلے میں ایک مینڈھے کی قربانی دی گئی اور یہی وہ قربانی ہے جو حاجی منیٰ کے میدان میں اور باقی ساری امت مسلمہ اپنے اپنے شہروں میں دس ذی الحج کو پیش کرتی ہے۔ چنانچہ جب آدمی منیٰ کی وادی اور منیٰ کی پہاڑیوں میں مناسک حج ادا کرتے ہوئے پہنچتا ہے اور پھر وہ دس ذی الحج کو اس قربانی کی یاد کو تازہ کرتے ہوئے خود کسی نہ کسی جانور کی قربانی دیتا ہے تو وہ اصلاً اپنے جذبہ عبودیت کی تکمیل کرتا ہے اور یہ عہد کرتا ہے کہ یا اللہ تو اگر مجھ سے میری جان، میرا وطن، میرا مال و دولت، میرے تعلقات حتی کہ میری اولاد کی قربانی بھی مانگے گا تو میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اس سے دریغ نہیں کروں گا۔

جذبہ عبودیت کی تکمیل ہی چونکہ عبادت کا اصل مقصد ہے اور وہ چونکہ فریضہ حج سے انجام کو پہنچتا ہے اس لیے حج کو تمام ارکان سے افضل اور تمام ارکان کا جامع قرار دیا گیا۔

# حج کا منظر اور اس میں مخفی حقائق

معزز خواتین و حضرات اور طلباء عزیز!

آج کی گفتگو میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی اندرونی خصوصیات اس کے طبعی میلانات اور اس کے احساسات و جذبات کو عبادت کے واسطے سے جذبہ عبودیت میں ڈھالنے اور پھر اس جذبہ عبودیت کی تکمیل کرنے کے سلسلہ میں فریضہ حج نے جو کردار ادا کیا ہے اور اس کی جو تفصیلات آپ نے گذشتہ صحبت میں سنی ہیں مناسک حج کی صورت میں وہ کس طرح پوری ہوتی ہیں؟ اس میں سب سے پہلی چیز جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ فریضہ حج کی تیاری اور اس کی نیت ہے۔ آدمی تیاری تو نماز کی بھی کرتا ہے لیکن وہ چند لمحوں کا عمل ہے۔ روزہ دن بھر کا عمل ہے اس کی وجہ سے اگر آدمی واقعی سوچ سمجھ کر روزہ رکھے تو ایک لمبے وقفے کے لیے عبودیت کے جذبہ سے سرشار رہتا ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی تو یقیناً ایک لمحے کا عمل ہے اس لیے جب آدمی اسے ادا کر دیتا ہے اس کے بعد باقی معمولات میں گم ہو کر اس جذبہ سے دور نکل جاتا ہے لیکن حج ایک ایسی عبادت ہے کہ جب تک آدمی پر حج فرض نہیں ہوتا یعنی اسے حج کی استطاعت میسر نہیں آتی ہر نیک دل انسان اس کی تمنا میں وقت گزارتا ہے۔ جیسے جیسے عمر ڈھلتی جاتی ہے حج کی تمنا جوان ہوتی جاتی ہے اور کتنی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دعا کی قبولیت کے اوقات میں حج پر جانے کی دعائیں مانگتا ہے اس کے اندر کی سوزش محبت اسے اللہ کے گھر کی زیارت پر ہمیشہ اکساتی رہتی ہے۔ وہ دریار حبیب ﷺ کی زیارت کے لیے ضرور کبھی نہ کبھی تڑپتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ جذبہ عبودیت جو اس کی اصل حقیقت ہے وہ نہ صرف مرنے نہیں

پاتا بلکہ وقتاً" فوقتاً" اسے زندگی کی توانائی ملتی رہتی ہے اور جب اس پر حج فرض ہو جاتا ہے تو پھر حج کے سفر سے کئی مہینے پہلے اس کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ درخواستیں دی جا رہی ہیں۔ پیسوں کی فراہمی ہو رہی ہے۔ پھر وہ وقت آتا ہے جب قرعہ اندازی میں نام نکل آتا ہے۔ اب یوں سمجھئے کہ جانا تو طے پا گیا لیکن یہ سفر عجیب سفر ہے اس میں تیاری صرف سامان سفر کے تیار ہو جانے کا نام نہیں بلکہ اس کی تیاری میں سب سے پہلی چیز اخلاص نیت ہے۔ آدمی بار بار اپنی نیت کو خالص کرتا ہے اپنے سفر کی قبولیت اور حج کی قبولیت کے لیے دعائیں مانگتا ہے اور پھر اس کے ساتھ ہی وہ اپنی زندگی کے معمولات پر نظر ڈالتا ہے اگر اس کی زندگی اس سے پہلے منکرات و فواحش میں گزرتی رہی ہے تو وہ بار بار شرم میں ڈوب ڈوب جاتا ہے کہ میں جس مقدس گھر میں جا رہا ہوں کیا یہ ناپاک زندگی لے کر وہاں جاؤں گا۔ مجھے میرے اللہ نے طلب فرمایا ہے اور میں رسول اللہ ﷺ کے شہر میں بھی جاؤں گا تو کیا یہ ناپاک جسم لے کر جاؤں گا اس لیے وہ حج پر روانگی سے پہلے ہی بار بار اللہ سے توبہ بھی کرتا ہے اور مغفرت کی دعائیں بھی مانگتا ہے۔ پھر وہ اپنے معاملات کو دیکھتا ہے کہ کیا میں نے آج تک کسی کی حق تلفی تو نہیں کی؟ کیا کسی آدمی کا حق میرے ذمہ تو نہیں ہے؟ وہ بار بار اپنے دل کو ٹٹولتا ہے اور اپنے حافظے کی مدد سے ماضی کو کریدتا ہے اور اگر اسے یاد آ جاتا ہے کہ واقعی کسی کا حق میرے ذمہ ہے یا میں نے کبھی کسی کو تکلیف پہنچائی تھی، کسی کا دل دکھایا تھا، تو وہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ان تمام حقوق سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا ہے اندازہ فرمائیے کہ ابھی یہ سفر شروع نہیں ہوا لیکن اس نے زندگی میں پاکیزگی اور تزکیہ کا کام شروع کر دیا ہے۔ پھر جیسے جیسے اعزا و اقرباء میں یہ خبر پھیلتی ہے کہ فلاں صاحب حج پر جا رہے ہیں ساری بے عملیوں کے باوجود چونکہ حرمین الشریفین سے ہماری عقیدت ابھی باقی ہے اسی عقیدت کی وجہ سے لوگ اپنے جانے والے عزیز سے ملنے آتے ہیں۔ ظاہر ہے جو لوگ اس حوالے سے ملنے کے لیے آئیں گے وہ یقیناً مکہ اور مدینہ کی باتیں کریں گے۔ کعبتہ اللہ میں حاضری اور روضہ مقدس پر حاضری کے

تذکرے ہوں گے۔ اس سے اللہ سے تعلق کی تجدید ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ سے محبت میں اضافہ ہوگا۔ اس سے بڑھ کر متاع عزیز اور کیا ہو سکتی ہے۔ پھر جب آدمی کا اس سفر پر روانہ ہونے کا وقت آتا ہے تو ہمیں اس وقت کے لیے جو دعائیں سکھائی گئی ہیں۔ ان سے اندازہ فرمایئے کہ کیا کسی اور سفر کو اس سفر سے کوئی نسبت ہو سکتی ہے۔ دنیا بھر کے سفر ہر مسافر کے اندر دنیا کی محبت' خواہش نفس پیدا کرتے اور دنیاوی لذائذ سے رغبت کی تلقین کرتے ہیں۔ مگر اس سفر پر روانہ ہونے والا اللہ سے جو کچھ مانگتا ہے اس کا اندازہ آپ کو اس دعا سے ہوگا۔

”اللھم انا نسألُکَ فی سَفَرنَا ھذا البر والتقوٰی ومن
العَمَلِ ما تَحبَّ وِ تَرضَی اللھم ھوِّن عَلَینا سفرنا
ھذا و اَطوِعنَا بَعدہ اللھم انتَ الصَّاحِب فی السفر
والخَلیفَۃَ فَی الاھلِ اللّٰھم انی اعوذبک من وَ عثَاء
السفر و کَابۃ المَنظر وسوءِ المُنقلب فی المالِ
والاھلِ والولد“

اے اللہ ہم تجھ سے اس سفر میں نیکی اور احتیاط کے طالب ہیں اور ایسے اعمال کے جو تجھے پسند ہوں۔ اے اللہ ہمارے سفر کو ہمارے لیے آسان اور ہلکا بنا دے اور اس کی مسافت کو لپیٹ دے۔ اے اللہ تو سفر میں بھی ہمارے ساتھ ساتھ ہے اور گھر میں بھی ہمارے پیچھے نگران اور خیال رکھنے والا ہے۔ اے اللہ میں تجھ سے سفر کی کلفت اور ایسی چیز سے پناہ مانگتا ہوں جس کے دیکھنے سے کوفت ہو اور مال اور اہل و عیال کی طرف بری واپسی سے (تیری پناہ مانگتا ہوں۔)

اور جب سفر شروع ہو جاتا ہے تو پھر آدمی اپنے اللہ سے دعا کرتا ہے:

”اللھم بک انتشرتُ و الیک توجھتُ و علیک
توکلتُ انت ثِقتی و انت رِجائی اکفنی ما اھمنی
وما لا اھتم بہ وما انت اعلم بہ منی عن جارک زودنی

التقوی واغفرلی ذنوبی و وجھنی للخیر اینما توجہت"

اے اللہ میں تیرے سہارے چل کھڑا ہوا ہوں اور تیری طرف رخ کر دیا ہے اور تجھے مضبوط پکڑ لیا ہے اور تجھ پر بھروسہ کیا ہے تو ہی میرا سہارا ہے تو ہی میرا آسرا ہے۔ جس چیز کی مجھے فکر ہے اور جس کی فکر نہیں اور جس کو تو زیادہ جانتا ہے سب کا تو خود ہی انتظام فرما دے۔ تیرے پڑوس میں آنے والا غالب و محفوظ ہے۔ تیری مدح و توصیف بلند ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تقوی کو میرا زاد راہ بنا۔ میرے گناہوں کو معاف فرما اور جس طرف رخ کروں خیر ہی کی طرف میرا رخ کر۔

اندازہ فرمایئے جو آدمی ان احساسات کے ساتھ سفر کا آغاز کرے گا سفر میں اس سے کوئی بدامنی یا کسی منکر کا ارتکاب کیونکر ہو سکتا ہے۔ بلکہ جب تک وہ سفر میں رہے گا اس کی منزل کا تصور اس کی نگاہوں میں بسا رہے گا اور اس منزل کی طلب اس کے شوق کو فراواں اور اس کی محبت میں ہر لمحہ اضافہ کرتی رہے گی۔ راستے میں جن لوگوں سے واسطہ پڑے گا یہ ان کے لیے پیغام رحمت ثابت ہو گا۔ کوشش کرے گا کہ میں ہر ایک کے کام آؤں تاکہ اپنے اللہ سے اجر و ثواب پاؤں اور جب بھی اسے معاملات اور عبادات سے فرصت ملے گی تو اس کی زبان پر سوائے اللہ کے ذکر کے اور کچھ نہیں ہو گا اور اب اگر یہ جانے والا بحری جہاز کا مسافر ہے تو چونکہ راستے میں کئی دن صرف ہوں گے اس لیے ہر گذرنے والا لمحہ اس کی محبت اور اس کے دل کی پاکیزگی میں اضافہ کرتا رہے گا اور وہ اپنی منزل تک پہنچنے سے پہلے اچھی طرح اپنے آپ کو وہاں حاضری کے لیے تیار کر لے گا اور اگر یہ جانے والا ہوائی جہاز کا مسافر ہے تو جتنی تیزی سے ہوائی جہاز سفر کرے گا ویسی ہی تیزی سے اس کے خیالات بھی سفر کریں گے۔ وہ بار بار اس تصور میں ڈوب کے ابھرے گا:

؎ کہاں میری قسمت عنایت ہے ان کی
سفینے پہ ان کے چلا جا رہا ہوں

ہواؤں کی بخشش لیے جارہی ہے
حرم کی کشش کے مزے پارہا ہوں

پھر وہ وقت آئے گا جب اسے بتا دیا جائے گا کہ تمہارا جہاز اس جگہ کے قریب ہے جو تمہاری میقات ہے۔ تم ایک ایسی منزل کے مسافر ہو جو احکم الحاکمین کا دربار ہے۔ وہاں تم دنیا داروں کے لباس میں نہیں جاسکتے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ منہ اٹھائے ہر طرح کے لباس میں وہاں داخل ہو جاؤ بلکہ اس گھر میں داخلے سے پہلے جس طرح تمہیں اپنے خیالات کو پاکیزہ بنانا ہوگا اپنے اعمال کی اصلاح کرنا ہوگی اسی طرح اپنے ظاہر کو بھی درست کرنا ہوگا۔ تم اس احکم الحاکمین کے دربار میں خاص تصورات لے کر اور عاجزی کی تصویر بن کر بلکہ مکمل غلام بن کر داخل ہوسکتے ہو۔ اس سے حاجی میں ایک نیا شعور اور فکری و روحانی بیداری پیدا ہوتی ہے۔ اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک شاہی دربار کے قریب آگیا ہے اور اس کی مقدس اور پاکیزہ حدود میں داخل ہوگیا ہے۔ اگر یہ میقات نہ ہوتے تو حجاج بیت اللہ تک بلا کسی شعور و احساس کے اس طرح پہنچ جاتے جس طرح دیہاتی اور گنوار لوگ سلاطین و امراء کے دربار میں بلا سمجھے بوجھے گھس جاتے ہیں اور ذلت کے ساتھ دھکے دے کر نکال دیئے جاتے ہیں۔ پاکستان سے جانے والوں کی میقات کوہ یلملم ہے۔ وہاں سے گذرنے سے پہلے ہر حاجی کو احرام باندھنا پڑتا ہے۔ یہ احرام کیا ہے؟ وضو یا غسل کرنے کے بعد پاکیزہ جسم اور پاکیزہ نیت کے ساتھ آدمی دو چادریں پہنتا ہے۔ ایک چادر لنگی کی طرح پہنتا ہے اور دوسری اوپر اوڑھ لیتا ہے۔ احرام کی نیت کرنے سے پہلے آدمی دو نفل پڑھتا ہے۔ اس کے بعد تلبیہ کہتے ہوئے آدمی احرام کی نیت کرتا ہے اور سر کو کھول دیتا ہے۔ تلبیہ کہتے ہی حاجی محرم ہو جاتا ہے اور احرام کی ساری پابندیاں اس پر عائد ہو جاتی ہیں۔ اب وہ سلا ہوا کپڑا نہیں پہن سکتا۔ ایسا جوتا بھی نہیں پہن سکتا جو پاؤں کی پشت کی ابھری ہوئی ہڈی کو ڈھانپنے والا ہو۔ حجامت نہیں بنا سکتا بلکہ جسم کے کسی حصے کا ایک بال بھی نہیں توڑ سکتا۔ ناخن نہیں تراش سکتا۔ خوشبو نہیں لگا سکتا۔ بیوی سے ہم بستر نہیں ہوسکتا بلکہ ایسی

کوئی بات بھی نہیں کرسکتا جو اس خواہش کو ابھارنے والی ہو اور جس سے نفس کو خاص لذت ملتی ہو۔ کسی جانور کا شکار نہیں کرسکتا بلکہ اپنے جسم یا کپڑے کی جوں بھی نہیں مار سکتا۔ عورتوں کے احرام کے بھی یہی احکام ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ سلے ہوئے کپڑے پہن سکتی ہیں اور سر کھولنے کا حکم ان کے لیے نہیں ہے۔ البتہ چہرے پر کپڑا ڈالنے کی ان کے لیے ممانعت ہے۔ بس یوں سمجھنا چاہیے کہ ان کا احرام بس یہی ہے کہ چہرے پر کپڑا نہ ڈالیں مگر جب کسی اجنبی اور نامحرم شخص سے سامنا ہو تب وہ کسی پنکھے یا کسی اور چیز سے اوٹ کرلیں۔ جس سے چہرہ نامحرموں سے چھپ جائے۔ اس طرح اس جانے والے نے اب تک جو اپنی شخصیت کا ایک خاص ڈھنگ بنا رکھا تھا جس کے حوالے سے اس کی شناخت تھی اور جس پر وہ فخر کرتا اور اتراتا تھا احرام سے اس شخصیت کا تمام تانا بانا ٹوٹ جاتا ہے۔ اب وہ ایک ایسے فطری لباس میں ملبوس ہے جو صرف تن پوشی کا کام دیتا ہے جس میں کسی تکلف اور آرائش کا دخل نہیں۔ سرزمین حرم میں پہنچنے والے لاکھوں لوگ اسی فطری لباس میں ملبوس ہوکر جب وہاں حاضری دیتے ہیں تو آدمی کو اپنی اصل حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ میں نے آج تک اپنے آپ کو مصنوعی پردوں میں چھپا رکھا تھا اصل حیثیت تو ہم سب کی ایک ہے۔ پھر آخر وہ وقت آتا ہے جب آدمی حدود حرم کے قریب پہنچتا ہے۔ مکہ معظمہ سے تقریباً دس میل دور شمیسیہ نام کا ایک مقام ہے جہاں سے حرم کی حد شروع ہوجاتی ہے سن 6 ہجری میں حضور ﷺ کو کفار مکہ نے یہاں عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔ یہیں حدیبیہ کا وہ میدان ہے جس کے ایک درخت کے نیچے حضور ﷺ نے صحابہ کرام سے موت پر بیعت لی تھی۔ جو بیعت رضوان کے نام سے مشہور ہے اور جس کا قرآن کریم میں بھی ذکر ہے۔ وہاں پہنچتے ہی حاجی اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلا کر دعا مانگتا ہے۔ "اے اللہ یہ تیرا اور تیرے رسول ﷺ کا حرم ہے۔ اس میں جانوروں کو بھی امن ہے تو اس کی برکت اور حرمت سے میرے گوشت پوست اور سارے جسم پر دوزخ کی آگ حرام کردے۔ قیامت کے عذاب سے مجھے امن نصیب فرما۔"

چند میل آگے نکل کر مکہ معظمہ کی عمارتیں نظر آنے لگتی ہیں تو آدمی کا وہ جذبہ محبت جو اب تک سینے کے اندر مچل رہا تھا وہ بے قراری اور بے تابی میں ڈھل جاتا ہے۔ جیسے ہی اس کی سواری مکہ معظمہ میں داخل ہوتی ہے تو وہ دلی بے قراری کے ساتھ یہ دعا مانگتا ہے۔

اے اللہ میں تیرا بندہ ہوں۔ تیرا فرض ادا کرنے اور تیری رضا اور تیری رحمت کا طالب بن کر آیا ہوں۔ تو میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے اور قیامت کے دن معافی اور بخشش میرے لیے مقدر فرما دے اور میراج صحیح طرح سے ادا کرانا۔ پھر آدمی آگے بڑھ کر مسجد حرام میں داخل ہوتا ہے یہ وہ مسجد ہے جو کعبتہ اللہ کے اردگرد بنی ہوئی ہے۔ داخلے کے وقت وہ بسم اللہ والصلوۃ والسلام علی رسول اللہ کہہ کر داہنا پاؤں اندر رکھتا ہے اور یہ دعا پڑھتا ہے۔

"اللّٰھمَّ اغفر لی ذنوبی وافتح لی ابوابَ رحمتک"

پھر جیسے ہی اس کی نظر بیت اللہ شریف پر پڑتی ہے تو وہ اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر" کہہ کر ہاتھ اٹھاتا ہے اور دعا مانگتا ہے۔

"اللھم زِدْ بیتکَ ھٰذا تَشریفاً" و تَعظیماً" و تکریماً" و مُھابۃً و زِدْ مَن شَرَّفَہ و کَرَّمہ مِمَّن حَجَّہ او اِعتَمرَہ تشریفاً" و تکریماً" و برًّا اللّٰھم انتَ السَّلام و مِنکَ السَّلامَ فحیّنا ربَّنا بالسَّلام اَعوذ بربِّ البَیتِ مِنَ الدَّین والفَقرِ و مِن ضِیقِ الصَّدرِ و عَذابِ القَبرِ"

اے اَللہ اپنے اس مقدس گھر کی عزت و عظمت و شرافت و ہیبت میں ترقی فرما اور حج اور عمرہ کرنے والوں میں جو اس کی تعظیم و تکریم کریں ان کو بھی شرافت و عظمت اور نیکی عطا فرما۔ اے اللہ تیرا ہی نام سلام ہے اور سلامتی تیری ہی طرف سے ہے۔ تو ہم پر سلامتی بھیج۔ میں اس مقدس گھر کے رب سے پناہ مانگتا ہوں قرضہ اور محتاجی سے اور سینہ کی تنگی سے اور قبر کے عذاب

ہے۔

اب یہ مسافر "لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک والملک لا شریک لک" کہتا ہوا اللہ کے اس گھر کے سامنے کھڑا ہے جسے بیت اللہ، بیت العتیق اور کعبہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ گھر مسلمان عرفاء کے خیال کے مطابق عرش الٰہی کا سایہ ہے اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا سمت القدم ہے۔ وہ ازل سے اس دنیا میں خدا کا معبد اور خدا پرستی کا مرکز ہے۔ سب بڑے بڑے پیغمبروں نے اس کی زیارت کی۔ اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتوں کی سمت اس کو قرار دیا۔ اس لیے پروردگار نے فرمایا "ان اول بیت وضع للناس" سب سے پہلا خدا کا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہ یہی گھر ہے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت پہلے دنیا نے اپنی گمراہیوں میں اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ طوفان نوح علیہ السلام کے وقت اسے اٹھا لیا گیا اور پھر دنیا کی بے راہ روی اور خدا ناشناسی نے اس گھر کے وجود پر غفلت کے پردے تان دیئے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دنیا میں تشریف آوری کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں اس گھر کی چاردیواری بلند کرنے کا حکم دیا۔ قرآن پاک میں جہاں اس کی منظر کشی کی گئی ہے وہاں یہ نہیں کہا گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گھر کو بنایا تھا بلکہ یہ فرمایا گیا۔

"اِذ یرفَعَ ابراہیمُ القواعِدَ من البَیت"

کہ اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ یعنی بنیاد پہلے سے موجود تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس افتادہ بنیاد کو ازسرنو بلند کیا۔ دوسری جگہ قرآن کریم کہتا ہے۔

واذ بوّأنا لابراہیم مکانَ البیت اَن لاّ تُشرک بی شیئا"

اور ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے اس گھر کی جگہ کو ٹھکانہ بنایا کہ ہمارے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ گھر

کی جگہ تو پہلے سے متعین تھی البتہ دیواریں بے نشان تھیں۔ تو ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس گھر کی جگہ بتادی اور اس کو ان کی جائے پناہ اور ٹھکانہ بنا دیا۔ کیونکہ عراق، شام، مصر اور فلسطین میں ہر جگہ باسطوت جباروں، بت پرستوں اور ستارہ پرست قوموں نے توحید کا کوئی ٹھکانہ باقی نہیں رہنے دیا تھا اور توحید کے نام لیواؤں کے لیے زمین تنگ کر دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے شر سے دور ایک ایسی جگہ کو توحید کا ٹھکانہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جائے پناہ بنا دیا جو ایک بے نام و نشان صحرا میں چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھری ہوئی تھی۔ اب یہ مسافر اس بیت العتیق کے سامنے کھڑا یوں محسوس کرتا ہے کہ توحید کی اس سے بڑی اور دلیل کیا ہوگی کہ جتنی انسانی تاریخ طویل ہے اتنی ہی اس گھر کی تاریخ طویل ہے۔ یہ بالکل انسانی دل کی طرح دینی احساسات کی آبیاری کی ضامن بن کر ہمیشہ انسانیت کے لیے ایک مرکز و محور رہی ہے اور اللہ کی تجلیات کا مرکز بن کر اللہ والوں کے لیے محبوب اور مشہور کی حیثیت سے اہل ایمان اور اہل دین کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہی ہے۔ دنیا نے عروج و زوال کے ہزاروں ادوار دیکھے۔ تاریخ نے ہزاروں کروٹیں بدلیں۔ شمس و قمر اپنی تابانیوں سمیت لاکھوں سال سے محو سفر رہے اور دنیا نے شکست و ریخت کے ہزاروں زخم کھائے مگر اس گھر کی (جس کا سوائے حجر اسود کے کوئی ایک پتھر بھی اپنی اصل حیثیت میں باقی نہیں) مرکزی حیثیت اس کی محبوبیت اور اس کا زندگی بخش کردار کبھی گدلانے یا کجلانے نہیں پایا۔ آدمی جب تلبیہ پڑھتے ہوئے اس کی طرف بڑھتا ہے تو وہ اپنے احرام کو دیکھتا ہے اور لوگوں کو دیوانہ وار اس کے گرد طواف کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی خدا کے حضور میں حاضری کو دل ہی دل میں زندہ کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ جس طرح آج میں حاضر ہوا ہوں (تمدن کے ابتدائی دور کی طرح دو بن سلے اور سادہ کپڑے پہن کر) بالکل اسی طرح کبھی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اس کے گھر کے سائے میں اللہ کے حضور حاضری دیتے ہوں گے اور اس وقت سے آج تک اللہ کے غلاموں کا یہی

شعار رہا ہے۔ وہ بار بار لبیک اللھم لبیک کا ترانا گاتا ہے اور پھر قدم قدم اس گھر کی طرف قلب تپیدہ اور احساس لرزیدہ کے ساتھ اللہ کے گھر کے سائے میں پہنچتا ہے اور حجر اسود کے مقابل اس طرح کھڑا ہوتا ہے کہ اس کا دایاں کندھا حجر اسود کے بائیں کنارے کی سیدھ پر اور پورا حجر اسود اس کی داہنی طرف ہوتا ہے۔ پھر نیت کرنے کے بعد ذرا دائیں جانب ہٹ کر حجر اسود کے بالکل سامنے کھڑے ہو کر نماز کی طرح دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھا کر "بسم اللہ اللہ اکبر لا الہ الا اللہ و للہ الحمد" پڑھتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور اگر موقع ملتا ہے تو ادب سے حجر اسود کو بوسہ دیتا ہے اور اگر ہجوم کی وجہ سے بوسہ دینے کا موقع نہیں ملتا تو اپنا ہاتھ اسے لگا کر چومتا ہے یا اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے دونوں ہتھیلیاں حجر اسود کی طرف کرتا ہے اور زبان سے کہتا ہے' "بسم اللّٰہ اللّٰہ اکبر لا الہ الا اللّٰہ و للّٰہ الحمد" لیکن ساتھ ہی اس کے دل میں خیالات کا ایک طوفان سا اٹھتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ یا اللہ یہ حجر اسود یعنی کالا پتھر کیا ہے جسے خانہ کعبہ کی دیوار کے گوشہ میں قد آدم بلند کر دیا گیا ہے۔ خانہ کعبہ بیسیوں دفعہ گرا اور بنا' کبھی سیلاب میں بہہ گیا اور کبھی آگ میں جل گیا۔ اس بنیاد کا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں پڑی تھی ایک پتھر بھی اس میں باقی نہیں مگر اس عہد عتیق کی یادگار صرف یہی ایک پتھر رہ گیا تھا جس کو اہل عرب نے جاہلیت میں بھی بڑی حفاظت سے قائم رکھا اور ساڑھے تیرہ سو برس سے اسلام میں وہ اسی طرح نصب ہے۔ یہ پتھر کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار میں لگایا گیا ہے جس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑے گا۔ اس لیے حجر اسود کے مقابل گوشہ کا نام رکن شامی ہے اس گوشہ کی تخصیص سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضمر ہے۔ اس گوشہ میں اس پتھر کو لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے طواف کو شروع اور ختم کرنے کے لیے وہ ایک نشان کا کام دے۔ ہر طواف کے خاتمے کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی دے سکتے ہیں اور سینے سے بھی لگا سکتے ہیں۔ ہاتھ یا کسی لکڑی یا کسی اور چیز سے اس کو چھو کر یا اس چیز کو چوم بھی سکتے ہیں یہ نہ سہی تو اس کی طرف صرف اشارہ پر بھی کفایت کر سکتے ہیں۔

چونکہ بعض روایات کے مطابق اس پتھر کی حیثیت اللہ کے ہاتھ کی ہے۔ جو اسے ہاتھ لگاتا ہے گویا وہ اللہ کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا ہے جو اسے چومتا ہے وہ اللہ کے ہاتھ کو چومتا ہے۔ ایک مشتاق زیارت کی نگاہ میں اس تخیل کے ساتھ کہ تمام دنیا بدل گئی، شہر مکہ کا ذرہ ذرہ بدل گیا، کعبہ کی ایک ایک اینٹ بدل گئی، مگر یہ وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تک کے مقدس لب یا مبارک ہاتھ بالیقین پڑے ہیں اور پھر تمام خلفائے راشدین، صحابہ کرام، آئمہ اعلام، اکابر اسلام اور حکماء عظام کے ہاتھوں نے اس کو مس کیا ہے اور آج ہمارے گنہگار لب اور ہاتھ بھی اس کو مس کر رہے ہیں۔ اس لیے ہمارے دلوں اور آنکھوں میں تاثیر اور کیفیت کی ایک عجیب لہر پیدا ہو جاتی ہے۔ بایں ہمہ ہم مسلمان یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک پتھر ہے جس میں کوئی قدرت نہیں اور جسے بادۂ توحید کے ایک ہوشیار، متوالے (حضرت عمر بن خطاب) نے چوم کر کہا تھا "اے کالے پتھر میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک معمولی پتھر ہے۔ تو نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان لیکن میں اس لیے تجھے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے محمد رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے۔" الغرض یہ بوسہ اس محبت کا نتیجہ ہے جو اس یادگار کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی روحانی اولاد کو ہے۔ اور پھر یہ یادگارین وہاں قدم قدم پر پھیلی ہوئی ہیں جس نے کعبۃ اللہ اور اس کے اردگرد کے ماحول کو ایک محبوب اور مشہود کی حیثیت دے دی ہے ایک عاشق صادق اپنی پلکیں بچھاتے ہوئے اور دیدہ و دل فرش راہ کرتے ہوئے عشق و محبت کے لبوں سے اس کے ذرے ذرے کو چومتا ہے پھر یہ مسافر حجر اسود سے ذرا اور آگے بڑھتا ہے تو حجر اسود اور باب کعبہ کے درمیان اڑھائی گز کے قریب بیت اللہ شریف کی دیوار کا جو حصہ ہے وہ ملتزم کہلاتا ہے اس کو یاد آتا ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں دیکھنے والوں نے سرور کائنات رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے سینہ مبارک اس کے ساتھ لگائے اور کبھی دایاں اور کبھی بایاں رخسار اس پر رکھے رو رو کر اپنے اللہ سے التجائیں فرما

رہے تھے۔ یہ جگہ جہاں قبولیت دعا کی جگہ ہونے کی وجہ سے بہت مقام و مرتبہ کی حامل ہے وہاں اس کے نصیب یہ کیا کم ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ ﷺ کی لمس کی خوشبو اور ان کے سینے کی حرارت آج بھی یہاں محسوس کی جاسکتی ہے پھر وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹتا ہے تو اسے بلور کا بنا ہوا مرتبان کی شکل کا ایک گلوب جس کے اوپر پیتل چڑھا ہوا ہے دکھائی دیتا ہے اور اس کے آگے یا پیچھے کھڑے ہو کر امام کعبہ نماز پڑھاتے ہیں اور اسی کا نام قرآن کریم میں مقام ابراہیم علیہ السلام ہے۔ اس کے اندر جھانک کر دیکھیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں قدموں کے نشان صاف نظر آتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبتہ اللہ کی دیواریں اٹھائی تھیں۔ اللہ کی قدرت اور نبوت کے جلال سے یہ پتھر پگھل گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں قدموں کے نشان اس میں پیوست ہو گئے ایک عاشق صادق کو یہ دونوں قدموں کے نشان روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اسے توجہ دلاتے ہیں۔

؎ ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

جن لوگوں کا دل عشق خداوندی سے روشن ہو جاتا ہے وہ کبھی مرنے نہیں پاتے بلکہ جریدۂ عالم پر ان کا دوام ثبت ہو جاتا ہے کہ آج بھی اگر تم وہی ایثار و سرفروشی اور کلمہ خداوندی کی برتری کا راستہ اختیار کرلو اور اپنے آپ کو اس راستے میں مٹا دینے کا عزم باندھ لو تو اس دھرتی پر تمہارے قدم اور نقوش قدم اسی طرح ثبت ہو جائیں گے جیسے تم مقام ابراہیم علیہ السلام کو دیکھ رہے ہو اور وہ امامت اور قیادت اللہ تعالیٰ تمہیں عطا فرمائے گا جس کا وعدہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اور پھر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا۔

طواف کے خاتمے پر آدمی دو رکعت نماز پڑھ کر چاہ زمزم پر آتا ہے تو تاریخ فدائیت کا ایک اہم کردار اسے پکار پکار کر کہتا ہے کہ دیکھو یہ ایک کنواں جو ہزاروں سال سے دنیا کی پیاس بجھا رہا ہے اور قیامت تک بجھاتا رہے گا اور جس

کے جوش اور سیرابی میں آج تک کبھی دنیا نے کمی محسوس نہیں کی یاد کرو کہ اللہ کے فیضان کا اس بے آب و گیاہ صحرا میں یہ سرچشمہ اور مرکز کس کے طفیل وجود میں آیا تھا۔ تو تاریخ جواب دے گی کہ ایک ایسی ماں نے جو اللہ کے وجود پر، اس کی قدرتوں پر، اس کے وعدوں پر بے پناہ یقین رکھتی تھی اس بے آب و گیاہ صحرا میں یہاں کی تپتی ہوئی ریت پر اپنے نومولود کو لٹا کر خود پانی کی تلاش میں نکلی تھی اور اس نومولود نے بھوک اور پیاس کی شدت میں یہاں ایڑیاں رگڑی تھیں۔ اس کی ایڑیوں کی رگڑ سے یہاں ایک سوتا پھوٹا تھا جو چشمے کی طرح ابلنے لگا اور جب اس بچے کی والدہ نے دیکھا کہ یہ ابلنے والا پانی کہیں گرد و پیش کی ریت میں جذب ہو کر نہ رہ جائے اس کی زبان سے بے اختیار نکلا "زم زم" ٹھہر ٹھہر۔ اور اس نے چاروں طرف اس کے منڈیر بنا دی تو اس چشمے نے گہرا ہونا شروع کر دیا اور کنویں کی شکل اختیار کر گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت ہاجرہ پر اللہ رحمت فرمائے اگر وہ یہ منڈیل نہ بناتیں تو یہ چشمہ بہتا ہوا دریا بن جاتا آج بھی یہ کنواں اپنے ماء صافی سے اپنے تاریخی وجود سے وہاں پہنچنے والے اور پینے والے کو یہ درس دیتا ہوا نظر آتا ہے کہ لوگو تم اگر اللہ کے راستے میں جان بلب ہو کر ایڑیاں رگڑنے لگو تو وہ خداوند ذوالجلال جس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں وہ تمہارے پاؤں کے نیچے سے تمہارے لیے رزق کے سوتے رواں کر سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ تم سرفروشی، بندگی توکل اور ایثار کی وہ تاریخ دہراؤ جس کے نقوش قدم تمہیں یہاں جا بجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں اور تم اپنے وجود میں وہی حیثیت اختیار کر لو جو آج مجھے حاصل ہے کہ یہاں کوئی بھی آئے میں اپنے فیضان سے کسی کو محروم نہیں رکھتا۔ تمہارے ہاتھوں میں اللہ نے ہدایت کا چشمہ صافی دیا تھا اور تمہیں اس بات کا پابند کیا گیا تھا کہ دیکھنا اس دھرتی پر بسنے والا کوئی زندہ شخص تمہارے اس جام ہدایت سے محروم نہ رہنے پائے۔ تم بے شک پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑنے پر مجبور ہو جاؤ لیکن دنیا دین کی طلب میں تم سے کبھی مایوسی کا شکار نہ ہونے پائے۔ دنیا تمہیں خیر اور ہدایت کی علامت کے طور پر پہچانے اور وہ اس بات پر یقین کر لے کہ

دنیا میں اگر کہیں عافیت اور خیریت ہو سکتی ہے تو وہ صرف اس ہدایت کے سائے میں ہے جس کا امام تمہیں بنایا گیا ہے اور اگر اہل دنیا کی ضرورتیں کہیں سے پوری ہو سکتی ہیں تو وہ صرف وہی دارالامان ہے جس کا تمہیں پاسبان بنایا گیا ہے اور یہ اللہ کا گھر جس کا مرکز ہے۔

؎ دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

پھر یہ راہ عشق و محبت کا مسافر چند قدم اور آگے بڑھتا ہے تو سامنے صفا کی پہاڑی کے نشانات اسے دکھائی دیتے ہیں اور اسے یاد آتا ہے کہ یہی وہ پہاڑی ہے جس پر چڑھ کر حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے اپنے بچے کے لیے پانی کی تلاش کی تھی اور اس پہاڑی سے دوسری پہاڑی تک وہ کبھی چلتے ہوئے اور کبھی بھاگتے ہوئے پہنچی تھی اور اس طرح انہوں نے سات چکر لگائے تھے اور ساتویں چکر کے بعد ان کو دکھائی دیا کہ ان کے بچے کے پاؤں تلے سے چشمہ پھوٹ رہا ہے۔ اس مسافر کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم دونوں پہاڑیوں کے درمیان اس طرح سات چکر لگاؤ۔ جہاں وہ قدم قدم چلی تھیں تم بھی وہاں قدم قدم چلو اور جہاں وہ بھاگ کر چلی تھیں (وہاں نشانات لگے ہوئے ہیں) تم بھی بھاگتے ہوئے چلو۔ اس سے یہ سبق سیکھنے کی کوشش کرو کہ اللہ کی رضا کی طلب اور غلبۂ دین کے حصول کے لیے مرد اور عورت دونوں کو مکلف ٹھہرایا گیا ہے۔ دونوں ہی اس راستے میں جدوجہد کا ثبوت دیں گے اور سعی و کاوش سے کام لیں گے۔ تو یقیناً وہ چشمے ضرور پھوٹیں گے جس سے اللہ کی کھیتی ہری ہوگی۔ اگر ایک بے آب و گیاہ صحرا میں جہاں زندگی کے آثار کا دور دور تک نشان نہیں تھا اور بظاہر اسباب کا کوئی وجود نہ تھا وہاں اللہ کی عظیم بندی کی سعی کے نتیجے میں زندگی کو وجود مل سکتا ہے جو آگے چل کر مکہ کے نام سے شہر کی شکل اختیار کر سکتا اور دین اور خدا پرستی کا مرکز بن سکتا ہے اور اہلِ شہر کو زندہ رکھنے کے لیے پھل مہیا ہو سکتے ہیں اور تجارت رواں دواں ہو سکتی ہے اور اس کو ایسا امن دیا جا سکتا ہے ساری دنیا جس کو ترستی ہے لیکن یہ دور دراز علاقے میں بسنے

والا شہر دارالامن کہلاتا اور یہاں سے نکلنے والے تجارت کے قافلے صرف اس گھر کی نسبت کی وجہ سے سینکڑوں میل کے سفر میں محفوظ اور مصئون رہتے ہیں تو کیا آج امت مسلمہ اگر واقعی اپنے مقصد میں صحیح رویہ اختیار کرے اور اپنی ترجیحات کو درست کرلے' اعلائے کلمتہ الحق کو اپنا اولین مقصد قرار دے کر اسی طرح سعی و کاوش سے کام لے تو کیا آج امت مسلمہ کو وہ تمام عزتیں' وجاہتیں' سرافرازیاں' خوشحالیاں اور زندگی کی امکانات مہیا نہیں ہوسکتے۔ یقیناً ہوسکتے ہیں۔ یہ سرزمین پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ:

؎ آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

کعبتہ اللہ کے طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے آدمی دو حیرت انگیز چیزیں دیکھتا ہے جو اس کے دل میں دین کی صداقت اور اپنی حیثیت کا شعور بن کر روشنی دینے لگتی ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ میں صفا سے مروہ کی طرف بڑھ رہا ہوں یا میں مروہ سے صفا کی طرف لوٹ رہا ہوں تو میں اکیلا نہیں میرے ساتھ مختلف وطنوں کے لوگ' مختلف رنگ رکھنے والے' مختلف زبانیں بولنے والے' مختلف شناختیں رکھنے والے ایک ہی رفتار سے چل رہے ہیں۔ ہماری منزل ایک ہی ہے ہماری زبانوں پر ایک جیسی دعائیں ہیں۔ ہمارے دلوں میں ایک جیسی خشیتِ الٰہی ہے۔ ہماری امنگیں یکساں ہیں۔ ہماری منزل اور ہمارے اہداف ایک ہیں۔ یہاں کوئی وحدت دوسری وحدت سے ٹکراتی نظر نہیں آتی۔ یہاں کوئی شناخت دوسری شناخت سے دست و گریبان نہیں ہوتی۔ یہاں ہر کوئی دوسرے کو محبت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ ہر آدمی دوسرے کے غم میں گراں بار دکھائی دیتا ہے۔ اگر یہی رنگ پوری زندگی میں اتر جائے۔ ہم اسی طرح جسد ملت کے اعضاء و جوراح بن جائیں ہم ایک دوسرے کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھیں اور ایک دوسرے کے غم اور کرب میں تڑپنا سیکھ لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ جسد ملت کی وہ توانائی اور وہ تابانی دوبارہ پھر ہمیں اپنی آغوش میں نہ لے لے اور دوسری طرف وہ محسوس کرتا ہے کہ میں اپنے اعمال میں ہزار

بدنصیب سہی' یقین و ایمان میں میں ہزار کمزوریوں کا حامل سہی میری زندگی میں پاکیزگی کا وہ نور بہت کم سہی جو ایک مومن کی زندگی میں ہونا چاہیے لیکن آج جن لوگوں کی رفاقت میں میں مناسک حج ادا کر رہا ہوں۔ جن کے ساتھ میں سعی میں شریک ہوں' جن کے سائے میں میں نے طواف کے مزے لوٹے ہیں۔ جن کے ساتھ آنسو بہاتے ہوئے میں ملتزم کے ساتھ لپٹا ہوں میزاب رحمت کے سائے میں کھڑے ہو کر میں نے جن کے ساتھ رحمتوں کی امیدیں باندھی ہیں ان میں یقیناً بڑے بڑے اولیاء بھی ہوں گے۔ ان میں بڑی تعداد علماء حق کی بھی ہوگی۔ ان میں ایک سے ایک بڑھ کر جادۂ ایثار و محبت کے شناور بھی ہوں گے۔ کیا ان کی نیکیوں کے بدلے میں جب اللہ کی طرف سے قبولیت دعا کے فیصلے ہوں گے تو کیا میں اس میں شریک نہ کیا جاؤں گا۔ کیا ان کی روحانیت اور دعائے نیم شبی مجھ پر کوئی بھی اثر نہ ڈالے گی۔ کیا میں ایسا ہی بدنصیب ہوں کہ ان خوش نصیبوں کے جلو میں بھی بدنصیبی کے گرداب سے نہ نکل سکوں گا۔ یقیناً آج ہماری قسمت بدلنے کا وقت آگیا ہے۔ میں اللہ سے بڑی آرزوئیں باندھ کر آیا ہوں۔ یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگتے ہیں اور اللہ کے گھر کی طرف نگاہ اٹھاتے ہوئے وہ بے ساختہ پکار اٹھتا ہے:

ے مزے لوٹو کلیم اب بن پڑی ہے
بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہے

حج کا یہ مسافر اب سر کے بال کٹوانے یا منڈوانے کے بعد اب عمرے سے فارغ ہو جائے گا اور اگر 8 ذی الحج میں کچھ دن باقی ہیں تو اب یہ اس کے ایک طرح کے فراغت کے یا حج کے انتظار کرنے کے دن ہیں۔ کوئی اور مسافر ہوتا تو اس کے یہ فراغت کے دن یقیناً شہر میں گھومنے' اطراف شہر کو دیکھنے' اہل شہر سے ملنے یا بعض خوبصورت مناظر سے محظوظ ہونے کے دن ہوتے۔ مگر یہ مسافر عشق و جانسپاری اور اطاعت و فدائیت کے راستے کا مسافر ہے۔ اسے ان چیزوں سے کوئی غرض نہیں۔ اس کو جتنا وقت بھی ملے اس کے ذہن پر ایک ہی دھن سوار ہے کہ اللہ کے جس گھر کے لیے میں سینکڑوں یا ہزاروں میل دور

بیٹھ کر آرزوؤں میں دن کاٹتا رہا ہوں اب وہ اللہ کا گھر میری نظروں کے سامنے ہے۔ بظاہر سیدھا سادھا چکور شکل کا سیاہ قبا پہنے ہوئے کھڑا ہے لیکن نہ جانے اس میں کیسی دلکشی اور محبوبیت ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اس کے سامنے بیٹھ کر اس کو دیکھتا رہوں۔ طبیعت اس سے سیر ہونے میں نہیں آتی۔ آنکھوں کو اس سے سیری نہیں ملتی۔ اس کو دیکھتے رہنا دل کا سرور، آنکھوں کا نور، روح کی غذا اور نظر کی عبادت معلوم ہوتا ہے۔ دل کی کلفت اس سے کافور ہوتی ہے اور دماغ کی تکان اس سے دور ہوتی ہے۔ یہ قدرت کی کیسی بیش بہا نعمت ہے کہ ساری دنیا کی دلکشی اور دل آویزی اس میں سمٹ کر آگئی ہے۔ لوگ ہیں کہ پروانہ وار اس پر لپکتے ہیں جو یہاں پہنچتا ہے وہ دیوانوں کی طرح اس کے گرد چکر لگانے لگتا ہے۔ گویا ایک پروانہ ہے جو اس شمع پر قربان ہو جانا چاہتا ہے۔ یا کوئی غلام ہے جو اس گھر کے پھیرے لے کر اپنی غلامی کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔ یہ مسافر دیکھتا ہے کہ کوئی اس گھر کے پردوں میں لپٹ کر ہچکیاں لے رہا ہے کوئی ہاتھ اٹھا کر ”یا ربَّ البیت‘ یا ربَّ البیت‘ کہتے ہوئے کس دلسوزی اور بے چارگی سے اس گھر کے مالک کو پکار رہا ہے۔ ہر کوئی اس گھر پر قربان ہو جانا چاہتا ہے۔ لیکن دل میں بندگی اور غلامی اس گھر کی نہیں بلکہ اس گھر والے کی ہے۔ آنسو ہیں کہ اس کے سامنے بہنے کے لیے بے قرار ہیں اور دل ہے کہ وہ اللہ کی بندگی اور تجدید عہد کے لیے بے قرار ہے۔ چنانچہ یہ مسافر انہی احساسات میں ڈوبا ہوا طلوع فجر سے پہلے اس گھر میں آبیٹھتا ہے اور جیسے ہی موقع ملتا ہے طواف کرنے لگتا ہے۔ تھک جاتا ہے تو محبت سے اس کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ پھر دماغ کی تازگی اور دل کی آبیاری کے لیے اللہ کی کتاب لے کر پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ انہی احساسات اور اعمال میں اس کے شب و روز گزرتے ہیں۔ حتی کہ 8 ذی الحج کی تاریخ آجاتی ہے۔ اب وہ دوسرے حجاج کے ساتھ منیٰ کی طرف جانے کے لیے تیار ہے۔ منیٰ میں ظہر، عصر، مغرب اور عشاء اور 9 ذی الحج کی فجر کی نماز ادا کرتا ہے۔ اس مسافر کی کوشش ہے کہ منیٰ کے اندر مسجد خیف میں جا کر یہ ساری نمازیں ادا کرے۔ اور آنے والے مناسک حج کے لیے

پوری طرح کمر بستہ ہو جائے۔ مسجد خیف میں ایک قبہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں رسول اللہ ﷺ کا خیمہ لگایا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہزاروں انبیاء کرام نے یہاں نمازیں ادا کی ہیں۔ نہایت خیر و برکت کی جگہ ہے اس کے گرد و بیش میں نماز پڑھنا یقیناً موجب خیر و برکت ہے۔ 9 ذی الحج کو یہ مسافر عرفہ کے لیے تیار ہوتا اور دوپہر تک وہاں پہنچ جاتا ہے یہ عرفات کا میدان ایک وسیع و عریض میدان ہے جس کی وسعت کو دیکھ کر میدان حشر یاد آجاتا ہے۔ یہاں کا وقوف حج کی اصل عبادت ہے۔ یہاں ظہر اور عصر امام کے پیچھے اکٹھے پڑھی جاتی ہیں۔ پھر ظہر کے بعد جب دن کی گرمی ذرا مدہم پڑتی ہے تو یہاں ہر پہنچنے والا اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر مناجاتیں کرتا اور دعائیں مانگتا ہے۔ یہ عرفات کا میدان اصل میں معرفت ذات، معرفت امت اور معرفت حق کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ آدمی اپنے خیمے سے نکل کر جبل رحمت کی طرف بڑھتا ہے۔ اس مختصر سفر میں وہ امت کے نہ جانے کتنے ملکوں کے لوگوں کو اور کتنی شناختیں رکھنے والوں کو دیکھتے ہوئے گذرتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اللہ نے جتنے رنگوں کی حامل جتنی زبانوں کی بولنے والی، جتنی ثقافتیں رکھنے والی، جتنی شناختیں رکھنے والی، جتنی رسم و رواج اور احساسات میں تنوع رکھنے والی مخلوق پیدا کی ہے ان میں سے ہر ایک کی ایک قابل ذکر تعداد کو اپنے دین کی سمجھ عطا فرمائی ہے اور وہ آج اپنے اللہ کے حضور میں حاضر ہیں۔ اس طرح گویا یہ مسافر اپنی جسد امت کے اعضاء و جوارح کو زندگی میں پہلی دفعہ ایک جگہ دیکھ کر ایک خاص قسم کے احساس کو محسوس کر رہا ہے۔ پھر وہ دیکھتا ہے کہ ان میں امیر بھی ہیں غریب بھی ہیں چھوٹے بھی ہیں بڑے بھی ہیں۔ حاکم بھی ہیں، محکوم بھی ہیں، عالم بھی ہیں جاہل بھی ہیں، عاقل بھی ہیں کم عقل بھی ہیں لیکن کوئی ایسا نہیں جو اللہ کے سامنے آنسو بہا کر اپنے گناہوں کا اقرار نہ کر رہا ہو اور اپنے گناہوں کی مغفرت کی طلب میں بے قرار نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ اپنی اصل حیثیت کو پہچانے وہ اپنے اعمال پر توجہ کرے حسن و قبح کی معرفت حاصل کرے حق و باطل کو پہچانے۔ اپنی بندگی کا اقرار ہی معرفت ذات

کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ پھر وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ آج کوئی اور آستانہ نہیں ہے سوائے اللہ کے آستانے کے۔ آج کوئی تخت نہیں سوائے اللہ کے تخت اقتدار کے۔ آج کوئی جائے اماں نہیں سوائے اللہ کی امان کے۔ آج کسی میں طاقت و قدرت نہیں سوائے اللہ کی طاقت و قدرت کے۔ اگر یہی ایک حقیقت ہے اور یقیناً یہی حقیقت ہے تو ہم نے ہزاروں آستانے، ہزاروں تخت اقتدار، ہزاروں پناہ گاہیں کیوں بنا رکھی ہیں۔ ہم نے اللہ کی عظمت کو آج تک پہنچانے میں کوتاہی کیوں کی ہے۔ یہ عرفات کا میدان ہمیں اس حقیقی معرفت سے آشنا کرتا ہے اور وہ ہمیں اسی ایک عرش الٰہی کے سائے میں جمع ہونے، اسی کے آستانے پر جھکنے، اسی سے امید و آرزو باندھنے حتیٰ کہ اس کے عشق میں ڈوب جانے کا درس دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ پھر جبل رحمت کے سائے میں کھڑے ہو کر وہ مسافر محسوس کرتا ہے کہ کبھی اسی پہاڑی کے سائے میں سرور کائنات ﷺ نے اپنی ناقہ پر کھڑے ہو کر ایک خطبہ ارشاد فرمایا تھا جس میں انسانوں کی بھلائی، عافیت، اور خیریت کے وہ تمام اصول بیان فرما دیئے تھے جس سے انسان کی بگڑی ہوئی دنیا بھی سنور سکتی ہے اور آخرت میں سرخروئی بھی نصیب ہو سکتی ہے اور حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا جس کا مفہوم یہ ہے لوگو دنیا نے ہزاروں ٹھوکریں کھائی ہیں اور ہزاروں غلط فیصلے کئے ہیں لیکن آج دنیا پھر پلٹ کر اس صراط مستقیم پر آ گئی ہے کہ جس پر چلنے والا ایک روشنی میں سفر کرے گا اور اس کے لیے کوئی راستہ بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا نہیں ہو گا۔ مسافر اس جبل رحمت کے سائے میں اللہ کے سامنے تجدید عہد کرتا ہے کہ یا اللہ مجھے توفیق دے کہ میں یہاں سے واپس پلٹ کر اسی جادۂ مستقیم کا ایک ادنیٰ مسافر بنوں اور اس راستے پر چلتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے قابل ہو سکوں۔ 9 ذی الحج کو غروب آفتاب کے ساتھ ہی یہ مسافر میدان عرفات سے نکلتا ہے رات مزدلفہ میں گزار کر دس ذی الحج کی صبح کو دن چڑھے وہ پھر منیٰ میں پہنچتا ہے۔ اب اسے سب سے پہلے یہ کام کرنا ہے کہ وہ جمرات پر رمی کرے یعنی شیطانوں کو کنکر مارے اور یہ اصلا” وہ جگہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام زندگی کے

سب سے بڑے امتحان کی طرف بڑھ رہے تھے یعنی اپنے بیٹے کو قربان کرنے کے لیے جا رہے تھے تو ان تین جگہوں میں شیطان نے انہیں روکنا چاہا تھا۔ آپ نے کنکر اٹھا کر اس کی طرف پھینکے تھے۔ اور یہ اعلان کیا تھا کہ بدبخت تو میرے راستے سے ہٹ جا میں ہر وہ کام کر گزرنے کا عہد کر چکا ہوں جس سے مجھے میرے اللہ کی رضا نصیب ہوتی ہو۔ میں زندگی میں تمام قربانیاں پیش کر چکا ہوں ایک بیٹے کا دم باقی ہے اللہ نے آج مجھ سے اس کی بھی قربانی مانگی ہے تو میں اس کی رضا کی طلب میں یہ کر گزرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ یہ شیطان کو کنکر مارنا دراصل اس بات کی تعلیم ہے کہ لوگو تمہاری زندگی کا ہر عمل اللہ کی رضا کے حصول کے لیے ہونا چاہیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح تمہیں اس راستے میں کوئی سی بھی قربانی دینا پڑے تو کبھی دریغ نہ کرنا حتی کہ اکلوتے بیٹے کو بھی قربان کرنا پڑے تو ایسا بھی کر گزرنا۔ کیونکہ یہ راستہ تکمیل عبودیت کا راستہ ہے۔ تم اللہ کے غلام ہو اور یہ غلامی آخری حد تک ہر چیز کو قربان کر دینے سے مکمل ہوتی ہے۔ ہم اسی کی علامت کے طور پر کوئی نہ کوئی جانور اللہ کے راستے میں ذبح کرتے ہیں اور اصلاً اس بات کا اقرار اور اعلان ہوتا ہے کہ جس طرح میں جانور ذبح کر رہا ہوں اگر اس کے لیے مجھے اپنی گردن بھی پیش کرنا پڑی تو میں اس سے بھی دریغ نہیں کروں گا اور پھر یہ مسافر اس میں یہ بھی دیکھتا ہے کہ یہ تین دن مسلسل کس بات کی مشق کرائی جاتی ہے کہ ہمیں منیٰ میں بلایا گیا۔ ابھی ہم ستانے بھی نہیں پائے کہ عرفات جانے کا حکم دے دیا گیا۔ منیٰ سے سامان اٹھائے عرفات کو چل دیئے اور عرفات میں دن بھر اللہ کے سامنے مناجاتوں میں گذرا تو سر شام ہی مزدلفہ جانے کا حکم دے دیا گیا تو پھر مزدلفہ میں مغرب اور عشاء اکٹھے پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ جس طرح عرفات میں ظہر اور عصر کو ایک ساتھ پڑھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ مزدلفہ میں رات کو کمر بھی سیدھی نہ ہونے پائی کہ منیٰ پہنچنے کا حکم دے دیا گیا۔ یہاں بھی شیطانوں کو کنکر مارنے کا حکم ہے۔ پھر فوراً قربانی دینے کا اور اس کے بعد طواف زیارت کے لیے نکلنا ہو گا۔ یہ اس قدر جو مشقت طلب ڈیوٹی ہے اس میں صرف اس بات کی مشق

کرانا مقصود ہے کہ جس طرح تم حج کے ذریعے تکمیل عبودیت کرتے ہوئے سب کچھ اس کے راستے میں قربان کرنے کا عہد کرو گے اسی طرح تمہیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ زندگی میں تمہارا کوئی ٹھکانہ بھی مستقل ٹھکانہ نہیں۔ تمہارا کوئی قیام بھی مستقل قیام نہیں۔ تمہاری زندگی اصل میں مسلسل حرکت و سفر کا نام ہے۔ تمہیں کہیں بھی کمر کھول کر بیٹھ جانے کی اجازت نہیں۔ تم ہر وقت اللہ کی اطاعت کی گرفت میں ہو۔ زندگی کا کوئی کام اس کی اطاعت سے ہٹنے نہ پائے۔ اور زندگی میں غلبہ دین اور اعلائے کلمتہ الحق سے دستبردار ہو کر خدمت خلق سے بے نیاز ہو کر آرام و راحت کی زندگی کی طلب میں کبھی منہمک ہونے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ راستہ اسلام کا نہیں بلکہ جاہلیت کا راستہ ہے۔

رمی جمرات کرنے کے بعد اب یہ مسافر سر کے بال کٹوا کر یا منڈوا کر احرام سے آزاد ہو جائے گا اس کے بعد اس مسافر کو قربانی کرنا ہے پھر طواف زیارت کے لیے مکہ معظمہ جانا ہے۔ واپس آکر 12 یا 13 تاریخ تک منیٰ میں ٹھہرنا ہے۔ پھر مکہ معظمہ آکر ایک آخری طواف کرنا ہے۔ جس کو طواف وداع کہتے ہیں۔ یہ طواف اس بات کی علامت ہے کہ حج کی مصروفیات ختم ہو گئیں۔ اب اگر یہ مسافر مدینہ طیبہ نہیں گیا تو اسے مدینہ طیبہ کا سفر کرنا ہے ورنہ عازم وطن ہونا ہے۔ اس طواف وداع میں یہ مسافر بار بار یہ سوچے گا کہ یا اللہ کتنی بڑی سعادت تھی جو محض تیرے فضل و کرم سے مجھے نصیب ہوئی۔ ورنہ میں کہاں اور تیرا یہ عظیم گھر کہاں۔ محض تیرے فضل سے یہاں حاضری دے پایا ہوں۔ اب تجھ ہی سے التجا کرتا ہوں کہ الٰہی جن عظیم مقاصد کے تحت تو نے یہ حج کی عبادت مسلمانوں کے لیے لازم ٹھہرائی ہے ان کا بیش از بیش حصہ میرے قلب و نظر میں اتار دے۔ میں جب واپس جاؤں تو میرے دونوں ہاتھ ان سعادتوں سے بھرپور ہوں۔ میری آنکھیں یہاں کے نور سے روشن ہوں۔ میرے قدموں میں وہ توانائیاں دوڑتی رہیں جس کو میں نے مسعیٰ میں حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اس پیغام کو پہنچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کروں جس پیغام کا نزول غار حرا کی تنہائیوں میں ہوا تھا اور جو انسانیت کے لیے

سخہ کیمیا بن کر آیا تھا۔ جس نے سینوں کو ہر طرح کی آلودگیوں سے شفا بخشی تھی۔ جو انسانیت کے لیے ابر رحمت بن کر دکھی انسانیت کے سروں پر چھا گیا تھا۔ میں اس پیغام کا علمبردار بن کر اور اس کا عملی پیکر بن کر اپنے وطن واپس جاؤں تو مجھے دیکھنے والا میرے عمل میں ایک واضح تبدیلی محسوس کرے۔ یا اللہ تیرا یہ گھر ایک مومن کے عشق کی معراج ہے میں تیرے فضل سے یہ امید رکھتا ہوں کہ میں اس عشق میں ہمیشہ سرشار رہوں گا اور اس محبت اور خلوص کے راستے میں ہر ممکن قربانی سے دریغ نہیں کروں گا۔ میں نے یہاں آکر کمال اطاعت، کمال بندگی، مکمل فرمانبرداری کا جو سبق سیکھا ہے یا اللہ میں جب واپس لوٹوں تو میری زندگی کو اس کی تصویر بنا دے کہ لوگ مجھے دیکھ کر ان احساسات کا اثر قبول کئے بغیر نہ رہیں۔

ے دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

# زیارت مدینہ علی صاحبھا الصلوۃ و السلام

معزز خواتین و حضرات!

اب یہ مسافر مکہ معظمہ سے کوچ کرتا ہے تو اس کا دل مکہ معظمہ کی جدائی اور فراق میں مغموم ہے۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ وہ بار بار سوچتا ہے کہ نہ جانے یہ سعادت کی گھڑیاں پھر نصیب ہوں گی یا نہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس کا دل مسرت و شادمانی کی لہریں بھی محسوس کرنے لگتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں اس شہر کی طرف جا رہا ہوں جسے محبوب رب العالمین اور محسن انسانیت کا شہر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ کبھی یہ یثرب یعنی بیماریوں کا گھر کہلاتا تھا۔ اس رحمتہ للعالمین کے وہاں تشریف لے جانے سے وہ مدینتہ الرسول کہلایا اور آج بھی اسے اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول برحق ﷺ کی دعا سے حرم کا مقام و مرتبہ عطا کیا۔ آج جس کی ہواؤں میں، فضاؤں میں، موسموں میں، گلی کوچوں میں، پہاڑوں اور صحراؤں میں، کھانے پینے کی اشیاء میں حتی کہ ناپ تول کے پیمانوں میں بھی اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی ہے۔

جیسے جیسے اس کا موٹر مدینہ طیبہ کی طرف رواں دواں ہے ویسے ویسے اس کا دل اس مسرت و شادمانی سے اور اس بہجت و افتخار سے بلیوں اچھل رہا ہے۔ میں ناچیز اور نامراد اور بے کس و بے نوا ہوتے ہوئے اس عظیم شہر میں اور اس مقدس سرکار میں حاضری کے لیے جا رہا ہوں جہاں بڑے سے بڑا آدمی بھی دم بخود ہو کر حاضر ہوتا ہے۔ راستے میں کبھی اس کے لبوں پر درود آتا ہے، کبھی سلام آتا ہے، کبھی وہ نعت کے اشعار پڑھنے لگتا ہے کبھی وہ دعاؤں میں ڈوب جاتا ہے۔ آج اسے غیر معمولی طور پر ہوا میں خنکی، پانی میں شیرینی اور

ٹھنڈک اور دل کی گرمی بڑھتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ وہ اپنے تصور میں یہ سوچ کر مسرت و شادمانی میں ڈوب ڈوب جاتا ہے۔

؎ عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ برفتراک صاحب دولتے بستم سرِخود را
وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

کبھی وہ سوچتا ہے:

؎ خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آں جا دلبر است

سوچتے سوچتے اس کا موٹر ذوالحلیفہ میں پہنچ جاتا ہے۔ یہاں سے مدینہ طیبہ کا فاصلہ 6'5 میل سے زیادہ نہیں۔ وہ یہاں اتر کر غسل کرتا ہے' یا وضو کرتا ہے۔ جو اچھا لباس میسر ہو پہنتا ہے' خوشبو لگاتا ہے۔ ذوق و شوق کی بے تابی کے ساتھ درود و سلام پڑھتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ چند منٹ کے بعد مدینہ طیبہ کی آبادی آجاتی ہے اور ہر مومن کی آنکھ کا نور اور دل کا سرور گنبد خضریٰ سبز نگینہ کی طرح آبادی کے وسط میں اس خوش نصیب کو دکھائی دیتا ہے اب وہ پوری محبت و رقت کے ساتھ درود و سلام پڑھتا ہے اور اللہ سے دعا کرتا ہے یا اللہ تیرے حبیب کا محبوب شہر میرے سامنے ہے میں اس قابل کہاں کہ اس شہر کا حق ادا کر سکوں۔ یا اللہ تو میرے دل و دماغ کو یہ توفیق عطا فرما کہ میں اس کے آداب بجا لاسکوں۔ اور یہاں سے اپنا دامن بھر کے واپس جاؤں۔ اب اسے سب سے پہلی فکر مسجد نبوی میں داخلے کی ہے۔ وہ نہایت ادب کے ساتھ دعائیں پڑھتا ہوا مسجد میں داخل ہوتا ہے اور وہ سب سے پہلے اس جگہ پہنچتا ہے جسے خود رسول اللہ ﷺ نے جنت کے باغوں میں سے ایک باغ فرمایا ہے وہاں وہ دو رکعت تحیتہ المسجد پڑھ کر سرکار دو عالم ﷺ کے حضور حاضری کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ دل میں محبت کا ایک طوفان موجزن ہے۔ لیکن قدم جلال نبوت سے بار بار لڑکھڑاتے ہیں۔ وہ یہ سوچ کر پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ہے کہ یہ وہ جگہ

ہے کہ جس کے بارے میں کسی کہنے والے نے کہا تھا:

؎ ادب گا ہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

پھر وہ نہایت ادب کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں سلام عرض کرتا ہے۔

"السَّلامَ عَلَیک ایھا النَّبیَ و رحمُۃ اللّٰہ و برکاتُہِ یا رسولَ اللّٰہ انی اشھَدان لاَ الہ الا اللّٰہَ وحدہ لا شریکَ لہ و انک عبدَہِ و رسولُہ و اَشھدَ اَنک قد بلَّغتَ الرّسَالۃ وَ اَدیّتَ الاَمانۃَ و نصَحتَ الاُمَّۃ و کشفتَ الغُمۃ و جَاھدتَ فی اللّٰہ حَقَّ جھادِہ فجزاک اللّٰہ عن ھذہِ الامۃ خیرَ ماجزی نبیا" عنَ امتہ و رسولا" عن خلّقہ"

ترجمہ: "اے اللہ کے پیغمبر آپ پر سلام اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں، یا رسول اللہ میں آپ کے سامنے گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے (کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں ہے) اور اس کا کوئی شریک ساجھی بھی نہیں ہے اور بلا شبہ آپ اس کے بندے اور رسول ہیں اور میں اس کی بھی شہادت دیتا ہوں (اور انشاء اللہ قیامت میں اللہ کے سامنے بھی یہی شہادت دوں گا) کہ آپ نے اس کا پیغام پہنچایا اور امانت کا حق ادا کر دیا اور امت کی خیر خواہی میں کوئی کسر نہ رکھی اور گمراہی اور تاریکی کو بالکل دور کر دیا اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کا حق پوری طرح ادا کر دیا۔ پس آپ کو آپ کا مولا اس پوری امت کی طرف سے وہ بہترین جزا دے جو کسی نبی کو اس کی امت کی طرف سے اور کسی رسول کو اپنی مخلوق کی طرف سے اللہ نے دی

ہو یا دینے والا ہو۔"

پھر وہ آنحضرت ﷺ سے شفاعت کی درخواست کرتا ہے۔ اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے اللہ سے معافی چاہتا ہے اور آنحضرت ﷺ سے بھی درخواست کرتا ہے کہ آپ میرے لیے استغفار فرمائیں اور اگر حضور ﷺ نے مجھ پر کرم نہ فرمایا تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔ حضور اقدس ﷺ کے حضور میں سلام اور اپنی معروضات عرض کرنے کے بعد داہنی جانب تھوڑا سا ہٹ کر آپ کے یارِ غار اور آپ کے سب سے بڑے جاں نثار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے۔

"السلام علیک یا خلیفۃَ رسولِ اللّٰہ' السلامُ علیٰ
یا وزیرَ رسولِ اللّٰہِ' السلامُ علیک یا صاحبَ رسول
اللّٰہ فی الغار ورحمتہ اللّٰہ وبرکاتہ"

پھر قریباً ایک اور ہاتھ داہنی جانب ہٹ کر سیدنا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے روبرو حاضر ہو کر سلام عرض کرتا ہے۔

"السلام علیک یا امیرَ المومنین السلامُ علیک یا
عزّ الاسلام والمسلمین ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ"

اب اس کا روز کا معمول ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اس مسجد شریف میں رہتا ہے اور جب بھی اسے موقع ملتا ہے وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ پر اور آپ کے دونوں ساتھیوں پر سلام پیش کرتا ہے اور سرکار دو عالم ﷺ سے شفاعت کی درخواست کرتا ہے لیکن وہ جب بھی حاضر ہوتا ہے ایک احساس ہے جو اسے کسی پل چین نہیں لینے دیتا۔ وہ سوچتا ہے کہ حضور ﷺ وہ محبوب شخصیت ہیں کہ ساری کائنات مل کر بھی ان کے پاؤں کی دھول کی برابری نہیں کرسکتی۔ ان کے جسم مبارک سے لگے ہوئے ذرے عرش معلیٰ سے افضل ہیں۔ وہ سید المرسلین اور خاتم النبیین ہیں۔ وہ اولاد آدم کے سردار ہیں قیامت کے دن حمد کا جھنڈا ان کے ہاتھ میں ہوگا۔ وہ حساب کے آغاز کے لیے ساری امتوں کی سفارش فرمائیں گے۔ اللہ کے بعد انہی کا مقام و مرتبہ ہے

اور کوئی مخلوق ان کی ہمسری کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اس کے باوجود ایک پیغام کی بالادستی کے لیے جسے وہ اللہ کی جانب سے غار حرا سے لے کر نکلے تھے انہوں نے اس قدر محنت فرمائی اور اتنی قربانیاں دیں کہ اسی پیغام کی بالادستی اور نشرو اشاعت کے سلسلہ میں انہیں زندگی کا ہر دکھ اٹھانا پڑا۔ طائف میں پتھروں کی بارش ان پر برسی۔ گلہ گھونٹ کر کتنی دفعہ ان کی جان لینے کی کوشش کی گئی۔ ان کے قتل کے منصوبے بنائے گئے حتی کہ انہیں اپنا وہ وطن چھوڑنا پڑا جو انہیں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پیارا تھا۔ جس میں خود اللہ کا گھر موجود تھا۔ پھر وہ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو کتنی دفعہ اسی مقصد عظیم کی خاطر ان کی جان لینے کی سازشیں کی گئیں۔ بار بار انہیں میدان جنگ میں جانے پر مجبور کیا گیا۔ وہ جو دنیا میں رحمت حق بن کر آیا تھا وہ تلواروں کے سائے میں اللہ کے اس پیغام کی حفاظت کرتا رہا اور اس کا حق ادا کرتا رہا۔ اس کے کتنے عزیز اس راستے میں اپنی جان ہار گئے مسلسل دس سال تک بے پناہ صعوبتیں اٹھا کر اللہ کے اس دین کو اس نے جزیرۂ عرب میں بالا بلند کرنے کا سامان کیا۔ زندگی کے ہر گوشے میں اسے جاری و ساری فرمایا۔ اور دنیا میں اس کے غلبے کے لیے ایک ایسی جماعت اپنے پیچھے چھوڑی کہ پوری دنیا جن کا جواب لانے سے اور جن کے مقابلے سے عاجز رہی۔ وہ دنیا میں علم، عمل اور اخلاق کے تابندہ ستارے بن کر اٹھے اور رحمت کی گھٹا بن کر چھا گئے۔ آج جو کچھ ہمیں حقوق و فرائض یا علم و اخلاق کے حوالے سے دنیا میں نظر آتا ہے یہ سب انہیں کی محنتوں اور انہیں کی ریاضتوں کا نتیجہ ہے۔ بقول حالی:

؎ بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہی کی لگائی ہوئی ہے

اور بقول اقبال:

؎ طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ راز اس نے پایا انہی کے جگر میں

وہ دنیا سے یہ گواہی دلا کر اپنے اللہ کے پاس واپس چلے گئے کہ میں

نے اللہ کا پیغام تم تک پہنچا دیا۔ امانت کا حق ادا کر دیا۔ خیر خواہی اور ہمدردی میں کوئی کسر نہ رہنے دی اور تم سے ظلم اور جہالت اور بے دینی کی تمام تاریکیوں کو دور کر کے روشنی اور نور تمہارے راستے کا مقدر بنا دیا۔ یہ مسافر کھڑا سوچتا ہے کہ کتنے احسانات ہیں نوع انسانی پر اس محسن انسانیت کے۔ کیا اس کا صرف یہ صلہ ہے کہ اس کے ماننے والے یہاں حاضری دے کر اور درود و سلام پڑھ کر اپنے تئیں یہ سمجھیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو گئے۔ جس نے اس پیغام کی بالادستی اور اس دین کے غلبہ کے لیے ایک دن اور رات بھی آرام کا نہیں گزارا کیا اس کی امت کی صرف یہ ذمہ داری ہے کہ وہ درود و سلام پر گزارا کرے۔ ہم جب رسول اللہ ﷺ کے روضہ اقدس پر حاضری دیتے ہیں تو حضور ﷺ یقیناً یہ سوچتے ہوں گے کہ تم اگر مجھ سے محبت کرتے ہو تو تمہیں ان مقاصد زندگی سے اور اس پیغام محبت اور اس امانت خداوندی سے بھی ویسا ہی تعلق اور محبت ہونی چاہیے جس طرح مجھے تھی اور ویسی ہی تمہیں اس راستے میں صعوبتیں اٹھانی چاہئیں جیسی صعوبتیں میں نے اٹھا کر تمہارے گھروں کے آنگن میں یہ نور پھیلایا ہے۔ اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو پھر سوچو کل کو مجھے کیا منہ دکھاؤ گے۔ یہ سوچ سوچ کر اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے اور وہ دل میں یہ پیمان باندھتا ہے اور حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ وعدہ کرتا ہے کہ حضور آپ میرے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ مجھے اس بات کی توفیق عطا فرمائے کہ جو ذمہ داری آپ نے ادا فرمائی تھی اور پھر وہ ذمہ داری امت کے حوالے کر کے آپ دنیا سے تشریف لے گئے تھے میں اپنے مقدور کی حد تک اسے ادا کرنے کی کوشش کروں پھر وہ مسجد نبوی سے باہر نکلتا ہے تو چند قدم کے فاصلے پر اسے جنت البقیع دکھائی دیتا ہے تو وہ یہ سوچ سوچ کر حیران ہو جاتا ہے کہ یہ جنت البقیع یہ قبرستان مدینہ طیبہ کی سرزمین اور حضور ﷺ کے پڑوس میں ہونے کی وجہ سے اس کا ایک ایک ذرہ کس قدر مقام و مرتبہ کا حامل ہے بایں ہمہ ہمیں تاریخ بتاتی ہے کہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کرام کو حضور اپنے پیچھے وہ ذمہ داریاں تفویض کر کے تشریف لے گئے جس کو حضور ﷺ نے زندگی

بھر ادا کیا تھا اور آپ یہ حکم دے گئے کہ جزیرۂ عرب کی حد تک میں اس کام کو مکمل کر کے جا رہا ہوں تو اب باقی پوری دنیا میں نور توحید کے اہتمام کا کام تمہیں کرنا ہے چنانچہ اسی لیے یہ لوگ پھر وہاں تک پہنچے جہاں جہاں دھرتی پانی دیتی ہے اور جہاں آدم کی اولاد بستی ہے۔ چنانچہ جنت البقیع اپنی ساری فضیلتوں اور برکتوں کے باوجود اپنی آغوش میں کہا جاتا ہے کہ دس ہزار صحابہ سے زیادہ نہیں رکھتا باقی صحابہ کی اتنی بہت بڑی تعداد کہاں مدفون ہے؟ سوائے چند جانثاروں کے تاریخ اس بارے میں ہمیں کچھ نہیں بتاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کٹھن ذمہ داری کو ادا کرتے ہوئے ساری دنیا میں پھیل گئے اور اسی مقصد کی بجا آوری میں نہ جانے کہاں اجل کو لبیک کہا۔ وہ خود اس راستے میں بے نام ہو گئے لیکن اللہ کے دین کو پوری دنیا تک پہنچا کر بلکہ دنیا کے ایک بڑے حصے پر غالب کر کے اللہ کے یہاں سرخرو ہو گئے۔ اس کے باوجود کہ صحابہ کی بڑی تعداد دنیا کے مختلف حصوں میں مدفون ہے پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں جنت البقیع کا چپہ چپہ آج بھی اپنے پہلو میں ایمان و جہاد اور عشق و محبت کی ایک بہت بڑی تاریخ رکھتا ہے اس کے ایک ایک ڈھیر میں اسلام کا خزانہ دفن ہے کسی نے ٹھیک کہا ہے:

؎ بقیع کے گلستاں میں کون جانے کہاں اور کتنے گلدستے سجے ہیں
انہیں سے آج بھی رنگ بہاراں، انہیں کے دم سے پھولوں میں ادائیں

آج بھی اگر وہاں کوئی بتانے والا ہو تو یہاں عم رسول سیدنا عباس بن عبدالمطلب سیدۂ اہل الجنتہ فاطمہ بنت الرسولؐ سیدنا حسن بن علی، سیدنا علی بن الحسین، زین العابدین سیدنا محمد الباقر، سیدنا جعفر الصادق آرام فرما ہیں۔ وہاں سے چلئے تو حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت خدیجہ و میمونہ کے علاوہ تمام ازواج مطہرات پھر بنات طاہرات کے مقابر ملیں گے۔ پھر دار عقیل بن ابی طالب جہاں ابوسفیان بن الحارث بن عبدالمطلب و عبداللہ بن جعفر وغیرہ مدفون ہیں۔ پھر آپ کو ایک ٹکڑا ملے گا جس میں امام دارالہجرۃ سیدنا

مالک بن انس صاحب المذہب اور ان کے استاد نافع آرام فرما ہیں وہاں سے بڑھئے تو ایک بقعہ انوار ملے گا۔ یہ ایک مہاجر کا پہلا مدفن ہے یہاں وہ عثمان بن مظعون دفن ہیں جن کی پیشانی کو حضور ﷺ نے بوسہ دیا تھا یہیں فرزند رسول سیدنا ابراہیم بن رسول اللہ ﷺ کی خواب گاہ ہے یہیں فقیہہ سیدنا عبداللہ بن مسعود، فاتح عراق سعد بن ابی وقاص، سیدنا سعد بن معاذ جن کی وفات پر عرش الٰہی جنبش میں آگیا تھا، سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف اور دوسرے اکابر صحابہ مدفون ہیں، وہاں سے آگے چلئے تو شمالی مغربی جانب دیوار سے متصل وہ ستر شہداء صحابہ و اہل مدینہ جن کو واقعہ حرہ میں یزید کے دور حکومت میں 63 ھ میں شہید کیا گیا تھا مدفون ہیں، اس کے بعد بقیع کے بالکل کونہ میں مشرقی شمالی جانب امام مظلوم شہید الدار سیدنا عثمان بن عفان اور دائی حلیمہ سعدیہ آرام فرما رہے ہیں۔ یہاں پر کچھ دیر ٹھہریے اور محبت و عظمت کے جو آنسو سیدنا ابوبکر و سیدنا عمر کے مرقد پر بہنے سے بچ رہے تھے ان کو ان کے تیسرے ساتھی کی خاک پر بہائیے:

؎ آسمان اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اس کے آگے سیدنا ابو سعید خدری، سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی والدہ فاطمہ بنت الاسد کے مقابر ہیں۔ سب کو سلام عرض کیجئے اور فاتحہ پڑھئے پھر ایک لمحہ ٹھہر کر پورے بقیع پر عبرت و تفکر کی نظر ڈالیے اللہ اکبر کتنے سچے تھے یہ اللہ کے بندے، جو کچھ کہتے تھے کر دکھایا کرتے تھے "رِجالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰہَ عَلَیہِ" مکہ میں جس کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا، مدینہ میں اسی کے قدموں میں پڑے ہیں۔

؎ جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

مدینہ طیبہ سے باہر نکلئے تو کوہ احد سے کون واقف نہیں۔ اب تو مدینہ طیبہ کی آبادی وہاں تک پہنچ گئی ہے یہ وہ احد ہے جس کے بارے میں خود حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ وہ ہم سے پیار کرتا ہے ہم اس سے پیار کرتے ہیں یہی وہ

جگہ ہے جس کے دامن میں جنگ احد لڑی گئی۔ جہاں خود حضور اکرم ﷺ زخمی ہوئے۔ آپ کے ستر صحابہ کرام شہید ہوئے۔ آپ کے نہایت عظیم چچا جنہیں اسد اللہ و اسد رسولہ کہا جاتا ہے یعنی حضرت حمزہ بھی نہ صرف شہید ہوئے بلکہ ان کے ناک، کان کاٹے گئے اور ان کا کلیجہ چبانے کی کوشش کی گئی۔ مسافر یہاں دم بخود ہو کر کھڑا ہے۔ سوچتا ہے کہ یا اللہ یہ کیسی جگہ ہے جہاں اللہ کے رسول کا خون بہا، یہاں ایک دو نہیں پورے ستر صحابہ کی لاشیں اٹھیں۔ جن کی نظیر نہ پہلی امتوں میں تھی اور نہ قیامت تک اس امت میں وجود میں آئے گی۔ آخر یہ حادثہ کیوں پیش آیا۔ تب اس کے ذہن پر ایک بجلی سی کوندتی ہے وہ سوچتا ہے کہ ایک واقعہ احد کا ہی نہیں یہاں تو قدم قدم پر ایسے بے شمار واقعات ہوئے ہیں جہاں اسلام کی کھیتی کو اس پاکیزہ خون سے سینچا گیا اور اسی وجہ سے وہ بار آور بھی ہوئی۔ آج اسلام پر جو ایک ابتلا کا دور آیا ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ اللہ کی رحمت کا نزول رک گیا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے جہاد و غزا اور ایثار و سرفروشی کا وہ راستہ ترک کر دیا ہے جو اسلام کی سربلندی اور اللہ کی جنت کی طرف جاتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ:

مدینہ فی الحقیقت سرزمیں ہے علم و عرفاں کی
تیقن آگہی انسانیت کے عہدِ تاباں کی
یہیں سے نور پھیلا ساری دنیا جگمگا اٹھی
حمیت لہلہا اٹھی شرافت مسکرا اٹھی
یہاں ہر گام پر تاریخ کے ابواب کھلتے ہیں
یہاں کے خذف ریزے موتیوں کے بھاؤ تلتے ہیں

اس لیے اس مدینہ کی اصل سوغات دعوت اسلامی ہے جہاد و غزا کا جذبہ ہے اللہ کے راستہ میں مرمٹنے کا عہد ہے۔ وہ پیغام خداوندی اور اس کے غلبہ کی فکر ہے جسے حضور ﷺ غار حرا سے لے کر اترے تھے اور مسلسل تیئس سال جانگسل مراحل سے گذر کر جزیرۂ عرب کی حد تک غالب اور نافذ فرما کر دنیا سے تشریف لے گئے تھے اور اپنے پیچھے وہ جماعت چھوڑ گئے تھے جس نے

پھر نصف سے زیادہ زمین پر اللہ کے اس دین کو غالب کر دیا تھا۔ اس لیے یہ مسافر سوچتا ہے کہ یہاں سے اگر کوئی سوغات لے کر جانے والی ہے تو وہ تو یہی جذبات ہیں یہ صحیح ہے کہ کھجوریں اور یہاں کی خاک شفا اور زمزم کا پانی یقیناً ایک بہت بڑا تحفہ ہے اللہ کی نگاہ میں ان کا بہت بڑا مقام ہے مگر اس سرزمین کا اصل تحفہ اور یہاں کی سب سے بڑی سوغات دعوت دین اور اس کے لیے جدوجہد اور جان دے دینے کا عزم ہے اور اپنی ذاتی حیثیت میں اللہ کی کامل بندگی اس کی مکمل فرمانبرداری اور اجتماعی زندگی میں ان قوتوں کا دست و بازو بن کر جو غلبہ دین کی جدوجہد میں واقعی مخلصانہ کردار انجام دے رہی ہیں زندگی گذارنا ہے اس راستے میں کبھی آگے بڑھ کر علمبرداری کر کے اور کبھی پیچھے رہ کر آگے جانے والوں کی مدد کر کے جس طرح بھی ممکن ہو یہ حق ادا کرنا ہے اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے دلوں کو ایسے ہی احساسات سے آباد کر دے اور ہم حرمین الشریفین سے صحیح معنوں میں وہ پاکیزہ جذبات اور عزائم لے کر لوٹیں جو وہاں کی حاضری کا اصل مقصد اور حاصل ہیں:

؎ دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

# انسانی حقوق کا اولین منشور

## (خطبہ حجتہ الوداع)

معزز و محترم حاضرین!

حج کے سلسلہ کی گذشتہ ایک گفتگو میں خطبہ حجۃالوداع کا تذکرہ ہوا تھا۔ میں نے مناسب جانا کہ اس حوالے سے بھی چند گذارشات پیش کردوں۔ ورنہ حج سے متعلق گفتگو نامکمل رہے گی۔ آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے جب اللہ کی یہ زمین اللہ کے بندوں کے شر سے بھر چکی تھی اور بندگی رب کا وہ تصور جو ابناء آدم کو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک مسلسل دیا جاتا رہا۔ تقریباً ختم ہوتا جارہا تھا۔ صحرائے عرب جہاں انسان اپنی فطری سادگی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے' وہاں بھی ضلالت و گمراہی کا وہ دور دورہ تھا کہ اس سے زیادہ بگڑے ہوئے انسانی معاشرے کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ عرب کے باہر کی دنیا میں اگرچہ علم' تمدن اور قانون سے آشنائی باقی تھی مگر وہ بھی اپنے مالک کی معرفت اور اس کی بندگی سے یکسر عاری ہوچکے تھے۔ اس حالت میں انسانی اصلاح کے لیے بلکہ ایک نیا انسان وجود میں لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس اکمل ترین انسان کو بھیجا جو ملکوتی صفات کا مرقع تھا اور وہ اپنے ساتھ وہ تعلیم لے کر آیا جو انسانی اصلاح کا سب سے موثر اور کامل ترین نمونہ تھی اور عزم و ہمت انسانی ہمدردی اور گہری دلسوزی کا یہ عظیم پیکر ایک ایسی پیغمبرانہ شان کے ساتھ جلوہ گر ہوا کہ جس نے تقریبا" 22 سال کی مسلسل اور جانگسل محنت کے ساتھ جزیرہ عرب میں انسانی تہذیب اور تمدن کا رخ پھیر

دیا اور حقیقی انسانوں اور مصلحین کی اتنی بڑی جماعت تیار کر دی کہ جس نے چند سالوں میں نوع انسانی کو حقیقی عظمت و شرافت سے بہرہ ور کر دیا۔ اپنی 22 سالہ محنت اور اللہ کی تائید و نصرت کا نتیجہ دیکھنے کے لیے اور اللہ کے بندوں کی اصلاح کا آخری پیغام پہنچانے کے لیے آنحضرت ﷺ نے آخری حج فرمایا، جس کو حجتہ الوداع کہا جاتا ہے، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اس کے بعد کوئی اور حج نہیں فرمایا اس لیے اسی کو حجتہ الوداع کہا گیا ہے اور پھر آپ نے اس حج میں وہ الوداعی پیغام ارشاد فرمایا جس میں ان بنیادی امور کا تذکرہ کیا جو اس وقت بھی اور آج بھی انسانی اصلاح کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں اور جن کو چھوڑ دینے سے دنیا فساد اور شر سے بھر جاتی ہے۔ اگرچہ اسے انسانی حقوق کا اولین چارٹر کہا جاتا ہے مگر اس میں دو چیزیں ایسی ہیں جو عام طور پر حقوق کے چارٹرز میں نہیں ملا کرتیں۔ پہلی بات یہ کہ اس میں صرف حقوق کا ہی ذکر نہیں بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو فرائض کا تذکرہ بھی ہے اس لیے آج کے دور کی یہ کمزوری کہ صرف حقوق مانگے جائیں اور حقوق کا تذکرہ کیا جائے اور اسی پر مبنی جماعتوں کی تشکیل کی جائے۔ لیکن فرائض کا بھول کر بھی ذکر نہ ہو یہ چارٹر اس سے یکسر پاک ہے، کیونکہ کوئی حق ایسا نہیں جو دوسرے کا فرض نہ ہو تو جب تک فرائض کی ادائیگی کا تصور پختہ نہیں ہو گا حق کی بازیابی کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ اس لیے اس خطبہ جلیلہ میں حقوق کے ساتھ فرائض کا تذکرہ بھی ہوا بلکہ حقوق کو بھی فرائض کی شکل میں بیان فرمایا گیا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہاں صرف ان حقوق ذکر کیا گیا ہے جن کے ادا نہ کرنے سے بڑی تباہی پھیلتی ہے اور جن کی طرف سے عام طور پر انسان لاپرواہی برتتا ہے اور پھر جن کا تعلق اجتماع انسانی سے ہے۔ رہے وہ حقوق جو نسبتاً" اپنا دائرۂ اثر مختصر رکھتے ہیں یا ان کا تعلق پہلے انفرادیت سے ہے اور پھر اجتماعیت سے۔ ان کا تذکرہ بڑی تفصیل سے سورہ بنی اسرائیل، سورۂ نور، سورۃ الاحزاب اور بعض دوسری سورتوں میں کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس خطبہ جلیلہ میں جن عظیم ہدایات کا ذکر فرمایا گیا ہے ان میں سے چند ایک کا یہاں تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

1- اس دور کی اور آج کے دور کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ انسان اللہ کی دی ہوئی ہدایت کو نظر انداز کر کے اپنی نام نہاد دانش اور علم (جس کو اسلام نے جاہلیت سے تعبیر کیا ہے) پر اصرار کرتا ہے حالانکہ یہی بنائے فساد ہے۔ سب سے پہلے آنحضرت ﷺ نے اس کا تذکرہ فرمایا۔ ارشاد ہوا’ خبردار لوگو! جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں۔ یعنی میں جاہلیت کے تمام اطوار اور اس کی تمام رسموں کو آج ختم کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔ آج تمہاری زندگی کے لیے کوئی طریقہ اور ضابطہ اگر شروع ہو سکتا ہے تو وہ صرف وہ ہے جسے میں اللہ کی طرف سے لے کر آیا ہوں۔

دوسری چیز جس نے انسانی حقوق کا جنازہ نکال دیا اور انسانوں کو طبقات میں تقسیم کر کے شرف انسانیت سے محروم کر دیا’ جس کے نتیجے میں انسانی صلاحیتیں دم توڑتی جا رہی تھیں وہ یہ تھا کہ سلاطین’ سایۂ یزدانی تھے جن کے آگے کسی کو چوں چراں کی مجال نہ تھی۔ آئمۂ مذہب کے ساتھ کوئی شخص مسائل مذہبی میں گفتگو کرنے کا مجاز نہ تھا۔ شرفا رذیلوں سے ایک بالاتر مخلوق تھے۔ غلام’ آقا کا ہمسر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے یہ تمام نفرتیں’ یہ تمام امتیازات’ یہ تمام حد بندیاں’ دفعتہ” توڑ ڈالیں۔ ارشاد فرمایا ” اے لوگو! یاد رکھو بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے’ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر’ سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے دیکھو ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں (سنو تمہارے غلام’ تمہارے غلام جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ’ جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔) اس طرح انسانی اخوت کا وہ درس دیا گیا بلکہ وہ صور پھونکا گیا جس نے تمام تفرقے اور تمام امتیازات یکسر مٹا دیئے اور آئندہ کے لیے اس جوئے انسانیت کو امتیازات کے پتھروں سے گزار کر ہموار زمین پر رواں دواں کر دیا گیا لیکن ابھی ایک ایسی رکاوٹ باقی تھی جسے نظر انداز کرنے سے اس تمام محنت کے اکارت جانے کا خطرہ تھا’ کیونکہ انسانی فطرت ہے کہ وہ ایک نئی بات کو قبول کر بھی لے مگر پرانے زخموں سے اٹھنے

والی ٹیسیں اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتیں اس لیے وہ پرانے زخموں کا اندمال پہلے چاہتا ہے۔ چنانچہ عرب کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کسی خاندان کا کوئی شخص کسی کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا تو انتقام لینا خاندانی فرض سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ سینکڑوں برس گزر جانے پر بھی یہ فرض باقی رہتا۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے اس بڑی خرابی کا تدارک کرتے ہوئے فرمایا کہ جاہلیت کے تمام خون یعنی انتقام خون، باطل کر دیئے گئے سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا خون یعنی ربیعہ حارث کے بیٹے کا خون باطل کرتا ہوں۔ اسی طرح پچھلی ساری دشمنیاں اور تعصبات کو ختم کر کے انسانی زندگی کو نئی زندگی اور نیا میدان مہیا کیا گیا جس طرح پرانے جھگڑے اور پرانے انتقام آگے بڑھنے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں اسی طرح پرانے لین دین اور پرانے قرضے بھی آگے بڑھنے میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ پرانے لین دین کی سب سے مکروہ صورت سود کی ادائیگی ہے اور عرب اس میں بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ ہندو مہاجنوں کی طرح عرب کے ساہوکاروں نے بھی اپنے قرض خواہوں کو سودی زنجیریں پہنا کر اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب تک یہ زنجیریں توڑی نہیں جاتیں آنے والی خوشگوار زندگی کا آغاز نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا سود یعنی عباس بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں۔ ان پرانی زنجیروں اور بیڑیوں کو کاٹنے اور پرانے جالوں کو تار تار کر دینے کے بعد آنحضرت ﷺ اس صنف نازک کی طرف متوجہ ہوئے جو صنف قوی کے ظلم کا نشانہ بنتی رہی۔ اس لیے کہ انسانی زندگی کو اگر خوشگواری اور کامیابی سے آگے بڑھانا ہے تو اس کے لیے مرد اور عورت دونوں کو اطمینان بخش زندگی گزارنا اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ضروری ہے، لیکن یہ قدرت کی تقسیم ہے کہ اس نے صنف لطیف کے نازک احساسات کی پاسبانی اور اس کی زندگی کے معاملات کا سررشتہ مرد کے ہاتھ میں دے رکھا ہے۔ چنانچہ ان آبگینوں کی حفاظت کے متعلق ارشاد فرمایا کہ لوگو، عورتوں کے معاملات میں اللہ سے ڈرو، تمہارا حق عورتوں پر اور

عورتوں کا حق تم پر ہے اور پھر انسانیت کی اجتماعی بحالی اور اس کی خوشحالی کی ضمانت کے طور پر مزید ارشاد فرمایا کہ تمہارا خون اور تمہارا مال تا قیامت اس طرح حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینے میں اور اس شہر میں حرام ہے۔

دنیا میں عدل و انصاف اور جور و ستم کی محور صرف تین چیزیں رہی ہیں۔ جان، مال اور آبرو اور عرب اس ظلم و جور میں سب سے آگے تھا۔ اس لیے عرفات کے خطبہ کی طرح منیٰ کے خطبہ میں بھی آپ نے اس کو مکرر ارشاد فرمایا اور اس کے لیے بڑا بلیغ انداز اختیار کیا۔ لوگوں سے مخاطب ہو کر پوچھا کچھ معلوم ہے آج کون سا دن ہے لوگوں نے عرض کی کہ خدا اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ آپ دیر تک خاموش رہے۔ لوگ سمجھے کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھیں گے دیر تک سکوت کے بعد ارشاد فرمایا کہ آج قربانی کا دن نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا ہاں بے شک ہے۔ پھر ارشاد ہوا یہ کون سا مہینہ ہے؟ لوگوں نے پھر اسی طریقہ سے جواب دیا۔ آپ نے پھر دیر تک سکوت کیا اور فرمایا کہ کیا یہ ذوالحج نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا ہاں بے شک۔ پھر پوچھا یہ کون سا شہر ہے؟ لوگوں نے بدستور جواب دیا۔ آپ نے اسی طرح دیر تک سکوت کے بعد فرمایا کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے؟ لوگوں نے عرض کیا ہاں بے شک ہے۔ جب سامعین کے دل میں یہ خیال پوری طرح جاگزین ہو چکا کہ آج کا دن بھی مہینہ بھی اور خود شہر بھی محترم ہے یعنی اس دن اس مقام میں جنگ اور خونریزی جائز نہیں تب آپ نے فرمایا تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری آبرو اسی طرح محترم ہے جس طرح یہ دن اس مہینے میں اور اس شہر میں محترم ہے۔ مزید ارشاد فرمایا ہاں میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ خود ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو تم کو خدا کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا۔ وہ تم سے تمہارے اعمال کی بازپرس کرے گا۔ اسلام سے پہلے بڑے بڑے مذاہب دنیا میں پیدا ہوئے لیکن ان کی بنیاد خود صاحب شریعت کے تحریری اصول پر مبنی نہ تھی۔ ان کو خدا کی طرف سے جو ہدایتیں ملی تھیں بندوں کی ہوس پرستیوں نے ان کی حقیقت گم کر دی تھی ابدی مذہب کا یہ عظیم پیغمبر اپنی زندگی کے بعد ہدایات ربانی کا مجموعہ خود

اپنے ہاتھ سے اپنی امت کے سپرد کرتا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ میں تم میں ایک چیز چھوڑ کے جا رہا ہوں اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہیں ہو گے وہ کیا چیز ہے؟ وہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس کے بعد آپ نے چند اصولی احکام کا اعلان فرمایا کہ خدا نے ہر حق دار کو (از روئے وراثت) اس کا حق دے دیا۔ اب کسی کو وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں۔ لڑکا اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا۔ زناکار کے لیے پتھر ہیں اور اس کا حساب خدا کے ذمہ ہے۔ جو لڑکا اپنے باپ کے علاوہ کسی اور نسب سے ہونے کا دعویٰ کرے اور جو غلام اپنے مولا کے سوا کسی اور کی طرف اپنی نسبت کرے اس پر خدا کی لعنت ہے۔ خبردار عورت کو اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر کچھ دینا جائز نہیں۔ قرض ادا کیا جائے' مانگی ہوئی چیز واپس کی جائے عطیہ لوٹایا جائے اور ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے یہ اصولی ہدایت دینے کے بعد آپ نے مجمع عام سے مخاطب ہو کر فرمایا تم سے خدا کے ہاں میری نسبت پوچھا جائے گا تم کیا جواب دو گے؟ صحابہ نے عرض کی ہم کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا' اپنا فرض ادا کر دیا۔ آپ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار فرمایا اے اللہ تو گواہ رہنا۔ عین اس وقت جب آپ یہ فرض ادا کر رہے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی "الیوم اکملت" آج میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے مذہب اسلام کو پسند کیا۔ محدثین کہتے ہیں کہ نہایت عبرت خیز بات یہ تھی کہ شہنشاہ دو عالم جس وقت لاکھوں آدمیوں کے مجمع میں پروردگار عالم کے فرامین کا اعلان فرما رہے تھے تو آپ کے تخت شاہی کی مسند و بالیں یعنی کجاوا اور عرق گیر ایک روپیہ سے زیادہ قیمت کا نہ تھا۔

یہ ہے سرور کائنات کا وہ آخری خطبہ جو دنیا میں انسانی حقوق کا اولین منشور تھا اور جس کی بنیاد پر بننے والی امت اسلامیہ نے اس سلگتی ہوئی دنیا کو دوبارہ خوشحالی کی بہار عطا کی تھی۔ سچ کہا مولانا حالی نے کہ:

؎ بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہی کی لگائی ہوئی ہے

# فہرست مطبوعات

| | | |
|---|---|---|
| معرفتِ حق کا سفر (اسمائے حسنیٰ) | ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی | 100 روپے |

## اردو شاعری

| | | |
|---|---|---|
| نوائے ظہوری | محمد علی ظہوری | 50 روپے |
| کلیاتِ راقب قصوری | مرتبہ محمد صادق قصوری | 90 روپے |
| زرِ معتبر | ریاض حسین چودھری | 200 روپے |
| سفید دن کی ہوا | منیر نیازی (نیا مجموعہ) | 70 روپے |
| روشنی کی جستجو | علاء الدین کلیم<br>مرتبہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا | 100 روپے |
| کون اسے جاتا دیکھے | شہزاد احمد (نیا مجموعہ) | 80 روپے |
| قوسِ خیال | بشیر احمد بشیر | 120 روپے |
| بات تری ورق ورق | """ | 100 روپے |
| رختِ نوا | """ | 120 روپے |
| بادل چاند ہوا اور میں | سعد اللہ شاہ | 100 روپے |
| تمہی ملتے تو اچھا تھا | """ | 70 روپے |
| اداس موسم کے رتجگے | """ | 70 روپے |
| ہمیں اقرار کرنا تھا | """ | 70 روپے |
| اک کمی سی رہ گئی | """ | 90 روپے |
| تشنگی باقی رہے گی | """ | 130 روپے |
| مجھے کچھ اور کہنا تھا | """ | 150 روپے |
| ادھوری رات کا غم | """ | 150 روپے |
| کوئی شام شہرِ خراب میں | """ | 150 روپے |
| کوئی رسم بھی نہ نبھا سکا | """ | زیرِ طبع |
| ہوا کے پر | اظہار شاہین | 80 روپے |
| شام کی دہلیز | محمد اکرم طاہر | 130 روپے |

| | | |
|---|---|---|
| کتھے تیری ثنا (انعام یافتہ) | محمد علی ظہوری | 50 روپے |
| اپنے ساہ دا سیک | بشیر احمد بشیر | 80 روپے |
| شہر خداواں دا (انعام یافتہ) | سعد اللہ شاہ | 40 روپے |
| وکھری چپ | ″″″ | 40 روپے |
| ڈھلدے منظر | ″″″ | 40 روپے |
| موسم تیرے آون نال | ″″″ | 50 روپے |
| مکھڑا | ″″″ | 60 روپے |
| رت دھپ تے ہوا | سلیم احمد سلیم | 50 روپے |
| گلاں کردے ہنجو | نوید شہزاد | 60 روپے |
| درد پوشاکاں | نوید شہزاد | 60 روپے |
| چھنکار | ″″″ | 60 روپے |
| جس دن چپ دا سورج چڑھیا | ″″″ | 60 روپے |
| رب راکھا | خادم چشتی | 80 روپے |
| دھپ غماں دی | آصف آسی | 70 روپے |

## اردو نثر

| | | |
|---|---|---|
| انداز بیاں اپنا | ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی | 80 روپے |
| مجاہد ملت | مولانا محمد عبدالستار خان نیازی<br>مرتبہ: محمد صادق قصوری | 180 روپے |
| ثناخوان رسولؐ | محمد علی ظہوری<br>(فن و شخصیت) | 150 روپے |
| سیاق و سباق | جمیل احمد عدیل | 150 روپے |
| ٹائٹل سٹوری (جلد اول) | ″″″ | 70 روپے |
| ٹائٹل سٹوری (جلد دوم) | ″″″ | 70 روپے |
| شہرہ آفاق افسانے | ″″″ | 150 روپے |
| بادباں کھول دو | وحید قیصر | 180 روپے |

# سرودِ بندگی

ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی